خطائے اجتہادی کی کرشمہ سازیاں

ترجمہ

علامہ السید ذیشان حیدر جوادیؒ

ناشر

تنظیم المکاتب

لکھنؤ۔ ہندوستان

باسمہ تعالیٰ

خطائے اجتہادی
کی
کرشمہ سازیاں

(ترجمہ معالم المدرستین ۲۔۳)

تالیف

محقق کبیر علامہ السید مرتضیٰ عسکری اعلیٰ اللہ مقامہ

ترجمہ

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلیٰ اللہ مقامہ

ناشر

تنظیم المکاتب

گولہ گنج، لکھنؤ۱۸، یوپی (انڈیا)

فون: 6565985 ,6565982 - 0522

نام کتاب	:	خطائے اجتہادی کی کرشمہ سازیاں
تحریر	:	علامہ السید مرتضیٰ عسکریؒ
ترجمہ	:	علامہ السید ذیشان حیدر جوادیؒ
کتابت	:	جلال الدین
پہلا ایڈیشن	:	اکتوبر ۱۹۹۸ء
دوسرا ایڈیشن	:	جون ۲۰۱۳ء
تعداد	:	پانچ سو
ناشر	:	تنظیم المکاتب (ہندوستان)
مطبوعہ	:	اے۔بی۔سی۔پریس دہلی
قیمت	:	سو روپئے

بسمہٖ سبحانہ

تیسرا مسئلہ

دونوں مکاتبِ فکر

کے

مصادر شریعت

فہرست مضامین

بسمہ سبحانہ

حرفِ تنظیم

لیجئے "معالم المدرستین" (شیعہ سُنی مکاتب کے امتیازی نشانات) کے دوسرے دو حصّوں کا یکجا ترجمہ بھی حاضر خدمت ہے۔ دورِ حاضر میں جبکہ ذہنی کام کرنے والے بھی گرمیوں کے زمانہ میں پُرسکون علاقوں میں جاکر قلم کو بند کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اور ٹھنڈی ہواؤں کے ذریعہ ذہنی سکون کا انتظام کرتے ہیں۔

سرکار علامہ جوادی دام ظلّہ نے اس عظیم کام کو انجام دینے کے لئے دارالسلام افریقہ کا رُخ کیا اور ماہ مبارک رمضان کے بیس دن وہاں کی گرمیوں میں گزارے جبکہ اپنے علاقہ میں بہترین موسم تھا اور بارہ گھنٹہ میں روزہ تمام ہوجاتا تھا۔ مگر سرکار موصوف نے تنزانیہ کی شدید گرمی میں چودہ گھنٹہ کا روزہ رکھنے کے بعد اور دن میں درس تفسیر اور رات میں مجلس عزا کے ساتھ اس عظیم کارنامہ کو بھی انجام دیدیا جو آپ کے سامنے ہے اور اسے قلمی جہاد سے زیادہ توفیق پروردگار کے نام سے یاد کرنا مناسب ہے۔

کاش ہمارے جملہ علمار اعلام اور اہل قلم اسی طرح کا حوصلہ پیدا کر لیتے تو آج بیشمار کتابیں منظر عام پر آسکتی تھیں۔ تقریبًا ۲۰ سال قبل آپ نے کسی کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرمایا تھا کہ یہ ماہ مبارک کی برکتوں کا نتیجہ ہے اور اراد عزم کا اظہار کیا تھا کہ ماہ مبارک میں ہر سال ایک تالیف یا ترجمہ منظر عام پر ضرور لائیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ سلسلہ آج تک برقرار ہے اور ہر سال کوئی نہ کوئی کتاب منظر عام پر آجاتی ہے۔

ادارہ تنظیم المکاتب جس قدر بھی شکر پروردگار کرے کم ہے۔ کہ اسے آپ جیسے صاحب علم و قلم کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے اور اسی بنیاد پر مسلسل قوم کی علمی خدمت کا موقع مل رہا ہے اور ادارہ اس دعویٰ میں "بڑی حد تک" حق بجانب ہے کہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں جسقدر مفید علمی اور تحقیقی مواد ادارہ نے پیش کیا ہے۔ کم سے کم اردو زبان کے کسی ادارہ نے ایسی خدمت

انجام نہیں دی ہے اور بعض کتابوں کی مثال تو فارسی اور عربی لٹریچر میں بھی نظر سے نہیں گذری ہے جبکہ وہاں تالیف وتصنیف کے بے پناہ وسائل موجود ہیں اور ہر صاحب قلم ہمارے ملک کے مقابلہ میں سوگنا اسباب عمل کا مالک ہے اور شاید ہی کسی صاحب کے ذمہ ساری دنیا کی مجالس عزا سے خطاب کرنا، ساری قوم کے مختلف مسائل میں حصہ لینا، ساڑھے آٹھ سو مکاتب اور مختلف حوزہائے علمیہ کا انتظام اور لاکھوں بلکہ کروڑوں کے سرمایہ کی فراہمی کی ذمہ داری بھی ہو اور نثری کام کے ساتھ "منظوم خدمات" کا انجام دینا بھی شامل ہو۔

یہ ایک غیر معمولی توفیق پروردگار ہے جس کا قولی اور عملی شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم نے سرکار موصوف کو بھی دیکھا ہے اور ہم خود بھی اس ادائے فرض میں شریک ہیں۔ اور مالک کائنات کا بے پناہ شکریہ ادا کرتے ہوئے مستقبل کے توفیقات کے لئے دست بدعا ہیں۔

رب کریم سرکار موصوف کو طول حیات، مزید زور قلم اور زیادہ سے زیادہ کام کرنے کے مواقع عنایت فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اس علمی اور تحقیقی ذخیرہ کو اسی طرح منظر عام پر لاتے رہیں۔

کتاب کیا ہے اس کا اندازہ فہرست سے اور اس کی قدر وقیمت کا اندازہ مطالعہ ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ مختصر تعارف سرکار موصوف نے "حرف مترجم" میں کرا دیا ہے اور واقعی لطف حاصل کرنے کے لئے شروع کرنے کا وقت نکال لیجئے۔ اس کے بعد ہمیں یقین ہے کہ ختم کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکیں گے۔

رب کریم جناب محترم ملا اصغر علی صاحب صدر خوجہ ورلڈ فیڈریشن کے توفیقات میں اضافہ فرمائے کہ انھوں نے کتاب کی اشاعت میں گرانقدر امداد فرمائی ہے ورنہ ۱½ کروڑ کے مصارف کے نیچے دبا ہوا ادارہ مزید کاموں کے انجام دینے سے قاصر تھا۔ ادارہ موصوف کے کاموں میں برکت کیلئے ہمہ وقت دست بدعا ہے۔

صفی حیدر

سکریٹری

تنظیم المکاتب، لکھنؤ

بسمہ سبحانہ

حرف مترجم

زیر نظر کتاب آیۃ اللہ علامہ السید مرتضیٰ العسکری کی کتاب "معالم المدرستین" کے حصہ دوم وسوم کا ترجمہ ہے۔

مولف محترم نے اس کتاب کو تین حصوں میں ترتیب دیا تھا اور حقیر سے بعض حضرات نے ایک عرصہ قبل تینوں حصوں کے ترجمہ کا تقاضا کیا تھا لیکن پہلے حصہ کے ترجمہ کی اشاعت کی تاخیر کے باعث دوسرے حصّوں کا ترجمہ تعطّل میں پڑ گیا اور میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

بعض اوقات حوادث بھی رحمت و نعمت بن جاتے ہیں کہ اس دوران مولف محترم نے خود ہی تینوں حصوں کا خلاصہ ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا اور بہت سے تفصیلات سے نجات مل گئی۔ ورنہ ہماری قوم میں نہ اسقدر تفصیلات کے پڑھنے کا ذوق ہے اور نہ ہمارے پاس اتنے اصحاب خیر ہیں جو ایک ایک کتاب کی تین تین جلدیں شائع کرا سکیں۔ چنانچہ حقیر نے آخری دونوں حصّوں کا ترجمہ یکجا طور پر مرتب کر دیا ہے اور اب یہ آپ کے سامنے ہے۔

پہلے حصّہ میں خدا اور رسولؐ اور صحابیت و امامت کے بارے میں شیعہ سنی مکتب فکر کے عقائد و افکار کا جائزہ لیا گیا تھا اور دونوں کے نظریات کو بلاکم و کاست پیش کر دیا گیا تھا تاکہ مولف اپنی رائے کو مسلّط کرنے کے بجائے محترم قاری کو رائے قائم کرنے کا موقع دے جو علامہ عسکری کے قلم کے خصوصیات میں شامل ہے اور جس شرافت سے ہر دور کے اکثر اہل قلم محروم رہتے ہیں اور سب کی فکر یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح قاری کے ذہن کو اپنی طرف

موڑ لیا جائے اور اسے اپنا ہمخیال بنا لیا جائے۔

یہ حضرات درحقیقت مصنف، مولف یا محقق نہیں ہوتے ہیں اور نہ ان کا مقصد حقائق کی ترویج و تبلیغ ہوتا ہے یہ الکشن کے کنویسنگ کرنے والے ہوتے ہیں کہ جو پارٹی ان کے جیب بھر دیتی ہے، اسی کے افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت شروع کر دیتے ہیں۔

آپ ہر دور میں اس طرح کے مصنفین اور ارباب قلم سے دوچار ہوں گے جن کے افکار اور ان کی تحریروں میں آپس ہی میں قیامت کا تضاد پایا جاتا ہے اور شہادت امام حسینؑ کے فلسفہ پر بحث کرتے ہیں تو کبھی ذکر شہادت امام حسینؑ بھی حرام کر دیتے ہیں۔ کبھی ائمہ معصومینؑ کے مفصل حالات تحریر کرتے ہیں اور کبھی ان کی امامت کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔

ایسے کرایہ پر چلنے والے قلم علمی دنیا میں کوئی قیمت نہیں رکھتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ قلموں کو کرایہ پر لینے والے ذہنوں کو بھی کرایہ پر لے لیتے ہیں اور اس طرح بیشمار قاری بھی فراہم ہو جاتے ہیں۔

دور حاضر میں اس علمی بد دیانتی کا سب سے بڑا منظر سعودیہ عرب میں دیکھنے میں آتا ہے۔ جہاں غیر وہابی نقطہ نظر کے افراد اپنی دعاؤں اور مسائل کی کتابیں بھی لے کر ملک میں داخل نہیں ہو سکتے ہیں اور سعودیہ عرب کے وہابی کارندے ہر حاجی کے بکس اور بیگ میں ایک درجن کتابوں اور کیسٹوں کا بوجھ بڑھا دیتے ہیں۔ مردانگی اور حقانیت پر اعتماد کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہر فرقہ کو اپنے نظریات و عقائد کی اشاعت کا موقع دیا جاتا اور دنیا بھر سے جمع ہونے والے مسلمانوں کو خود فیصلہ کرنے کا موقع دیا جاتا۔ مگر افسوس کہ یہ سرزمین اس آزادئ فکر سے ہر دور میں محروم رہی ہے۔

پہلے کفار و مشرکین نے ایک ایک کلمہ پڑھنے والے کو سخت اذیتوں سے دوچار کیا اور کلمہ کفر پر ہر امکانی جبر اختیار کیا اس کے بعد مسلمانوں نے پہلے وفات پیغمبرؐ کا نام لینے والوں پر کوڑے برسائے اور پھر بیعت نہ کرنے والوں کے گھروں میں آگ تک لگا دی۔

بہر حال "اسلام بزور شمشیر" پھیلانے کا الزام بالکل بے بنیاد نہیں ہے اور عالم اسلام میں ایسا اسلام بھی پایا جاتا ہے جو ہر دور میں بزور شمشیر پھیلا ہے اور آج بھی اسکی اشاعت

بزور شمشیر ہی ہورہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب مال و زر کا زور بھی شامل ہوگیا ہے۔

زیر نظر کتاب میں دونوں مکاتب کے ان نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے جن کا تعلق قرآن و سنت سے ہے کہ قرآن و سنت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے مسلمانوں نے قرآن و سنت کو کس حد تک تسلیم کیا ہے اور کس مکتب فکر نے اپنے عقائد یا اپنی فقہ میں قرآن و سنت کو کس حد تک جگہ دی ہے اور کہانتک سارا کاروبار ذاتی رائے اور اجتہاد سے لیا ہے اور اپنے خیالات و نظریات ہی کو مذہب اسلام اور سنت رسولؐ کا نام دے دیا ہے۔

اس سلسلہ میں پہلے کتابت سنت رسولؐ پر عائد کی جانے والی پابندیوں کا "عہدوار" جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس اجتہاد کے بارے میں تفصیلی بحث کی گئی ہے جس کی خطا نے سارے مذہب کا جنازہ نکال دیا ہے اور جس کی آڑ میں ہر حاکم ظالم نے چین کی نیند سونے کا انتظام کیا ہے اور جس کے سلسلہ کو اوپر سرکار دو عالمؐ سے ملا دیا گیا ہے اور انھیں بھی مجتہدین کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے اور نیچے یزید ملعون تک پہونچا دیا گیا ہے اور اس کے سارے مظالم و مقاتل کو خطائے اجتہادی سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خلفاء اسلام کے ان اجتہادات اور مدرسۂ خلافت کے ان افکار کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد مولف نے مدرسۂ اہلبیتؑ کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور اس مدرسہ میں قرآن و سنت کی حیثیت اور اس کے احترام کا بھرپور اور مدلّل تذکرہ کیا ہے اور پیروانِ اہلبیتؑ کے بارے میں پیدا کی جانے والی غلط فہمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ آخر میں دو اہم موضوعات پر نہایت درجہ حسین اور متین بحث کی گئی ہے۔

ابتدا میں اس صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے جو مدرسۂ خلافت کے اجتہاد بالرائے سے پیدا ہوگئی تھی اور جس کی بنا پر یزید جیسے افراد کو سارے مذہب کو تبدیل کر کے "لعبت ھاشم بالملک" کا نعرہ لگانے کا موقع مل گیا تھا۔

اس کے بعد اس صورت حال کی تبدیلی کے امکانات پر بحث کرتے ہوئے امام حسینؑ کے اقدامات اور ان کی قربانیوں کا جائزہ لیا گیا ہے جس کا مقصد حکومت کی جگہ حکومت قائم کرنا نہیں تھا بلکہ امت کے شعور کو بیدار کرنا تھا اور مذہب کے بارے میں پیدا کئے جانے والے

غلط تصور کو بے نقاب کرنا تھا۔ چنانچہ اس موضوع کا بھرپور تجزیہ کرنے کے بعد امام حسینؑ کی قربانیوں کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے یا نہیں ؟۔ اور امت کا شعور کسی حد تک بیدار ہوا یا نہیں۔؟

آخر میں مدرسۂ اہلبیتؑ میں سنت رسولؐ کا پھر ایک تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور نہایت درجہ دیانتداری سے تمام کتب احادیث پر بحث کی گئی ہے اور ان کی واقعی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولف محترم نے اس مقام پر کسی طرح کی جنبہ داری یا مروت سے کام نہیں لیا ہے اور نہ اس بات کی پرواہ کی ہے کہ دشمنی کرنے والے افراد مذاق اڑائیں گے کہ ان کے پاس ایک کتاب بھی صحیح نہیں ہے جب کہ دوسرے مذاہب میں نصف درجن صحیح کتابیں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ مذہبی مسائل تمسخر اور مذاق سے طے نہیں ہوتے ہیں۔ ان کا علمی معیار طے شدہ ہے اور اس سے گر کر بات کرنا خود اپنے علم اور اپنی امانت و دیانت کا مذاق اڑانا ہے بھلا یہ حفظ آبرو کا کون سا طریقہ ہے کہ کتاب کا نام صحیح رکھ دیا جائے اور اسکے اندر صفات الٰہیہ، تخلیق کائنات، سیرت انبیاءؑ، کردار مرسل اعظمؐ، بعثت رسولؐ اور دیگر اہم ترین مسائل سے متعلق ایسے بیانات درج کر دئے جائیں جنھیں غلط کہنا بھی غلط ہے چہ جائیکہ صحیح قرار دینا ایسے افکار و خیالات کو تو سیدھے سیدھے کفر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ بعض افراد اسی کفر کو صحیح قرار دینے پر مصر ہیں اور ہمیں کسی کے اصرار پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ "کسی دال گر جانے والے کو سوکھی روٹی ہی اچھی لگتی ہے تو ہمارا اجارہ کیا ہے"۔

مگر بہرحال حقائق کا بے نقاب کر دینا اور واقعیات کا اقرار کرنا ایک علمی فریضہ ہے جسے مولف نے انجام دیا ہے۔ اس کے بعد ماننا یا نہ ماننا اور حقائق کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا یا صرف ان کا مذاق اڑاتے رہنا یہ انسان کا اپنا کام ہے جس کا جوابدہ اسے روز قیامت ہونا پڑے گا۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

جوادی

فصل اوّل

دونوں مکاتبِ فکر کا موقف قرآن کریم کے بارے میں

قرآن مجید ۔ وہ کلام الٰہی ہے جو پروردگار نے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ پر بتدریج نازل فرمایا ہے ۔ عربی زبان میں اس کے مقابلہ میں نثر اور نظم دونوں کا استعمال ہوتا ہے ۔

علماء اسلام نے قرآن مجید ہی سے اس کے دوسرے ناموں کا بھی استخراج کیا ہے جو درحقیقت نام نہیں ہیں بلکہ صفات ہیں جن کا جابجا ذکر کیا گیا ہے جیسے نور، موعظہ وغیرہ اور انھیں کے ذریعہ اسے متعارف کرایا گیا ہے ۔

مکتب خلافت میں قرآن مجید کا ایک نام "مصحف" بھی ہے جس کا کوئی ذکر قرآن مجید یا سنّتِ رسولؐ میں نہیں ہے جیسا کہ زرکشی وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ جب ابو بکر نے قرآن جمع کرا لیا تو کہا کہ اس کا نام تجویز کرو ؛ بعض لوگوں نے کہا انجیل ! مسلمانوں نے اسے ناپسند کیا تو دوسرے گروہ نے کہا "سفر" ۔ لوگوں نے کہا کہ یہ یہودیت کی اصطلاح ہے لہٰذا غلط ہے ۔ تو ابن مسعود نے کہا کہ حبش میں ایک کتاب مصحف نام کی بھی پائی جاتی ہے ۔ لوگوں نے یہی نام قرآن مجید کا بھی رکھ دیا ۔ (البرہان فی علوم القرآن زرکشی (متوفی ۷۹۴ھ) النوع الخامس عشر ۔ معرفۃ اسماء القرآن ۱/۲۸۲ مطبوعہ قاہرہ، اتقان

سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) ص ۶۳، مطبوعہ قاہرہ)۔

بنابریں یہ صرف مسلمانوں کی اصطلاح ہے اور اس کا اسلام یا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے لہٰذا جب یہ لفظ مکتبِ خلافت میں استعمال ہوگا تو اس کا مفہوم ہوگا قرآن کریم ___ اور جب مدرسۂ اہلبیتؑ میں "مصحف فاطمہؑ" یا "صحیفۂ سجادیہ" کہا جائے گا تو اس سے مراد صرف کتاب ہوگی اور کوئی دوسرا مفہوم نہ ہوگا۔

اسی لئے روایات میں اس امر کی تصریح ہے کہ مصحفِ فاطمہؑ میں مستقبل کی حکومتوں کا تذکرہ ہے اور اس کا قرآن ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ بعض فتنہ پردازوں نے لفظ مصحف کو بہانہ بنا کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے کہ مدرسۂ اہلبیتؑ میں دو قرآن ہیں اور یہ سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ اس مصحف سے مراد کتاب ہے جس طرح کہ علم نحو میں کتاب سیبویہ کا نام "الکتاب" ہے، جب کہ قرآن مجید کو بھی "کتاب" کہا گیا ہے۔

جمع قرآن کے لئے رسول اکرمؐ اور صحابہ کا اہتمام

جب بھی قرآن مجید کی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور اکرمؐ مسلمانوں کے سامنے تلاوت کر دیتے تھے اور اس کا مفہوم بھی بقدرِ ضرورت سمجھا دیا کرتے تھے اور اس کے بعد حضرت علیؑ کو خصوصیت کے ساتھ اس کے لکھنے کا حکم دیا کرتے تھے جیسا کہ آئندہ کے صفحات میں واضح کیا جائے گا۔

اس کے بعد جب آپ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو آپ نے مسلمانوں کو کتابت سیکھنے پر آمادہ کیا اور لوگوں نے فوراً یہ کام شروع کر دیا اور پھر کتابت اور حفظِ قرآن پر زور دیا گیا جس کی وجہ سے مسلمان اس کی طرف بھی متوجہ ہو گئے۔

ابتدا میں ان آیات کو کھال وغیرہ پر لکھا جاتا تھا اور آپ سوروں کے نام اور ان کی جگہ وغیرہ بھی بتا دیا کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو مدینہ میں بیسیوں حافظِ قرآن بھی موجود تھے اور کاتبِ قرآن بھی تھے جنھوں نے پورا قرآن لکھ لیا تھا۔ صرف وہ آج کے انداز سے مرتب نہیں تھا۔ بلکہ متفرق اشیاء پر لکھا ہوا تھا۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ نے آپ کے بعد ان متفرقات کو مرتب کرنے کا کام شروع کیا جس طرح کہ دیگر صحابۂ کرام۔ ابن مسعود وغیرہ نے بھی مرتب کر رکھا تھا۔ لیکن خلیفۂ وقت ابوبکر نے ان تمام مجموعوں کو رد کر دیا اور ایک نئی کمیٹی کو ترتیب کا کام سپرد کر دیا اور اسے مرتب کرا کے ام المومنین حفصہ کے پاس محفوظ کرا دیا جس کے بعد حضرت عثمان نے اپنے دور میں اس کی متعدد کاپیاں تیار کرائیں اور انھیں تمام اسلامی ممالک میں نشر کر دیا اور وہی نسخہ نسلوں میں چلتا رہا اور آج تک چل رہا ہے جس کے علاوہ مسلمانوں کے پاس کوئی دوسرا نسخہ نہ کبھی تھا اور نہ آج ہے اور نہ اس میں کسی طرح کی کمی یا زیادتی ہوئی ہے جس پر تمام شیعہ اور سنی مسلمانوں کا اتفاق ہے اور اشعری، معتزلی، حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی، زیدی اور اثنا عشری سب متحد ہیں اور کسی کے پاس کوئی دوسرا قرآن یا دوسرے انداز کا مرتب صحیفہ نہیں ہے۔

اور اگر بعض روایات میں بعض حصّوں کے کم ہو جانے کی روایت ہے تو یہ صرف حدیث کی کتابوں میں ہے ورنہ اس اضافہ والے قرآن کا کوئی وجود نہ کبھی رہا ہے اور نہ آج ہے۔

مثلاً صحاح ستّہ۔ بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی وغیرہ سب نے حضرت عمر کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے منبر سے اعلان کیا کہ "پروردگار نے حضرت محمدؐ کو نبی برحق بنایا ہے اور ان پر کتاب نازل کی ہے اور اس کتاب میں آیت رجم بھی تھی جسے ہم نے لکھا بھی تھا اور محفوظ بھی کیا تھا اور رسول اکرمؐ نے اس پر عمل بھی کیا تھا اور ہم نے بھی رجم کیا تھا اور اس کی وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ بعد والی نسلیں یہ نہ کہیں کہ سنگسار کا کوئی ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے اور اس طرح ایک فریضہ کو نظر انداز کر کے گمراہ ہو جائیں۔ یاد رکھو کہ سنگسار کی سزا کتاب خدا میں برحق ہے ہر اس شخص کے لئے جو بیوی رکھنے کے بعد بھی زنا کرے۔ (بخاری ۴/۱۲۰، مسلم ۵/۱۱۶، سنن ابی داؤد ۲/۲۲۹، ترمذی ۶/۲۰۴، ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۵۵۳، دارمی ۲/۱۷۹، موطا ۳/۴۲)

ابن ماجہ کے بیان کے مطابق یہ آیت رجم اس طرح تھی "الشیخ والشیخۃ فارجموھما البتۃ"۔

اسی حدیث کے ذیل میں صحیح بخاری میں اس آیت کا ذکر بھی ہے "ان لاترغبوا

عن آبائکم فانہ کفر بکم ان ترغبوا عن آبائکم" اور ام المومنین عائشہ سے نقل ہونے والی روایت میں یہ فقرہ ہے "عشر رضعات معلومات" اور اسی طرح حیاتِ رسولؐ میں اسے پڑھا جاتا تھا۔ (صحیح مسلم ۴/۱۶۷، ابوداؤد ۱/۲۷۹، نسائی ۲/۸۲، ابن ماجہ ۱/۶۲۶، دارمی ۱/۱۵۷، موطا ۲/۱۱۸)

ابن ماجہ میں حضرت عائشہ کا یہ قول بھی ہے کہ آیتِ رجم اور آیتِ رضاعت کبیر میرے صحیفہ میں تھی اور بستر پر رکھی تھی لیکن جب رسول اکرمؐ کے انتقال پر ہم لوگ اُدھر مشغول ہو گئے تو داجن (مرغی کا بچہ) نے اسے کھا لیا۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ ابو موسیٰ اشعری نے قراء بصرہ جن کی تعداد تین سو نفر تھی۔ انھیں اطلاع دی کہ حیاتِ پیغمبرؐ میں ہم لوگ ایک سورہ پڑھا کرتے تھے جس کا لہجہ اور طول بالکل سورۂ برائت جیسا تھا لیکن اب صرف ایک آیت یاد رہ گئی ہے" لو کان لابن آدم وادیان من مال لابتغیٰ وادیاً ثالثاً ولا یملأ جوف ابن آدم الا التراب"۔

اور اسی طرح ایک سورہ اور تھا جسے ہم لوگ مسبحات سے تشبیہ دیتے تھے اور اس کی بھی صرف ایک آیت یاد رہ گئی ہے "یا ایھا الذین آمنوا لم تقولون مالا تفعلون فتکتب شھادۃ فی اعناقکم فستعلمون عنھا یوم القیامۃ" (صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ ۳/۱۰۰)

لیکن ان تمام صحیح روایات کے باوجود اتباعِ مدرسہ اہلبیتؑ نے کبھی مکتبِ خلافت پر یہ طنز نہیں کیا کہ یہ لوگ قرآن کے ناقص ہونے کے قائل ہیں یا انھوں نے قرآن مجید میں آیات یا سوروں کا اضافہ کر دیا ہے۔

جب کہ اس کے برخلاف جب مکتب اہلبیتؑ کی ضعیف روایات میں ایسی کوئی بات نظر آگئی تو مکتب خلافت نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ لوگ قرآن میں کمی کے قائل ہیں یا بعض جملوں اور آیتوں کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔

حالانکہ مدرسۂ اہلبیتؑ نے کبھی کسی کتاب حدیث کو قرآن مجید کی طرح صحیح کا درجہ نہیں دیا اور ہر دور میں ان میں اشتباہات کا اقرار کیا ہے اور مدرسۂ خلافت

نے اپنی چھ کتابوں کو صحیح کا نام دیا ہے اور تمام روایات کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ آیات قرآن مجید میں تھیں اور بعد میں ان کی تلاوت منسوخ ہوگئی ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الحدود باب رجم الحبلیٰ، صحیح مسلم کتاب الحدود باب رجم الثیب فی الزنا)

درحقیقت آج جو قرآن مجید مسلمانوں کے درمیان رائج ہے یہی وہ ہے جسے مالک نے پیغمبر اسلامؐ پر نازل کیا تھا اور آپ نے اسے جمع کرا دیا تھا اور صحابہ نے آپ کے بعد اسے مرتب کر کے رائج کر دیا ہے جس کا آغاز "بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العلمین سے ہوتا ہے اور اختتام من الجنۃ والناس" پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی دور میں کوئی ایسا قرآن نہیں تھا جس میں ایک لفظ زیادہ رہا ہو یا کم اور یہ مسئلہ عالم اسلام میں متفقہ حیثیت رکھتا ہے جس کے بعد سارے اختلافات صرف تاویل اور تفسیر میں ہیں اور ان کا ماخذ حدیث ہے۔ قرآن کریم کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔

فصل دوم

دونوں مکاتب فکر کا موقف سنتِ رسولؐ کے بارے میں

سنت اور بدعت

یہ دونوں اسلامی اصطلاحات ہیں جن میں ایک کا سمجھنا دوسرے کے سمجھنے اور اس سے موازنہ کرنے پر موقوف ہے جس کے بغیر اس کی حقیقت اور اس کے مورد کا ادراک مشکل ہے۔

ا۔ سنت

لغتِ عرب میں سنت کے معنی طریقہ اور سیرت کے ہیں چاہے وہ سیرت قابلِ تعریف ہو یا قابلِ مذمّت (المعجم الوسیط۔ سنن۔ بدع)۔ شریعتِ اسلام میں سنت سے مراد وہ امور ہیں جن کا سرکارِ دوعالمؐ نے حکم دیا ہے یا ان سے روکا ہے چاہے قول کے ذریعہ ہو یا عمل کے ذریعہ۔ بشرطیکہ اس کا ذکر قرآن کریم میں نہ ہو۔ (نہایۃ اللغۃ ابن اثیر۔ مادہ سنن)

اس کا دائرہ تقریرِ پیغمبرِ اسلامؐ کو بھی حاوی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ سرکار کے سامنے کوئی عمل انجام دیا جائے اور آپ اس سے منع نہ کریں تو اس خاموشی سے عمل کا جواز ثابت ہو جاتا ہے۔ (سنن ابی داؤد ۲/۴/۲۷۔ ۲۷۵) بقول سہل بن سعد صحابیٔ رسولؐ،

جس کا مطلب یہ ہے کہ شریعتِ اسلام کے دو مدرک ہیں: ایک کتابِ خدا

اور دوسرے سنتِ رسولؐ۔

۲۔ بدعت

"بدع" لغت میں ایجادِ نو کو کہا جاتا ہے (المعجم الوسیط) اور دین کی اصطلاح میں بدعت اس قول یا عمل کا نام ہے جس کے قائل یا فاعل نے صاحب شریعت کا اتباع نہ کیا ہو۔

شیعہ اور سُنّی دونوں مکاتب اس بات پر متحد ہیں کہ سنتِ رسولؐ شریعتِ اسلام کا مصدر ہے لیکن چونکہ اس کا سلسلہ ہم تک راویوں کے ذریعہ پہونچا ہے لہٰذا دو مقامات پر اختلاف پیدا ہو گیا ہے:

ا۔ نقل حدیث کے بعض وسائط اور رواۃ۔

ب۔ پہلی صدی میں کتابت حدیث کا جواز یا عدم جواز۔

(ا) راویوں کے بارے میں فریقین کا موقف

"صحابیت اور امامت" کے ذیل میں اس امر کی نشاندہی کی جا چکی ہے کہ مدرسۂ اہلبیتؑ کے پیرو اپنے احکامِ دین میں ائمہ اثنا عشر کا اتباع کرتے ہیں اور انھیں سے احکامِ دین اخذ کرتے ہیں اور اس کے برخلاف مدرسۂ خلافت کا اعتماد تمام اصحاب پر ہے اور وہ بلا امتیاز کردار و شخصیت ہر ایک کو ماخذ دین بنا لیتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں سارے صحابہ عادل ہیں اور سب اتباع کے قابل ہیں جب کہ مدرسۂ اہلبیتؑ کے پیرو طلحہ و ابن زبیر جیسے افراد (جنھوں نے جمل میں حضرت علیؑ سے جنگ کی ہے یا معاویہ و عمرو عاص جیسے لوگ جنھوں نے صفین میں مقابلہ کیا ہے یا ذوالخویصرہ اور عبداللہ بن وہب جیسے افراد جنھوں نے نہروان میں حضرت سے نبرد آزمائی کی ہے) ان افراد کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے ہیں اور نہ انھیں دین کا مدرک قرار دیتے ہیں۔

بلکہ دشمنانِ علیؑ میں کسی کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے ہیں چاہے اس کا تعلق طبقۂ صحابہ

سے ہو یا تابعین سے یا عام راویوں کے طبقہ سے ۔ صرف ان روایات کو ضرور نقل کرتے ہیں جو فضائلِ اہلبیتؑ میں ہوں کہ اس طرح دشمن کے اقرار کا حوالہ دیا جا سکتا ہے ۔

حیرت کی بات ہے کہ امام المحدثین بخاری اپنی صحیح میں شیعوں کے چھٹے امام حضرت جعفر صادقؑ سے ایک روایت بھی نہیں نقل کرتے ہیں جب کہ ان سے روایت کرنے والے ہزاروں افراد ہیں اور شیخ مفیدؒ کے بیان کے مطابق چار ہزار افراد ہیں اور اس کے برخلاف امام بخاری، ابو داؤد، نسائی سب اپنے صحاح میں عمران بن حطان خارجی کے روایات نقل کرتے ہیں جس نے قاتل حضرت علیؑ کی مدح اس انداز سے کی ہے کہ "کیا کہنا اس مرد متقی کی ضربت کا جس کا مقصد رضائے الٰہی کے علاوہ کچھ نہ تھا ۔ میں تو اس شخص کو یاد کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اس سے زیادہ کسی کے اعمال کا پلہ بھاری نہ ہوگا"۔

اور نسائی نے تو اپنی صحیح میں عمر بن سعد قاتل امام حسینؑ سے بھی روایت نقل کی ہے اور بعض علمار رجال نے "اسے بہترین سچا انسان قرار دیتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے کہ لوگ اس سے اس لئے بیزار ہو گئے ہیں کہ وہ امام حسینؑ سے جنگ کرنے والے لشکر کا سربراہ تھا"۔

جب کہ پیروانِ اہلبیت ان دونوں افراد کو ملعون قرار دیتے ہیں اور اس طرح فریقین کے درمیان راویوں کے سلسلہ میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ مدرسۂ خلافت نے ہر ظالم، قاتل، بدکار پر اعتبار کیا ہے اور مدرسۂ امامت نے کسی بدکردار اور دشمنِ اہلبیتؑ کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا ہے ۔

(۲) نشر احادیث کے بارے میں فریقین کا موقف ۔ پہلی صدی میں

جس طرح فریقین کے درمیان راویوں کے بارے میں اختلاف تھا ۔ اسی طرح اصل روایت کے محفوظ کرنے میں بھی شدید اختلاف تھا ۔ چنانچہ خلفاء اسلام کتابتِ حدیث پر پابندیاں عائد کر رہے تھے اور دوسرا مکتب فکر اس کی اشاعت پر لگا ہوا تھا اور خلافتی کوششوں کو ہر محاذ پر چیلنج کر رہا تھا اور اس کا معرکہ رسول اکرمؐ کے وقتِ آخر ہی

شروع ہوگیا تھا کہ حضور نے قلم دوات کا مطالبہ کیا تاکہ وہ نوشتہ لکھ دیں جس کے بعد امت گمراہ نہ ہونے پائے تو بعض افراد نے کہہ دیا کہ حضور ہذیان بک رہے ہیں۔ (بخاری باب جوائز الوفد کتاب الجہاد ۲/ ۱۲۰، باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب کتاب الجزیۃ ۲/۱۳۶، صحیح مسلم ۵/۵، باب ترک الوصیۃ۔ سات اسناد کے ساتھ، مسند احمد ۱/ ۲۲۲ تحقیق محمد شاکر حدیث ۱۹۳۵، طبقات ابن سعد طبع بیروت ۲/ ۲۴۴، تاریخ طبری ۳/ ۱۹۳)

واضح رہے کہ مسند۔ طبقات کے الفاظ میں یہ استفہام ہے کہ کیا ہذیان بک رہے ہیں؟ اور دوسرے مدارک میں یہ صراحت ہے کہ ہذیان بک رہے ہیں۔

بخاری نے ابن عباس کی روایت میں اس قول کے قائل کو بھی معین کر دیا ہے کہ "جب حضور کا وقت آخر آیا تو گھر اصحاب سے چھلک رہا تھا جن میں عمر بن الخطاب بھی تھے اور جب حضور نے لکھنے کے لئے کاغذ طلب کیا تو عمر نے کہا کہ ان پر مرض کا غلبہ ہے اور تمھارے پاس کتابِ خدا موجود ہے اور وہی تمھارے لئے کافی ہے جس کے بعد اہلبیتؑ اور اصحاب میں اختلاف ہوگیا۔ بعض لوگوں نے عمر کی تائید شروع کر دی تو جب جھگڑا تیز ہوگیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پاس سے نکل جاؤ۔ میرے سامنے جھگڑا نہیں ہوسکتا ہے۔" (بخاری کتاب العلم۔ باب العلم ۱/ ۲۲)

خود حضرت عمر کی روایت اس طرح ہے کہ ہم لوگ رسول اکرمؐ کے پاس تھے اور عورتیں پس پردہ تھیں کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مجھے سات مشک سے غسل دینا۔ اور لاؤ دوات اور کاغذ لے آؤ تاکہ میں ایسا نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو سکو۔ تو عورتوں نے کہا کہ قلم کاغذ دے دو اور عمر نے کہا کہ تم لوگ خاموش رہو۔ تم تو آرام کی ساتھی ہو کہ شوہر بیمار ہوجائے تو آنکھیں نچوڑنے لگتی ہو اور صحت حاصل کرلے تو گردن دبا دیتی ہو۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ تم سے بہر حال بہتر ہیں۔ (طبقات ابن سعد طبع بیروت ۲/ ۲۴۳-۲۴۴ باب الکتاب الذی اراد أن یکتبہ الرسول لامتہٖ، نہایۃ الادب ۱۸/ ۳۷۵، کنز العمال طبع اول ۳/ ۱۳۸، ۴/ ۵۲)

دوسری روایت میں ہے کہ زینب زوجۂ رسولؐ نے کہا کہ تم لوگ کیوں نہیں سنتے ہو

کہ حضورؐ کیا کہنا چاہتے ہیں تو لوگوں نے ہنگامہ کر دیا اور آپ نے فرمایا کہ نکل جاؤ اور لوگ نکل گئے، جس کے بعد ہی حضورؐ کا انتقال ہوگیا۔ (طبقات ۲/۲۴۴)

بعض روایات سے تو یہانتک اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ نے کتابت حدیث سے رسول اکرمؐ کی صحت ہی کے زمانہ سے روکنا شروع کر دیا تھا جیسا کہ عبداللہ بن عمر و عاص کا بیان ہے کہ میں رسول اکرمؐ سے جو کچھ سُنتا تھا لکھ لیتا تھا لیکن قریش نے مجھے منع کر دیا کہ تم ہر چیز لکھ لیتے ہو جب کہ رسول اکرمؐ ایک بشر ہیں جن پر خوشی اور غم دونوں کا اثر ہوتا ہے لہٰذا خبردار آئندہ ہر چیز مت لکھنا۔ جس کی میں نے حضرت سے شکایت کی تو آپ نے اپنے دہن کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "لکھو لکھو خدا کی قسم اس دہن سے سوائے کلمۂ حق کے اور کچھ نہیں نکلتا ہے۔" (سنن دارمی ۱/۱۲۵ باب من رخص فی الکتابۃ، سنن ابی داؤد ۲/۱۲۶ باب کتابۃ العلم، مسند احمد ۲/۱۶۲، ۱۹۲، ۲۰۷، ۱۱۵، مستدرک حاکم ۱/۱۰۵-۱۰۶، جامع بیان العلم و فضلہ ابن عبدالبر ۱/۸۵ طبع دوم مطبعۃ العاصمۃ قاہرہ ۱۳۸۸ھ)

مذکورہ روایت میں حضرات نے اپنی ممانعت کا راز بھی کھول دیا کہ انھیں اس بات کا خوف ہے کہ کہیں بعض افراد سے خوش ہو کر ان کے فضائل نہ بیان کر دیں اور بعض افراد پر غضبناک ہو کر ان کے عیوب نہ واضح کر دیں۔

اور شاید اسی بنیاد پر آخری وقت میں لوگوں نے کتابت سے روک دیا تھا اور اسقدر شور مچایا کہ آپ لکھے بغیر ہی دنیا سے تشریف لے گئے اور پھر کتابت حدیث کی اجازت دے دی کہ خلفاء کے دورِ حکومت میں یہ خطرہ مٹ گیا تھا اور حسب خواہش روایات جمع کی جاسکتی تھیں۔

(۳) پہلی صدی کے آخر تک کتابتِ حدیثِ رسولؐ کی ممانعت

دورِ ابوبکر

ذہبی کا بیان ہے کہ وفاتِ رسولؐ کے بعد ابوبکر نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا "تم

لوگ رسول اکرمؐ سے مختلف قسم کی احادیث نقل کرتے ہو اور تمہارے بعد اختلاف کے شدید ہو جانے کا اندیشہ ہے لہٰذا خبردار رسول اکرمؐ سے کوئی حدیث نہ کرنا اور اگر کوئی شخص سوال کرے تو کہہ دینا کہ ہمارے پاس کتابِ خدا موجود ہے۔ اسی کے حلال و حرام پر عمل کرو۔"

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی حالات ابو بکر ۱/۲-۳)

دورِ عمر

طبقات ابن سعد کی روایت ہے کہ عمر کے دور میں احادیث کی کثرت ہو گئی تھی تو انھوں نے تمام لوگوں کو مع احادیث کے طلب کیا اور سب کو جمع کر کے آگ لگا دی۔

(طبقات ابن سعد ۵/۱۴۰ حالات قاسم بن محمد بن ابی بکر)

اس طرح مدرسۂ خلافت نے پہلی صدی کے آخر تک کتابتِ حدیث پر پابندی لگا رکھی تھی اور کاش اتنا ہی کافی ہو جاتا بعض مورخین کا بیان ہے کہ زبانی نقل حدیث کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا تھا جیسا کہ قرظہ بن کعب سے نقل کیا گیا ہے کہ "جب ہمیں عمر نے عراق کی طرف روانہ کیا تو صرار تک پہونچانے آئے اور فرمایا کہ تمھیں معلوم ہے کہ میں یہاں تک کیوں آیا ہوں؟ ہم لوگوں نے کہا آپ ہمارا اکرام کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا اس کے علاوہ ایک غرض اور ہے ــ اور وہ یہ ہے کہ تم ایسے علاقوں میں وارد ہو گے جہاں تلاوتِ قرآن کی آوازیں شہد کی مکھیوں کی طرح بلند ہوں گی تو خبردار انھیں احادیثِ رسولؐ میں مبتلا نہ کر دینا۔

چنانچہ قرظہ کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں نے ایک حدیثِ رسولؐ بھی بیان نہیں کی اور دوسری روایت کی بنا پر جب ان سے لوگوں نے حدیث کا تقاضا کیا تو صاف کہہ دیا کہ ہمیں عمر نے منع کیا ہے۔ (جامع بیان العلم ابن عبد البر باب ذکر من ذم الاکثار من الحدیث دون التفہم لہ ۲/۱۴۷ تین اسناد کے ساتھ، خطیب بغدادی شرف اصحاب الحدیث ص ۸۸، تذکرۃ الحفاظ ۱/۴-۵)

"صحابہ کرام" میں قرظہ جیسے بہت سے افراد تھے جو عمر کی ممانعت سے متاثر تھے

جیسے عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص وغیرہ جیسا کہ دارمی نے باب من ھاب الفتیا بکتاب العلم میں شعبی سے نقل کیا ہے کہ میں ایک سال تک عبداللہ بن عمر کے ساتھ رہا اور ان سے ایک حدیثِ رسولؐ بھی نہیں سُنی۔ (سنن دارمی ۱/۸۴-۸۵)

اور سائب بن یزید سے نقل کیا گیا ہے کہ میں سعد بن ابی وقاص کے ساتھ مکّہ گیا اور مدینہ واپسی تک ایک حدیث بھی ان کی زبان سے نہیں سُنی۔

یہ اور بات ہے کہ بعض اصحاب اس ممانعت کے مخالف تھے اور اس راہ میں مختلف اذیتوں کا سامنا کر رہے تھے جیسا کہ کنزالعمال نے عبدالرحمٰن بن عوف سے نقل کیا ہے کہ عمر بن الخطاب نے مرنے سے پہلے تمام اصحابِ رسولؐ عبداللہ بن حذیفہ، ابو دردار، ابوذر، عقبہ بن عامر کو مع احادیث کے طلب کیا اور فرمایا کہ یہ کیا تم نے حدیثیں ساری دنیا میں پھیلادی ہیں۔؟

تو لوگوں نے کہا کہ کیا آپ منع کر رہے ہیں؟

فرمایا "نہیں! بس تم لوگ یہیں قیام کرو اور اب میری زندگی تک کہیں جا نہیں سکتے ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم سے کیا لینا ہے اور کیا ترک کر دینا ہے"۔

چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم رہے یہاں تک کہ عمر کا انتقال ہو گیا۔ (کنزالعمال طبع اول حدیث نمبر ۴۸۶۵ ۵/۲۳۹، طبع دوم ۱۰/۱۸۰ حدیث نمبر ۱۳۹۸ منتخب کنزالعمال ۴/۶۲)

ذہبی کا بیان ہے کہ عمر نے ابن مسعود، ابو داؤد، ابومسعود انصاری تینوں کو قید کر دیا کہ تم لوگوں نے رسول اکرمؐ سے حدیثیں بہت بیان کر دی ہیں۔

(تذکرۃ الحفاظ ۱/۷ حالات عمر)

آپ صحابہ کو برابر ہدایت دیا کرتے تھے کہ خبردار اعمال کے علاوہ اور کوئی روایت بیان نہ کرنا۔ (تاریخ ابن کثیر ۸/۱۰۷)

یہ روایت بظاہر عبداللہ بن عمر کی روایت جیسی ہے جس میں قریش کے منع کرنے کا ذکر ہے اور یہاں صاف صاف نام بیان کر دیا گیا ہے۔

دورِ عثمان

اس دور میں بھی وہی صورت حال برقرار رہی جو دورِ اول و دوم میں تھی اور انھوں نے بھی بر سرِ منبر اعلان کر دیا تھا کہ "خبردار کوئی شخص ان روایات کے علاوہ کوئی روایت نہ بیان کرے جو دورِ ابوبکر و عمر میں بیان ہو چکی ہیں۔
(منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد ۴/ ۶۴)

اور دارمی وغیرہ کہ مذکورہ ذیل روایت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ روایت بھی دورِ عثمان ہی کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ابوذر جمرہ وسطیٰ کے پاس بیٹھے تھے اور لوگ ان سے مسائل دریافت کر رہے تھے کہ ایک شخص آکر سر پر کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا کہ کیا تمھیں فتویٰ دینے سے منع نہیں کیا گیا ہے؟ ابوذر نے کہا کیا تو کوئی جاسوس اور نگران ہے؟ خدا کی قسم اگر میری گردن پر تلوار بھی رکھ دی جائے اور مجھے یہ اندازہ ہو کہ قتل ہونے سے پہلے حکم رسولؐ کو نافذ کر سکتا ہوں تو ضرور نافذ کر دوں گا۔ (سنن دارمی ۱/ ۱۳۲، طبقات ابن سعد ۲/ ۳۵۴ حالات ابوذر، بخاری ۱/ ۱۶۱)

واضح رہے کہ بخاری نے اس روایت کو "علم قبل القول" کے باب میں درج کر دیا ہے۔

اسی دورِ عثمان کا یہ قصہ بھی ہے جسے احنف بن قیس نے بیان کیا ہے کہ میں واردِ شام ہوا اور نماز جمعہ میں شریک ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص جس ستون کے پاس جا کر کھڑا ہوتا ہے لوگ وہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ میں نے اس شخص سے پوچھا کہ آخر تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں تو ابوذر ہوں مگر تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ میں احنف بن قیس ہوں۔ اس نے کہا کہ مجھ سے دور چلے جاؤ کہ میں تمھیں نقصان نہیں دینا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اس میں نقصان کی بات کیا ہے؟

انھوں نے کہا کہ معاویہ کے منادی نے آواز لگا دی ہے کہ خبردار کوئی شخص میرے پاس نہ بیٹھے۔ (طبقات ابن سعد ۴/ ۱۶۸)

انھیں سرکاری احکام کی مخالفت کا اثر تھا کہ ابوذر کو آوارہ وطن کر دیا گیا اور انھوں نے

عالمِ غربت میں ۳۱ھ میں مقام ربذہ میں انتقال فرمایا۔

واضح رہے کہ یہ سارے حالات عثمان کی خلافت کے ابتدائی دور کے ہیں ورنہ اس کے بعد جب حالات منقلب ہو گئے اور ام المومنین عائشہ، طلحہ، زبیر، عمرو عاص جیسے افراد ان کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے تو پھر روایت نقل کرنے میں کوئی دشواری نہیں رہ گئی اور بہت سی روائتیں نشر ہو گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ترتیب و تدوین کا کام انجام نہ پا سکا۔

دور حضرت علیؑ بن ابی طالب

آپ کے دور میں صحابہ نے ان تمام روایات کو بیان کر دیا جن پر دورِ قدیم میں پابندی عائد تھی اور ان روایات کا خلفاء کے اجتہادات سے اختلاف کھل کر منظرِ عام پر آگیا جس کا تذکرہ فصل چہارم کے آخر میں کیا جا چکا ہے۔

مذکورہ بالا حالات سے یہ تو اندازہ ہو گیا کہ ہر دورِ خلافت میں حدیث رسولؐ کی کتابت و روایت پر پابندی عائد تھی لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کا راز کیا تھا اور احادیثِ رسولؐ سے اسقدر عداوت کیوں تھی۔ لیکن معاویہ کے دور میں یہ راز بھی فاش ہو گیا۔

دورِ معاویہ

عبداللہ بن عامر یحصبی کا بیان ہے کہ میں نے معاویہ کی زبان سے دمشق کے منبر سے یہ بیان سُنا ہے کہ خبردار کوئی شخص رسول اکرمؐ سے کوئی روایت بیان نہ کرے علاوہ ان روایات کے جو عہد عمر میں تھیں کہ وہ لوگوں کو خوفِ خدا دلایا کرتے تھے۔ (مخطوطہ تاریخ دمشق ابن عساکر مصور مجمع اسلامی ۲/۲۳۶، شرف اصحاب الحدیث ص ۹۱)

اور رجاء بن ابی سلمہ کی روایت ہے کہ مجھے خبر ملی کہ معاویہ نے یہ حکم دیا ہے کہ صرف وہ احادیث نقل کی جائیں جو دورِ عمر میں تھیں کہ وہ لوگوں کو احادیث رسولؐ کے بارے میں خوفزدہ رکھا کرتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ذہبی ۱/۷)

طبری کا بیان ہے کہ جب معاویہ نے مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ کا گورنر قرار دیا ۴۱ھ

میں تو اسے طلب کر کے کہا کہ میں تمھیں بہت سی باتوں کی نصیحت کرنے والا تھا لیکن تمھاری بصیرت کے اعتماد پر صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ خبردار علیؑ پر سبّ و شتم۔ ان کی مذمّت اور عثمان کے لئے استغفار و دعائے رحمت کو نظرانداز نہ کرنا۔ اصحاب علیؑ کو اپنے سے دور رکھنا اور معیوب قرار دینا اور اتباع عثمان کو اپنے سے قریب رکھنا اور ان کی تعریف کرتے رہنا۔

مغیرہ نے کہا کہ میں نے سب کا تجربہ کر لیا ہے اور سب نے میرا تجربہ کر لیا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی کام کر چکا ہوں اور کسی نے میری مذمّت نہیں کی ہے اور عنقریب آپ بھی مجھے آزمالیں گے چاہے ممدوح قرار دیں یا مذموم ۔ معاویہ نے کہا کہ نہیں انشاءاللہ میں تمھاری تعریف ہی کروں گا۔ (طبری حوادث ۵۱ھ ۲/۱۱۲-۱۱۳، ابن اثیر ۳/۱۰۲)

مدائنی نے کتاب الاحداث میں نقل کیا ہے کہ معاویہ نے سال صلح تمام عمّال کو فرمان بھیجا کہ میں کسی ایسے شخص کا ذمہ دار نہیں ہوں جو ابو تراب یا ان کے گھر والوں کے فضائل بیان کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں سب سے زیادہ مصائب میں اہل کوفہ تھے۔

(ابن ابی الحدید شرح النہج ۳/۱۵ طبع البابی الحلبی)

اسی قانون کے تحت حجر بن عدی اور ان کے اصحاب کو بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ رشید ہجری اور میثم تمار کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا اور مکتب خلافت نے اصحاب اور تابعین کا گلا گھونٹ دیا اور اپنے سیاسی مخالفین کی زندگیوں کا خاتمہ کر دیا جبکہ اس کے مقابلہ میں دوسرے افراد کے لئے دروازہ کھول دیا اور وہ من مانی روایات کے ڈھیر لگانے لگے۔

اسرائیلیات

مکتب خلافت نے جہاں ایک طرف مسلمانوں کے لئے احادیث رسولؐ کا دروازہ بند کیا۔ وہاں دوسری طرف تمیم داری جیسے عیسائی اور کعب الاحبار جیسے یہودی کے لئے کھلی چھوٹ دے دی کہ جس طرح چاہیں اسرائیلیات کی اشاعت کریں اور جو چاہیں روایت بیان کریں۔

حد یہ ہے کہ عمر نے نماز جمعہ سے پہلے ایک گھنٹہ کی تقریر تمیم دارمی کے لئے معین کردی اور عثمان نے اسے اپنے دور میں دو گھنٹہ بنا دیا اور کعب الاحبار سے تو تینوں خلیفہ آغاز تخلیق کائنات اور مسائل معاد کے بارے میں استفادہ کیا کرتے تھے اور انس بن مالک، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر اور معاویہ جیسے افراد اس کے روایات کے راویوں میں شامل تھے۔

اور پھر اسرائیلیات کا یہ سلسلہ صرف انھیں دو افراد تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کے ساتھ اور ان کے بعد دوسری جماعتیں بھی برسر کار تھیں اور یہ سلسلہ امام علیؑ کی خلافت کے علاوہ ہر دورِ حکومت میں بنی عباس کے دور تک جاری رہا۔ صرف امام علیؑ نے انھیں مساجد سے نکال باہر کیا تھا اور ان کا نام داستان گو (قصاصین) رکھ دیا تھا۔

بہر حال ان افراد نے مدرسۂ خلافت کو بیحد متاثر کیا اور اس طرح اسرائیلی ثقافت اسلام میں داخل ہوگئی اور اسے اسلامی رنگ میں رنگ دیا گیا جس کے نتیجہ میں خدا کے جسم ہونے اور انبیاء کے گنہگار ہونے کا عقیدہ نکل پڑا اور مبدء و معاد سب اسرائیلیت کی نذر ہو گئے۔

بنی امیہ کے عہد میں تو ان کا نفوذ اور بڑھ گیا اور معاویہ نے سرجون جیسے شخص کو کاتب، ابن اثال کو طبیب اور اخطل کو شاعر دربار بنا لیا اور یہ تمام لوگ اپنے تمام غیر اسلامی افکار کے ساتھ داخل دربار خلافت ہو گئے۔

ویسے بھی شام بزنطی دور میں عیسائیوں کا دار الحکومۃ رہ چکا تھا اور وہاں اس تمدّن کے اثرات موجود تھے اور معاویہ کو یہ ماحول ترکہ میں مل گیا تھا۔ اس کے بعد خود اس کی تربیت بھی بدترین قبائلی جاہلیت کے ماحول میں ہوئی تھی جس کی بنیاد اسلام دشمنی پر قائم ہوئی تھی اور جب اسلام نے اسے قوت کے زور سے دبا دیا تو دھیرے دھیرے استحکام کی فکر شروع ہوگئی اور اس طرح مکہ سے مدینہ پہونچ گیا اور جاہلیت سے اسلام کا فاصلہ طے کر لیا لیکن اسے اسلامی ماحول میں اتنا موقع نہیں ملا کہ اس کے تمدّن سے اثر قبول کرتا بلکہ رومیوں کے ماحول میں رہ کر الٹا انھیں سے متاثر ہو گیا۔

معاویہ اپنے ماحول سے ان تمام افراد کو دور رکھنا چاہتا تھا جن کا کردار واقعی اسلامی سانچہ میں ڈھل گیا تھا جیسے ابوذر، ابودرداء اور قاریانِ اہلِ کوفہ وغیرہ۔

مذکورہ اسباب نے مکتب خلافت کو معاویہ کے دَور سے بالکل اہلِ کتاب کی ثقافت میں رنگ دیا اور کسی نے بھی ان عوامل کا بغور جائزہ نہیں لیا کہ ان کے اثرات کا اندازہ کیا جاسکتا۔

معاویہ کے ساتھ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ وہ فطری طور سے جاہلی ماحول کی پیداوار تھا۔ اس پر جاہلیت کی قبائلیت کی چھاپ لگی ہوئی تھی اور وہ اس کے آثار کو زندہ رکھنا چاہتا تھا اور اسے یہ فکر بھی تھی کہ حکومت اس کی نسل میں قائم رہے اور ان تمام مخالفین کا قلع قمع کر دیا جائے جو اس کے مقابلہ میں رسالت کا اسلحہ استعمال کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس راہ میں اسے بہت کچھ کرنا تھا اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بہت سے اقدامات کرنا تھے۔ چنانچہ اس نے ان صحابہ کرام کو پکڑ لیا جن کے دین میں نرمی اور نفس میں کمزوری پائی جاتی تھی اور عمرو عاص، سمرہ بن جندب، ابوہریرہ جیسے لوگوں کو خرید لیا اور انھوں نے حسب خواہش روایات کا انبار لگانا شروع کر دیا جیسا کہ مدائنی نے کتاب الاحداث میں لکھا ہے :

"معاویہ نے عام الجماعہ کے بعد تمام عمال کے نام فرمان جاری کیا کہ میں ان تمام افراد سے بری الذمّہ ہوں جو ابوتراب اور ان کے گھر والوں کے بارے میں کوئی بھی روایت نقل کریں"۔ اور تم لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنے یہاں کے عثمان کے دوستوں اور پیروکاروں اور ان کے فضائل و مناقب بیان کرنے والوں کا خیال رکھو۔ انھیں اپنے سے قریب قرار دو اور ان کا احترام کرو۔

چنانچہ اس فرمان پر عمل ہوتا رہا یہانتک کہ فضائل و مناقب عثمان کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا اس لئے کہ معاویہ کی طرف سے انعامات، خلعت اور عطایا کا سلسلہ جاری تھا اور عرب و غیر عرب کو بلاتفریق مل رہا تھا۔ ہر شہر میں روایات کا ہنگامہ ہو گیا اور ہر شخص جاہ و منصب کے لئے دین فروشی میں مبتلا ہو گیا اور جس نے بھی کوئی حدیث فضائلِ عثمان

میں نقل کر دی معاویہ کے دفتر میں اس کا نام لکھ لیا گیا اور اس کا مرتبہ بلند ہو گیا۔

اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا یہاں تک کہ اس نے حکام کے نام دوسرا حکم جاری کیا کہ اب عثمان کے بارے میں روایات بہت ہو گئی ہیں اور تمام اطراف و جوانب میں ان کی شہرت ہو گئی ہے لہٰذا جب بھی میرا یہ فرمان ملے لوگوں کو فضائل صحابہ میں روایات نقل کرنے کا حکم دو اور خبردار ابو تراب کے فضائل میں کوئی روایت ایسی نہ رہ جائے جس کے مقابل خلفاء کے فضائل کی روایت نہ تیار ہو کہ یہ بات میرے لئے پسندیدہ اور خنکیٔ چشم کا باعث ہوگی اور اس کے ذریعہ ابو تراب اور ان کے شیعوں کے دلائل کا توڑ فراہم کیا جا سکتا ہے اور یہ بات ان لوگوں کے حق میں فضائل عثمان سے زیادہ شدید ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ فرمان تمام اطراف میں نقل کر دیا گیا اور مناقب صحابہ میں روایات کا کارخانہ کھل گیا اور لوگوں نے اس راہ میں ہر طرح کی کوشش شروع کر دی۔ منبروں سے روایات کا اعلان ہوا۔ مدرسوں میں بچوں کو ان روایات کی تعلیم دی گئی اور انھیں قرآن مجید کی طرح سکھایا اور رٹایا گیا اور عورتوں اور بچوں میں ان روایات کی مکمل اشاعت ہو گئی۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جعلی روایات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا اور تمام عالم اسلام میں ان کی شہرت ہو گئی اور اس کے بعد فقہاء اور قضاۃ و ولاۃ بھی اسی راستہ پر چلنے لگے اور سب سے بدتر حال قاریوں اور کمزور ایمان والے مقدسین کا ہوا کہ انھوں نے حکام سے تقرب حاصل کرنے کے لئے وضع احادیث کا کام شروع کر دیا اور منصب و جاگیر حاصل کرنے لگے اور دھیرے دھیرے یہ روایات ان دینداروں تک پہونچ گئیں جو جھوٹ بولنے والے اور روایات گڑھنے والے نہیں تھے لیکن انھوں نے سادگی میں انھیں روایات کو نقل کرنا شروع کر دیا اور اپنی دانست میں حق کی خدمت کرنے لگے۔ حالانکہ اگر انھیں صحیح صورت حال معلوم ہو جاتی تو ہرگز ایسا کام نہ کرتے اور نہ ان روایات کو اپنا دین و ایمان قرار دیتے۔ (شرح نہج البلاغہ ۳/۱۵-۱۶، فجر الاسلام احمد امین ص ۲۷۵)

ابن ابی الحدید نے ایسے صحابہ اور تابعین کے نام بھی درج کئے ہیں جنھیں معاویہ نے روایات گڑھنے کا کام سپرد کیا تھا اور میں نے اپنی کتاب "احادیث ام المومنین عائشہ" میں اس کا

ایک حصہ نقل بھی کیا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ ان تمام روایات کا نام سنت رسولؐ رکھا گیا اور ان کا انکار کرنیوالوں کو سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا جس کا شاہد خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد ۱۴/۷ کا یہ واقعہ ہے کہ ہارون رشید کے سامنے ایک سردار قریش کی موجودگی میں ابوہریرہ کی اس حدیث کا ذکر کیا گیا کہ "حضرت موسیٰؑ نے حضرت آدمؑ سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ ہی وہ آدم ہیں جس نے ہم لوگوں کو جنت سے باہر نکال دیا ہے" تو مرد قرشی نے کہا کہ آخر حضرت موسیٰ کی ملاقات حضرت آدمؑ سے کب ہوگئی ؟ تو اس پر رشید کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے کفر کا فتویٰ دیدیا اور حدیث رسولؐ پر اعتراض کرنے کے جرم میں قابل گردن زدنی قرار دے دیا۔

راوی ابومعاویہ اسے تسکین دیتا رہا اور کہتا رہا۔ امیر! یہ بیچارہ سمجھ نہیں سکا ہے۔ اس سے غلطی ہوگئی ہے لہٰذا معاف کر دیجئے۔

دور عمر بن عبدالعزیز

ابوحفص عمر بن عبدالعزیز نے ۹۹ھ میں خلافت پانے کے بعد امام علیؑ پر لعنت کا سلسلہ بند کرایا۔ فدک کو ورثہ حضرت زہراؑ کے حوالہ کیا اور پہلی مرتبہ کتابت حدیث کا حکم دیا اور اہل مدینہ کو فرمان بھیجا کہ احادیث رسولؐ کو قلمبند کرو۔ مجھے خوف ہے کہ اہل علم کے چلے جانے سے علم کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

چنانچہ ابن شہاب الزہری پہلے شخص تھے جنھوں نے عمر بن عبدالعزیز کے حکم پر پہلی صدی کے اختتام پر روایات کی تدوین کی۔ لیکن افسوس کہ کام کی تکمیل سے پہلے ہی ۱۰۱ھ میں عمر بن عبدالعزیز کو زہر دے دیا گیا اور وہ ذخیرہ ضائع ہوگیا جیسا کہ ابن حجر نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم (متوفی ۱۱۷ھ) کے حالات میں نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے انھیں کتابت علم کا حکم دیا تھا اور ان کے فرزند نے ان کی وفات کے بعد بتایا کہ وہ ساری کتابیں ضائع ہوچکی ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۱۲/ ۳۹)

یہی حال دوسرے تمام مجموعوں کا ہوا اور سارا ذخیرہ برباد ہوگیا یہانتک کہ جب

ابو جعفر منصور کی حکومت آئی تو اس نے دوبارہ علماء کرام کو تدوین و ترتیب احادیث پر آمادہ کیا جس کا تذکرہ ذہبی نے ۱۴۳ھ کے حوادث میں کیا ہے کہ اسی زمانہ میں علماء اسلام نے تدوین فقہ و تفسیر کا کام شروع کیا اور ابن جریج نے مکہ میں تصانیف تیار کیں۔ سعید بن ابی عروبہ اور حماد بن سلمہ وغیرہ نے بصرہ میں کتابیں لکھیں۔ اوزاعی نے شام میں تصنیف کی اور مالک نے مدینہ میں موطا لکھی۔ ابن اسحاق نے مغازی تیار کی اور معمر نے یمن میں تصنیف کا کام انجام دیا۔ ابو حنیفہ وغیرہ نے کوفہ میں فقہ مرتب کی اور سفیان ثوری نے کتاب الجامع کی تصنیف کا کام انجام دیا۔

تھوڑے دنوں کے بعد ہشیم نے اپنی کتابیں لکھیں اور لیث نے مصر میں یہ کام کیا۔ پھر ابن لہیعہ، ابن المبارک، ابو یوسف، ابن وہب وغیرہ اسی راستہ پر چل پڑے اور تدوین و تبویب علم کا کام شروع ہو گیا۔ عربی ادب، تاریخ، لغت، وقائع پر کتابیں لکھی گئیں جب کہ اس سے پہلے تمام اہلِ علم صرف حافظہ سے کام لے رہے تھے یا غیر مرتب قسم کے اوراق سے حدیثیں نقل کر رہے تھے۔

اس طرح علم کا کتابوں سے حاصل کرنا آسان ہو گیا اور حافظہ کا کام کمزور ہو گیا۔ اور بہرحال ہر امر کا اختیار پروردگار کے ہاتھوں میں ہے۔ (تاریخ الاسلام ذہبی ۶/۶)

سیوطی نے بھی ان باتوں کو تاریخ الخلفاء ص ۲۶۱ پر نقل کیا ہے۔

اور "موسوعہ فقہ اسلامی" کی روایت ہے کہ جب منصور نے ۱۴۳ھ میں حج بیت اللہ کا فریضہ انجام دیا تو امام مالک کو موطا کی تالیف پر آمادہ کیا اور دیگر علماء کو بھی تدوین حدیث کی طرف رغبت دلائی جس کے بعد ابن جریج، ابن عروبہ، ابن عیینہ وغیرہ نے کتابیں تالیف کیں اور تمام اطراف و اکناف کے علماء و اصحاب اس کام پر لگ گئے۔ (موسوعۃ الفقہ ۱/۴۷ نشر کردہ مجلس اعلیٰ برائے شؤن اسلامیہ قاہرہ ۱۳۸۶ھ)

مولف: میرے اس بیان میں اور علماء کے دیگر بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے جہاں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ صحابیٔ رسول عبداللہ بن عمرو بن العاص کا بھی ایک صحیفہ تھا یا یہ کہ زہری نے بھی احادیث کو مرتب کیا تھا۔ اس لئے کہ ان کتابوں کا صرف تذکرہ علماء کرام

کی زبان پر ہے۔ ان کتابوں کا کوئی وجود عالم اسلام میں نہیں ہے۔

بہرحال مدرسۂ خلافت کے افراد نے منصور عباسی کے دور میں تدوین احادیث کی دوڑ میں حصہ لینا شروع کر دیا اور ان روایات کو بھی نقل کر لیا جن سے خلفار اسلام کے اجتہادات کی تائید ہو سکتی تھی اور انھیں نص رسولؐ کے مقابلہ میں صحیح قرار دیا جا سکتا تھا بلکہ اکثر اسرائیلیات کو بھی درج کر لیا جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "اثر الائمۃ فی احیاء السنۃ" کے گیارہویں اور بارہویں باب میں ذکر کیا ہے اور ان تمام کاموں کے ساتھ سنت رسولؐ کے مخفی کرنے کا کام بھی شروع ہو گیا اور وصیت کے بارے میں متعدد احادیث کو گم کر دیا گیا۔ اور نتیجہ کے طور پر سیاست خلفار کی تائید کی بنا پر متضاد روایات کا بھی ایک ذخیرہ جمع ہو گیا۔

متضاد احادیث کی بنیاد؟

معاویہ کے دور میں جن روایات کو تیار کیا گیا اور انھیں احادیثِ رسولؐ کے مجموعوں میں شامل کر کے سنت رسولؐ کا درجہ دے دیا گیا۔ غالباً ان میں یہ روایات بھی شامل ہیں۔

۔ صحیح مسلم، سنن دارمی اور مسند احمد میں رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد (مسلم کے الفاظ میں) نقل کیا گیا ہے کہ "خبردار میرے بیان کو درج نہ کرنا اور اگر کسی نے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہے تو فوراً محو کر دے۔ (صحیح مسلم ۴/۹۷ کتاب الزہد باب التثبت فی الحدیث و حکم کتابۃ الحدیث۔ حدیث ۷۲، سنن دارمی ۱/۱۱۹ مقدمہ باب ۴۲، مسند احمد ۳/ ۱۲، ۳۹، ۵۶)

۔ دوسری روایت۔ لوگوں نے حضور سے اجازت طلب کی کہ روایات کو نقل کر لیں تو آپ نے منع فرما دیا۔ (سنن دارمی مقدمہ باب ۱/ ۱۱۹)

۔ مسند احمد، سنن ابی داؤد میں زید بن ثابت سے روایت ہے (بالفاظ مسند) کہ رسول اکرمؐ نے حدیث لکھنے سے منع کر دیا تو زید نے سب محو کر دیا۔ (مسند احمد ۵/۱۸۲،

سنن ابی داؤد کتاب العلم ۳/ ۳۱۹)

۔ مسند احمد میں ابوہریرہ کی روایت ہے کہ ہم لوگ بیٹھے ہوئے احادیث رسولؐ کو لکھ رہے تھے کہ حضرتؐ کا گذر ہوگیا۔ فرمایا یہ کیا لکھ رہے ہو؟

ہم نے عرض کی کہ آپ کے بیانات!

فرمایا۔ کیا کتاب خدا کے علاوہ کوئی اور کتاب تیار ہو رہی ہے؟

ہم نے عرض کی حضور ہی کے بیانات ہیں۔

فرمایا۔ صرف کتاب خدا کو لکھو اور باقی سب مٹا دو۔ کیا کتابِ خدا کے علاوہ بھی کوئی کتاب ہوگی۔ فوراً محو کردو۔ جس کے بعد ہم نے سب تحریروں کو ایک مقام پر جمع کرکے نذر آتش کر دیا۔ (مسند احمد ۳/ ۱۲۔۱۳)

اب اگر یہ احادیث صحیح ہیں تو علماء اسلام کا فرض ہے کہ اسلامی مباحث کے تمام مجموعے، احادیث کے تمام ذخیرے اور صحاح وسنن ومسانید وسیر وتفاسیر کے تمام اوراق کو ایک مقام پر جمع کر کے نذر آتش کر دیں یا کم سے کم دریا کے حوالہ کر دیں۔

اب اس کے بعد اسلام میں کیا باقی رہ جائے گا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے!

خدا جانتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے اور آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا تھا کہ:

"اللہ اس بندہ کو شاد و آباد رکھے جو بیانات کو سُن کر محفوظ کرے اور نہ سننے والوں تک پہونچادے۔ کتنے ہی حاملانِ فقہ ہوتے ہیں جو اپنے سے زیادہ ہوشمند تک روایات پہونچا دیتے ہیں۔" (بدائع المنن ۱/ ۱۴)

۔ دوسری روایت میں ہے کہ بہت سے حامل فقہ فقیہ نہیں ہوتے ہیں اور بہت سے حاملِ فقہ اپنے سے زیادہ افقہ تک احادیث پہونچا دیتے ہیں۔

۔ تیسری روایت میں حضور کا ارشاد ہے "اللہ اس شخص کو آباد رکھے جو ہم سے احادیث کو سُن کر لوگوں تک پہونچادے کہ بہت سے لوگ جن تک روایات پہونچتی ہیں۔ براہ راست سننے والوں سے زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔"

ــ ایک روایت میں حضور کا ارشاد ہے کہ حاضرین کا فرض ہے کہ غائبین تک پہونچادیں کہ ہوسکتا ہے کہ غائب حاضر سے زیادہ صاحب فکر وفہم ہو۔

(صحیح بخاری ۱/۲۴، ابن ماجہ ۱/۸۵)

ــ حضور کا یہ ارشاد بھی ہے کہ "خدایا میرے خلفاء پر رحم کرنا۔ خدایا میرے خلفاء پر رحم کرنا۔ خدایا میرے خلفاء پر رحم کرنا۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! یہ خلفاء کون حضرات ہیں؟

فرمایا جو میرے بعد آئیں گے اور میری حدیثوں اور میری سنت کو نقل کریں گے۔

(درامہرفری ص ۱۶۳ باب فضل الناقل عن رسول اللہ، قواعد التحدیث قاسمی باب فضل راوی الحدیث طبع دوم ص ۴۸، شرف اصحاب الحدیث خطیب بغدادی باب کون اصحاب الحدیث خلفاء الرسول ص ۳۰، جامع بیان العلم ابن عبدالبر ۲/ ۵۵، اخبار اصفہان ابونعیم ۲/ ۸۱، الفتح الکبیر سیوطی ۱/ ۲۳۳، کنز العمال متقی کتاب العلم باب آداب العلم۔ فصل روایۃ الحدیث وآداب الکتابۃ عن علیؑ وابن عباس طبع دوم ۲۰/ ۱۲۸، ۱۳۳ حدیث نمبر ۱۰۸۶، ۱۱۲۷، الالماع قاضی عیاض باب شرف علم الحدیث وشرف اہلہ ص ۱۱)

اس کے علاوہ مدرسۂ اہلبیتؑ میں بھی یہ روایت متعدد مقامات پر نقل کی گئی ہے۔

(معانی الاخبار ص ۳۷۴-۳۷۵، عیون الاخبار طبع نجف اشرف ۲/ ۳۶، من لایحضرہ الفقیہ تحقیق علی اکبر غفاری ۴/ ۳۰۲، بحار الانوار ۲/ ۱۴۵ حدیث ۷)

ــ بخاری نے باب کتابۃ العلم میں یہ روایت درج کی ہے کہ یمن کے ایک شخص نے رسول اکرمؐ سے ایک حدیث سن کر گذارش کی کہ حضور اسے لکھ کر دیدیجئے تو آپ نے اصحاب کو حکم دیا کہ اس کے لئے لکھ دو۔ (صحیح بخاری ۱/۲۲)

ترمذی ۱۰/ ۱۳۵ میں اس شخص کا نام "ابوشاۃ" درج کیا گیا ہے۔

ــ سنن ترمذی کتاب العلم باب ماجاء فی الرخصۃ فیہ ۱۰/ ۱۳۴ پر یہ روایت ہے کہ انصار میں ایک شخص رسول اکرمؐ سے احادیث سن کر خوش ہوتا تھا لیکن محفوظ نہ کرپاتا تھا تو اس نے حضورؐ سے فریاد کی۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے مدد لو۔ یعنی لکھ لو۔

ـــ عمرو بن شعیب نے اپنے والد کے واسطہ سے اپنے دادا سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ سے عرض کی کہ حضور آپ سے سن کر احادیث کو لکھ لیا کروں ؟

فرمایا ـ بے شک !

میں نے عرض کی چاہے خوشی میں فرمائیں یا غصہ میں ؟

فرمایا ـ بے شک ! ـ اس لئے کہ میں کسی حال میں بھی حرف حق کے علاوہ کچھ نہیں کہتا ہوں ۔

دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ اس نے کہا کہ میں بہت سی چیزیں آپ سے سُن کر لکھ لیتا ہوں ـ فرمایا ٹھیک ہے ۔ (مسند احمد ۲/۲۰۷، ۲۱۵)

ـــ عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ کے ہر بیان کو محفوظ رکھنے کی غرض سے لکھ لیا کرتا تھا تو قریش نے منع کیا کہ وہ کبھی خوش رہتے ہیں کبھی غصہ میں رہتے ہیں ـ وہ ہمارے ہی جیسے انسان ہیں لہٰذا ہر بات مت لکھا کرو ـ میں نے لکھنا چھوڑ دیا اور اس کا ذکر رسول اکرمؐ سے بھی کر دیا تو آپ نے دہن مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ خدائے برحق کی قسم اس دہن سے سوائے حرف حق کے کچھ نہیں نکلتا ہے ۔

ـــ دوسری روایت میں اس کے بعد یوں ہے کہ اس نے رسول اکرمؐ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ میں آپ کی روایات نقل کرتا ہوں اور حافظہ کے ساتھ ہاتھوں سے بھی مدد لیتا ہوں آپ کا کیا ارشاد ہے ؟

فرمایا کہ اگر میری حدیث ہے تو بیشک دل کے ساتھ ہاتھ کا بھی سہارا لو ـ

(سنن دارمی مقدمہ باب رخص فی کتابۃ العلم ۱/۱۲۵ ـ ۱۲۶)

ـــ عمرو بن شعیب نے اپنے والد کے حوالہ سے اپنے دادا کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ سے عرض کی کہ میں آپ کی احادیث کو حفظ نہیں کر پاتا ہوں تو کیا لکھ سکتا ہوں ؟ ـــ فرمایا بے شک ـ لکھو ۔ (مسند احمد ۲/۲۱۵)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان آخری روایات کی بنا پر رسول اکرمؐ نے احادیث کے

قلمبند کرنے کا حکم دیا ہے اور اس پر لوگوں کو آمادہ کیا ہے تو پہلی روایات کا مفہوم کیا ہے جن میں کتابتِ احادیث سے روکا گیا ہے اور انھیں محو کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا رسول اکرمؐ کے احکام میں بھی اس طرح کا تضاد ممکن ہے؟

لیکن اس کا واضح سا جواب یہ ہے کہ گذشتہ روایات میں منع کرنے کی نسبت قریش کی طرف دی گئی ہے یعنی یہ کام مہاجرین نے انجام دیا ہے جنھوں نے وقت آخر حضورؐ کو بھی وصیت نامہ نہیں لکھنے دیا تھا اور آپ کے بعد بھی اس ممانعت میں پیش پیش خلیفہ دوم رہے کہ لکھی ہوئی حدیثوں کو جلانے پر آمادہ ہو گئے اور لکھنے والوں کو نذرِ زنداں کرنے لگے اور اس کے بعد اسی نقش قدم پر خلیفہ سوم چلے جو سب مکہ کے مہاجر اور قریش تھے اور انھیں کے نقشِ قدم پر باقی "صحابۂ کرام" بھی چلنے لگے۔

جب کہ دوسری طرف وہ افراد تھے جو نشر احادیث پر کمر بستہ تھے اور اس راہ میں ہر مصیبت کے برداشت کرنے پر آمادہ تھے اور امام علیؑ برابر ان کی حوصلہ افزائی فرما رہے تھے اور اپنے دورِ حکومت میں برابر اس امر پر زور دیتے رہے لیکن جب آپ کی شہادت واقع ہو گئی اور زمامِ حکومت معاویہ ابن ابوسفیان کے ہاتھ میں آگئی تو وہ باآسانی اس سلسلہ کو نہ روک سکا اور اس نے اپنی تائید کے لئے وہ روایتیں تیار کرائیں جن میں کتابت احادیث سے روکا گیا ہو تاکہ یہ کام بھی سرکارؐ ہی کی طرف منسوب کر دیا جائے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ احادیثِ پیغمبرؐ میں بھی تضاد پیدا ہو گیا اور ایک طرف وہ سلسلہ احادیث آگیا جس میں کتابتِ احادیث سے روکا گیا ہے اور دوسری طرف وہ سلسلہ موجود تھا جس میں اس عمل کا حکم دیا گیا تھا حالانکہ رسول اکرمؐ کے ارشادات میں کسی طرح کے تضاد اور تناقض کا امکان نہیں تھا اور اس صورت حال کا صحیح حل یہ ہے کہ جن روایات میں حکام کی مرضی کی ترجمانی ہو انھیں نظر انداز کر دیا جائے اور دوسری قسم احادیث پر عمل کیا جائے۔

اور پھر اس نکتہ کو بھی نظر انداز نہیں ہونا چاہیے کہ حکامِ وقت کی ممانعت کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ امام علیؑ کے فضائل نشر نہ ہونے پائیں اور لوگ ان سے باخبر نہ ہونے پائیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ کام معاویہ کے دور میں زور پکڑ گیا کہ اس کا کاروبار جمعہ کے

خطبوں میں امام علیؑ پر لعنت کرنا تھا اور یہ کام فضائل علیؑ کے ہوتے ہوئے ممکن نہ تھا۔

اس امر کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے کہ معاویہ کا فلسفۂ حکومت یہ تھا کہ لوگوں کو مدرسۂ اہلبیتؑ سے منحرف کر کے مدرسۂ خلافت کی طرف لایا جائے اور اس کام کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمانوں کے طرز فکر کو حاکم اول حضرت رسول اکرمؐ کے بارے میں تبدیل کیا جائے جہاں آپ کو کمال کردار کی معراج، صاحب عصمت کبریٰ اور ہوا و ہوس سے بالاتر تسلیم کیا جارہا ہے کہ اس نظریہ کے رہتے ہوئے چند ایک منحرفین کے علاوہ کوئی شریف انسان نہ معاویہ کو حاکم تسلیم کرسکتا ہے اور نہ اس کے شرابی، فاسق، فاجر بیٹے کو ولیعہد تسلیم کرسکتا ہے۔

چنانچہ اس نے ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کے اندازِ فکر کو خود رسالت کے بارے میں تبدیل کیا جائے اور رسول اکرمؐ کو بھی معاویہ اور یزید جیسے افراد کی سطح پر لے آیا جائے جہاں عصمت کبریٰ کا ذکر خیر نہ ہو اور صرف خواہشاتِ نفس کا اتباع کیا جارہا ہو اور اس سلسلہ میں ام المومنین اور بعض صحابۂ رسولؐ کی زبان کو استعمال کیا گیا اور صفاتِ رسولؐ کے بارے میں عجیب و غریب روایات منظر عام پر آگئیں۔

اس سلسلہ میں اسرائیلیات نے بھی کافی سہارا دیا جہاں انبیاء سابقین کے بارے میں بھی طرح طرح کے عجیب و غریب تذکرے تھے اور ان کا کردار ایک عام انسان سے بھی بدتر تھا۔

انھیں روایات کو مسلمانوں کے درمیان رواج دیا گیا تاکہ انبیاء کرام عام انسانی سطح پر آجائیں اور معاویہ کے مقاصد سیاست کو از غیب تائید حاصل ہو جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خطرناک کام کتابتِ حدیث کی ممانعت اور حافظوں پر اعتماد سے لیا گیا اور نیک و بد سب کو مخلوط کر کے اسرائیلیات اور احادیثِ رسولؐ کے فرق کو محو کر دیا گیا اور اسلامی فکر کو اسی رنگ میں رنگ دیا گیا جس میں معاویہ رنگنا چاہتا تھا اور اسی کا نام اصلی اسلام رکھ دیا گیا جس سے اختلاف کو ناقابلِ قبول قرار دیا گیا اور واقعی اسلام وہی اسلام ہو گیا جسے معاویہ اور اس کے ہوا خواہ رائج کرنا چاہتے تھے۔ یہانتک کہ امام حسینؑ کی قربانی

نے ایک سدِ سکندری تیار کر کے انحرافات کے راستہ کو بند کر دیا اور خلافت کی حقیقت کو بے نقاب کر کے تقدس کے اس طلسم کو توڑ دیا جسے خلافت نے اپنے گرد قائم کر رکھا تھا اور حکومت و مذہب کے راستے الگ الگ ہو گئے۔

یہ تھا مدرسۂ خلافت کا موقف احادیثِ رسولؐ کے بارے میں۔ اس کے بعد فقہ و اجتہاد کی بحث کے خاتمہ پر احادیث رسولؐ کے بارے میں مدرسۂ اہلبیتؑ کے موقف کی وضاحت بھی کی جائے گی اور یہ واضح کیا جائے گا کہ دوسری صدی کے اوائل تک کتابتِ احادیث کی پابندی ہی وہ تھی جس نے مسلمانوں میں اجتہاد یعنی خود رائی کا راستہ کھول دیا اور اسلام سنتِ رسولؐ کے مقابلہ میں بھی اجتہاد اور قیاس کا نام ہو گیا۔

فصل سوم

فقہ و اجتہاد کے بارے میں فریقین کا موقف

فقہ، کے معنی لغت میں فہم اور سمجھ کے ہیں اور قرآن و حدیث میں اس لفظ کو علم دین کے بارے میں استعمال کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی اصطلاح میں فقہ صرف احکام کے علم کا نام ہے۔

اجتہاد، مدرسۂ خلافت میں کتاب و سنت اور قیاس کے ذریعہ استنباطِ احکام کا نام ہے اور مدرسۂ امامت میں اسے فقہ ہی کے ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔

اس کے بعد اسلامی معاشرہ میں دونوں مخلوط ہو گئے اور دقیق ترین بحث کے بغیر دونوں میں امتیاز قائم کرنا مشکل ہو گیا۔ ذیل میں پہلے اجتہاد کے بارے میں مدرسۂ خلافت کی رائے کا ذکر کیا جائے گا۔ اس کے بعد مدرسۂ امامت کے موقف کا جائزہ لیا جائے گا۔ انشاء اللہ

۱۔ مدرسۂ خلافت میں مفہوم اجتہاد کا ارتقاء

کھلی ہوئی بات ہے کہ اجتہاد اور مجتہد کی اصطلاح صحابہ اور تابعین کے دور کے

بعد کی اصطلاح ہے اور ان کے دور میں اپنی رائے سے احکام کی تبدیلی کا نام تاویل رکھا جاتا تھا جیسا کہ خالد بن ولید کے مالک بن نویرہ کو قتل کرنے کے بارے میں کہا گیا اور خالد نے یہ کہہ کر ابو بکر سے معذرت کی کہ "میں نے تاویل سے کام لیا۔ اب اس کے بعد یا صحیح ہو گا یا غلط"۔

اور ابو بکر نے بھی عمر کی طرف سے سزا دینے کے اصرار کے جواب میں فرمایا کہ "میں خالد کو سنگسار نہیں کر سکتا ہوں۔ اس نے تاویل سے کام لیا ہے اور اس سے غلطی ہو گئی ہے"۔

اور یہی بات زہری و عروہ کے بارے میں نقل کی گئی ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہ کا یہ بیان نقل کیا کہ نماز ابتدا میں دو دو رکعت تھی اس کے بعد سفر میں اتنی ہی باقی رہی اور حضر میں دو رکعت کا اضافہ ہو گیا۔ اور جب عائشہ نے سفر میں چار رکعت پڑھی تو زہری نے عروہ سے پوچھا کہ یہ کیا ہو گیا؟ تو اس نے کہا کہ انھوں نے اسی طرح تاویل سے کام لیا تھا۔ (صحیح مسلم باب صلوٰۃ المسافرین حدیث ۳، بخاری ۱/۱۳۴ باب تقصیر الصلوٰۃ)

واضح رہے کہ بخاری نے ام المومنین عائشہ کے احترام میں حدیث سے "فی السفر" کا لفظ نکال دیا ہے۔

ابن حزم نے کتاب الفصل میں نقل کیا ہے کہ عمار کو ابو الغادیہ نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ عمار بیعت رضوان میں شریک تھے اور ان لوگوں کے بارے میں پروردگار نے ایمان کی گواہی دی ہے اور ان پر سکون نازل فرمایا ہے اور ان سے راضی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابو الغادیہ نے تاویل سے کام لیا تھا اور خطائے اجتہادی کا شکار ہو گیا تھا لہٰذا اسے صرف ایک اجر ملے گا اور اس کا قیاس قاتلانِ عثمان پر نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان کے قتل میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ (الفصل ۴/۱۶۱)

ابن حجر نے بھی ابو الغادیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ صحابہ کے بارے میں تمام جنگوں میں حسن ظن کا تقاضا یہ ہے کہ سب نے تاویل سے کام لیا تھا اور خطائے اجتہادی

پر بھی ایک اجر بہر حال ملتا ہے اور جب یہ بات عام مجتہدین کے بارے میں ثابت ہے تو صحابۂ کرام بدرجۂ اولیٰ خطائے اجتہادی کر سکتے تھے اور ان کا اجر بہر حال محفوظ رہے گا۔

ابن حزم نے المحلیٰ میں اور ابن الترکمانی نے "الجوہر النقی" میں لکھا ہے کہ امت کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عبد الرحمٰن بن ملجم نے حضرت علیؑ کو خطائے اجتہادی اور تاویل کی بنا پر قتل کیا ہے لہذا اسے مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا ہے جیسا کہ عمران بن حطان نے اس کی مدح میں کہا ہے اور اس کا مقصد صرف رضائے پروردگار تھا اور بس!

شیخ عبد اللطیف نے صواعق محرقہ کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ دور علیؑ کے تمام صحابہ یا ان کے ساتھ تھے یا مخالف یا غیر جانبدار اور سب کے سب تاویل کرنے والے تھے لہٰذا کسی کو عدالت سے برخاست نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (المحلیٰ ابن حزم ۱۰/ ۴۸۴، الجوہر النقی در ذیل سنن بیہقی ۸/ ۵۸، ۵۹)

ابن کثیر یزید کے بارے میں لکھتا ہے کہ "علماء نے اس کے تمام غلط تصرفات کو اس امر پر محمول کر دیا ہے کہ اس نے تاویل میں غلطی کی ہے اور اس بنا پر امام فاسق تو کہا جا سکتا ہے لیکن نہ معزول کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے خلاف خروج کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہنا کہ اس نے اہلِ مدینہ کے بارے میں تباہی کی خبر سُن کر اور واقعہ حرہ کے حالات سُن کر مسرت کا اظہار کیا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے خیال میں امام برحق تھا اور لوگ اس کی اطاعت سے نکل گئے تھے اور دوسرے کو حاکم بنا لیا تھا لہٰذا ان سے جہاد جائز تھا جب تک راہ راست پر آ کر یزید کی جماعت میں شامل نہ ہو جائیں۔

(تاریخ ابن کثیر ۸/ ۲۲۳)

ان تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی روایت میں خالد بن ولید اور ابو بکر نے مالک کے قتل اور ان کی زوجہ سے بروقت نکاح کو تاویل کا نام دیا ہے۔

دوسری روایت میں عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہ کی پوری نماز کو تاویل کہا ہے۔

تیسری روایت میں ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ) نے ابو الغادیہ کو قتل عمار میں متاوّل اور مجتہد کا نام دیا ہے

چوتھی روایت میں ابن الترکمانی (متوفی ۷۵۰ھ) نے ابن ملجم کو متاوِل مجتہد قرار دیا ہے۔

اور آخر میں ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ) نے تمام صحابہ کو تمام جنگوں میں مجتہد اور متاوِل کے لقب سے نواز دیا ہے۔

اور اس طرح خود رائی کو پہلے تاویل کا نام دیا گیا ہے اور اس کے بعد اسے اجتہاد کے لقب سے نواز دیا گیا ہے اور پھر سارے مدرسۂ خلافت نے اس اجتہاد کے دروازہ کو پاٹوں پاٹ کھول لیا ہے اور اس کے قواعد بھی مقرر کر دئے ہیں۔ ہر قاعدہ کا ایک نام بھی رکھ دیا ہے اور ایک عجیب و غریب، علم اصول ایجاد کر دیا ہے جس کی طرف رجوع کرنے کا نام اجتہاد رکھ دیا ہے اور رجوع کرنے والے کو مجتہد کے لقب سے سرفراز کر دیا ہے۔ جب کہ شریعت میں علم دین کا نام فقہ تھا اور عالم دین کو فقیہ کہا جاتا تھا۔ اور اجتہاد بھی استنباط کی کوشش کا نام تھا۔ خود رائی اور من مانی کا نام نہیں تھا۔

بہر حال اس طرح تین مسائل خود بخود پیدا ہو گئے:

۱۔ اس عمل کا کیا نام رکھا جائے۔

۲۔ پہلی صدی کے مجتہدین اور ان کے اجتہاد کے موارد۔

۳۔ دوسری صدی اور اس کے بعد کا اجتہاد اور عمل صحابہ سے استنباط۔

۲۔ بنام اجتہاد

تاویل۔ لغت کے اعتبار سے تفسیر کے ہم معنی ہے۔ (لسان العرب ابو العباس احمد بن یحییٰ المعروف بہ ثعلب۔ مادہ اول)

تاویل۔ کسی امر کی بازگشت کی تفسیر۔ (صحاح جوہری۔ مادہ اول)

تاویل۔ اول سے ماخوذ ہے یعنی اصل کی طرف پلٹنا۔ اور اسی سے موئل یعنی پناہ گاہ بھی نکلا ہے۔ لغت میں تاویل کا مفہوم کسی شے کا اس کے مقصد کی طرف پلٹ دینا ہے جیسا کہ

قرآن کریم میں وارد ہوا ہے کہ "اس کی تاویل کو صرف خدا اور راسخون فی العلم جانتے ہیں" یا یہ کہ "لوگ اس کی تاویل کے منتظر ہیں تو ایک دن وہ تاویل آجائے گی" یعنی اسکی وضاحت ہو جائے گی جو اصل مقصد ہے۔ (مفردات راغب)

اسی طرح کتاب وسنت میں تعبیر خواب کو بھی تاویل کہا گیا ہے۔ "یوسف ہمیں تاویل خواب سے باخبر کرو"۔

اور جنگ احد کے موقع پر حضورؐ نے اپنے خواب کی تعبیر کے بارے میں فرمایا کہ "میری تاویل کے اعتبار سے زرہ مدینہ ہے"۔ (سنن دارمی ۲/ ۱۲۹، موطا مالک کتاب اللبس حدیث ۱۶، دارمی کتاب الرویا باب ۱۳)

یہ تھے لغت میں تاویل کے معنی۔ اس کے بعد صحابہ اور تابعین نے اسے تغییر احکام کے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا اور یہ مدرسۂ خلافت کی ایک مخصوص اصطلاح بن گئی، جیسا کہ ابن اثیر نے بیان کیا ہے کہ تاویل اول سے نکلا ہے یعنی رجوع۔ لیکن اب اس سے مراد لفظ کو ظاہری معنی سے ہٹا کر کسی اور معنی کی طرف لے جانے کے ہیں جس کا کوئی جواز دلیل کے بغیر نہیں ہے۔ (نہایۃ اللغہ مادہ اول)

اور اس طرح لفظ کا مفہوم بدل دیا گیا اور یہی معنی کتب احادیث میں رائج ہو گئے جیسا کہ بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب قرار دیا ہے "باب من اکفر اخاہ من غیر تاویل" اور اس کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شخص کو تاویل اور جہالت کی بنا پر کافر قرار دیدے۔

صاحب فتح الباری نے "باب ماجاء فی المتاولین" کی شرح میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شخص کو کافر قرار دیدے تو اس کے بارے میں غور کیا جائے گا۔ اگر اس نے بغیر تاویل کے یہ کام کیا ہے تو قابلِ مذمّت ہوگا اور شائد کافر بھی ہو جائے۔ لیکن اگر تاویل سے یہ کام کیا ہے تو پھر دیکھا جائے گا کہ اس تاویل کی حیثیت کیا ہے۔ اگر یہ تاویل صحیح نہیں ہے تو قابلِ مذمت ہوگا لیکن کافر نہ ہوگا اور اس کی غلطی کی وضاحت کر کے اس کی تنبیہ کی جائے گی اور اسے پہلی قسم میں شامل نہیں کیا جائے گا اور اگر تاویل صحیح ہے تو قابلِ مذمت

بھی نہ ہوگا بلکہ اس کے سامنے دلائل پیش کئے جائیں گے تاکہ راہ راست پر آجائے۔

اس لئے کہ علماء کرام کا ارشاد ہے کہ ہر تاویل کرنے والا اپنی تاویل میں معذور ہے اور گنہگار نہیں ہے۔ اگر اس کی تاویل لغت عرب کے اعتبار سے صحیح ہے اور علم میں اس کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ (فتح الباری ۱۵/۳۳۳)

مجھے نہیں معلوم ہے کہ یہ حضرات ان خوارج کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں جنھوں نے تاویل کی بنا پر تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے دیا ہے اور افسوس یہ ہے کہ کسی کی تاویل کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ صرف ابن ملجم کی حرکت کو خطائے اجتہادی کا نام دیتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔۔

۲۔ مدرسۂ خلافت میں پہلی صدی کے مجتہدین اور ان کے موارد اجتہاد

۱۔ سید المرسلینؐ

ابن ابی الحدید نے جیش اسامہ سے عمر اور ابو بکر کے الگ ہو جانے اور حکم رسولؐ کی اطاعت نہ کرنے کی تاویل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ رسول اکرمؐ لشکر بھیجنے کا کام اپنے اجتہاد سے انجام دیتے تھے اور اس کا وحی الٰہی سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ اس کی مخالفت حرام ہو جائے۔ (۴/۱۷۸)

اور اس کے بعد اس باب میں اجتہاد رسولؐ کے تفصیلات کا ذکر کیا ہے ــــ اور انشاء اللہ حضرت عمر کے اجتہادات کے ذیل میں پھر رسول اکرمؐ کے اجتہاد کا ذکر آئے گا اور اجتہاد رسولؐ پر حضرات کے دلائل کا بھی ذکر کیا جائے گا اور آخر میں ہم اپنی رائے کا بھی ذکر کریں گے۔ یہاں تو صرف قوم کے نظریات کی وضاحت کے لئے رسول اکرمؐ کا نام مجتہدین میں سر فہرست لکھ دیا ہے۔

ب۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر

خواجہ طوسیؒ نے حضرت ابوبکر کے اس عمل پر اعتراض کیا کہ انھوں نے فجاۃ السلمی کو جلاڈالا اور انھیں کلالہ کے معنی اور جدّہ کی میراث کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ تو قوشجی نے شرح تجرید میں اس کا یہ جواب دیا کہ فجاۃ کو جلا دینا صرف ایک خطائے اجتہادی تھی اور ایسی غلطیاں مجتہدین سے ہوتی ہی رہتی ہیں اور کلالہ یا میراث جدہ کا مسئلہ بھی کوئی عجیب و غریب نہیں ہے۔ مجتہدین احکام کے دلائل تلاش کرتے ہی رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں دوسرے باخبر افراد سے سوال بھی کرتے ہیں۔ (شرح تجرید قوشجی طبع تبریز ۱۳۰۱ھ ص ۴۰۷، شرح نہج البلاغہ ۴/۱۸۳)

دوسرے مقام پر اس اعتراض کے جواب میں کہ ابوبکر نے خالد پر حد جاری نہیں کی اور اس سے قصاص بھی نہیں لیا۔ فرمایا ہے کہ مالک کی زوجہ سے عقد دارالحرب میں ہوا ہے اور یہ مسئلہ اجتہادی ہے۔ اس میں ہر شخص کی اپنی ایک رائے ہوتی ہے۔ اور عمر کا اعتراض بھی ابوبکر کی امامت پر اعتراض نہیں ہے اور نہ ان کا یہ مقصد تھا بلکہ یہ اسی طرح ہے جس طرح ایک مجتہد دوسرے مجتہد کی رائے سے اختلاف کرتا ہے۔

ج۔ صحابی مجتہد خالد بن الولید

ابن کثیر کا بیان ہے کہ ابوبکر نے خالد کو سرداری لشکر پر باقی رکھا۔ اس لئے کہ انھوں نے مالک بن نویرہ کے قتل کے بارے میں اجتہاد سے کام لیا تھا اور اس میں غلطی کی تھی۔

(تاریخ ابن کثیر ۶/۳۲۳)

د۔ خلیفۂ دوم عمر بن الخطاب

ابن ابی الحدید نے اعتراض پنجم کے ذیل میں درج کیا ہے کہ "وہ بیت المال سے ناجائز طریقہ پر مال تقسیم کیا کرتے تھے۔ یہانتک کہ عائشہ اور حفصہ کو سالانہ دس ہزار درہم

دے دیا کرتے تھے اور اہلبیتؑ کو خمس بھی نہیں دیتے تھے" اور پھر یہ جواب دیا ہے کہ بیت المال کا مقصد حقوق کو ان کے اہل تک پہونچا دینا ہے اور اس سلسلہ میں ولیؔ امر کو اجتہاد کرنے کا مکمل حق ہے اور خمس کا معاملہ بھی اجتہاد سے تعلق رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت عمر نے طریقۂ اجتہاد سے عدول نہیں کیا ہے اور ان پر اعتراض درحقیقت اجتہاد پر اعتراض ہے جو سارے صحابۂ کرام کا طریقۂ کار تھا۔

(شرح نہج البلاغہ ۲/۱۵۳، ۳/۱۸۰)

اور پھر ابن جوزی سے خمس کے بارے میں نقل کیا ہے کہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے۔

اور ساتویں اعتراض کا جائزہ لیتے ہوئے کہ "عمر کے فیصلوں میں تلون بہت تھا اور ایک جدہ کی میراث میں سٹر فیصلے کئے ہیں یا بروایتے نوّے فیصلے کئے ہیں اور عطایا میں امتیاز سے کام لیتے تھے جب کہ پروردگار نے مساوات کا حکم دیا ہے اور اکثر اپنے گمان و اندازہ سے فیصلہ کیا کرتے تھے"۔

یہ جواب دیا ہے کہ اجتہادی مسائل میں اختلاف کا امکان رہتا ہے اور امارات وظن غالب کی بنا پر مسلسل رائے بدلی بھی جا سکتی ہے۔ اصل مسئلہ قیاس اور اجتہاد کا ہے اور جب وہ ثابت ہے تو کسی طرح کے اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

قوشجی نے بھی خواجہ طوسیؒ کے اس اعتراض کے جواب میں کہ "عمر نے ازواج پیغمبرؐ کو حصہ دے دیا اور جناب فاطمہؑ اور اہلبیتؑ کو خمس سے محروم کر دیا۔ اور جد کے بارے میں سو طرح کے فیصلے کر دئے اور تقسیمات میں تفاوت سے کام لیا جب کہ زمانۂ پیغمبر میں ایسا کچھ نہیں تھا"۔ فرمایا ہے کہ ان سب اعتراضات کا ایک جواب ہے کہ یہ اجتہادی مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کی منزل میں ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (شرح تجرید ص ۴۰۸)

گویا کہ حضرت عمر نے رسول اکرمؐ سے اس لئے اختلاف کیا ہے کہ دونوں مجتہد تھے اور ہر مجتہد کو دوسرے مجتہد کی رائے سے اختلاف کرنے کا حق ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

۵۔ خلیفۂ سوم عثمان بن عفان

حضرت عثمان پر اعتراض کیا گیا کہ انھوں نے عبید اللہ بن عمر پر حد جاری نہیں کی حالانکہ جُرم ثابت ہو چکا تھا تو قوشجی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "انھوں نے اجتہاد کر کے یہ طے کر دیا کہ یہ جُرم ان کی امامت سے پہلے کا ہے لہٰذا ان پر حد جاری کرنے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔" (شرح تجرید ص ۴۰۹)

اور ابن تیمیہ نے بھی اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ "مسئلہ اجتہادی ہے"۔ (منہاج السنہ تالیف احمد بن عبد الحلیم بن عبد السّلام بن عبد اللہ بن ابی القاسم ابن تیمیہ الحرانی الدمشقی الحنبلی موسس فرقہ سلفیہ ۳/ ۲۰۳)

ابن تیمیہ نے حَکَم کے مدینہ واپس لانے کا جواب بھی اسی انداز سے دیا ہے کہ یہ ایک اجتہادی امر ہے اور ابن ابی الحدید نے یہ جواب بھی نقل کیا ہے کہ اگر رسول اکرمؐ اس کی واپسی کی اجازت نہ بھی دیتے تو بھی بر بنائے اجتہاد واپس لانا جائز تھا اس لئے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ (شرح نہج البلاغہ ۱/ ۲۳۲)

ابن تیمیہ نے عثمان اور ابن مسعود کے درمیان ہونے والے اختلاف میں بھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب دونوں حضرات مجتہد تھے تو دونوں کو نیکیوں پر ثواب ملے گا اور خدا ان کی بُرائیوں کو بخش دے گا اور کبھی کبھی حاکم عقوبت کے بارے میں بھی مجتہد ہوتا ہے تو اسے اس پر بھی ثواب ملتا ہے اور یہ حضرات سب مجتہد تھے لہٰذا ان کے گناہگار ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے بلکہ انھیں اجتہاد کا ثواب بھی ملے گا جیسا کہ ابو بکرہ نے مغیرہ کے خلاف شہادت دی تھی کہ ابو بکرہ ایک مرد صالح اور نیک کردار تھا اور اس نے فی سبیل اللہ شہادت دی تھی کہ اسے ثواب ملے گا لہٰذا عین ممکن ہے کہ ابن مسعود اور عمار کی تادیب بھی اسی باب سے ہو اور جب فریقین اجتہاد کے ساتھ قتال کرنے کے بعد معاف کر دئے جاتے ہیں تو جھگڑے کی کیا حیثیت ہے۔ (منہاج السنہ ۳/ ۱۹۲)

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ابن تیمیہ کا عقیدہ خود مغیرہ کے بارے میں کیا ہے جس کے

سلسلہ میں چار افراد نے گواہی دی تھی کہ انھوں نے اسے ام جمیل کے دونوں پیروں کے درمیان بیٹھے دیکھا ہے۔ شائد یہ بھی مغیرہ کا اجتہاد تھا اور اسے اس "عمل خیر" پر بھی ثواب ملے گا۔!

ــ ابن تیمیہ نے عثمان کے جمعہ کے دن ایک اذان کے اضافہ کا بھی یہی جواب دیا ہے کہ یہ اجتہادی مسائل میں شامل ہے۔

ــ ابن حجر نے صواعق میں تحریر فرمایا ہے کہ "ابن مسعود حضرت عثمان پر برابر اعتراض کیا کرتے تھے لہٰذا مصلحت کا تقاضا تھا کہ انھیں معزول کر دیا جائے اور مجتہد پر اجتہادی امور میں اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے مگر افسوس کہ ان ملاعین اعتراض کرنے والوں کے پاس نہ فہم ہے اور نہ عقل"۔ (صواعق محرقہ ابن حجر شہاب الدین احمد بن محمد بن علی بن حجر المصری الہیثمی الانصاری تصحیح الشیخ عبد الوہاب عبد اللطیف مکتبہ قاہرہ ۱۳۷۵ھ)

ــ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ ابن مسعود کے وظیفہ کا روک دینا ان اخبار کی بنا پر صحیح تھا جو دربار خلافت تک پہونچے تھے اور پھر دونوں مجتہد تھے، لہٰذا کسی پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (صواعق محرقہ ص ۱۱۲)

ــ منیٰ میں نماز کے تمام پڑھنے کے بارے میں ہونے والے اعتراض کا بھی یہ جواب دیا ہے کہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے لہٰذا اس پر اعتراض کرنا جہالت، غباوت اور نالائقی ہے اور اکثر علماء قصر کو جائز جانتے ہیں واجب نہیں سمجھتے ہیں۔ (صواعق محرقہ ص ۱۱۳)

و۔ مجتہدہ ام المومنین عائشہ

علامہ حلیؒ نے ان پر اعتراض کیا کہ انھوں نے حکم قرآنی "ازواج پیغمبرؐ اپنے گھروں میں بیٹھو"، کی مخالفت کی ہے تو ابن تیمیہ نے اس کا جواب دیا کہ "انھوں نے جاہلیت کا جیسا بناؤ سنگار نہیں کیا تھا اور گھروں میں بیٹھنے کا حکم عورت کو نہیں روک سکتا ہے اگر اس کا خروج کسی مصلحت کی بنا پر ہو اور جب مصلحت کی بنا پر نکلنا جائز ہے تو عائشہ کا بھی یہ خیال تھا کہ ان کے اس خروج میں مسلمانوں کیلئے مصلحت ہے اور انھوں نے بر بنائے تاویل

واجتہاد خروج فرمایا تھا۔"

"اور مجتہد خطار بھی ہو تو اس کی خطا کو معاف کر دیا جاتا ہے"۔ اور حضرت عائشہ بہر حال مجتہدہ تھیں لہٰذا ان کی خطا بدرجہ اولیٰ معاف کر دی جائے گی۔

"حضرت عائشہ کے خروج کا صحیح جواب یہی ہے کہ مجتہد غلطی پر ہو تو اس کی غلطی کتاب وسنت کی بنا پر معاف کر دی جاتی ہے۔" (منہاج السنہ ابن تیمیہ ۳/۱۹۰)

قرطبی نے بھی عائشہ کا دفاع اسی انداز سے کیا ہے کہ وہ مجتہدہ تھیں اور ان کا اجتہاد صحیح تھا لہٰذا انھیں اس تاویل کا ثواب اور اجر ملے گا کہ احکام میں ہر مجتہد مصیب اور حق پر ہوتا ہے۔ (تفسیر قرطبی ۴/۱۸۲)

ز۔ مجتہد بے مثال معاویہ بن ابی سفیان

ابن حجر نے تطہیر اللسان ص ۲۲ پر آپ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ "وہ مجتہد جس کا جواب ممکن نہیں ہے اور وہ عالم جس کا مثل پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔"

ح۔ وزیر معاویہ عمرو بن العاص

ابن حزم نے کتاب الفصل میں فرمایا ہے کہ معاویہ اور ان کے تمام ساتھی سب غلطی پر تھے لیکن مجتہد تھے لہٰذا انھیں ایک اجر بہر حال ملے گا۔ (الفصل فی الملل والاہواء والنحل۔ ابو محمد علی بن حزم الاندلسی الظاہری (متوفی ۴۵۶ھ) طبع مصر ۱۳۲۱ھ)

۔ "معاویہ اللہ اس پر رحم کرے خطا کار تھا لیکن ثواب کا حقدار ہے کہ مجتہد ہے۔" (الفصل ۴/۸۹)

۔ "معاویہ اور عمرو عاص نے خون کے مسئلہ میں اجتہاد کیا تھا جس طرح کہ ساحر کے بارے میں بعض حضرات کا فتویٰ ہے کہ اسے قتل کیا جائے گا اور بعض لوگ اس کے قائل نہیں ہیں لہٰذا اسی قسم کا معاویہ اور عمرو عاص کا بھی اجتہاد ہے۔ اگر کوئی آدمی جہالت اور اندھے پن سے کام نہ لے اور علم کو غیر علم سے مخلوط نہ کرے"۔ (الفصل ۴/۱۶۰)

ـ ابن تیمیہ نے بھی معاویہ پر ہونے والے اعتراضات کا یہی جواب دیا ہے کہ وہ مجتہد تھا جس طرح کہ علیؑ بن ابی طالب بھی مجتہد تھے۔ (منہاج السنہ ۳/۲۶۱، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۸۴، ۲۸۸، ۲۸۹)

ـ ابن کثیر کا ارشاد ہے کہ "معاویہ مجتہد تھا اور انشاء اللہ اسے اجر بھی ملے گا۔ (تاریخ ابن کثیر ۷/۲۷۹)

ـ ابن کثیر ہی نے تحکیم کے موقع پر معاویہ کو خلیفہ بنا دینے کے بارے میں عمرو عاص کی صفائی دی ہے کہ ان کی نگاہ میں اس میں مصلحت تھی اور مجتہد کبھی غلطی کرتا ہے اور کبھی راہ حق پر ہوتا ہے۔ (تاریخ ابن کثیر ۷/۲۸۳)

ط ـ مجتہد ابو الغادیہ قاتل حضرت عمار

ابن حزم کتاب الفصل میں فرماتے ہیں کہ عمار کو ابو الغادیہ یسار بن سبع السلمی نے قتل کیا ہے حالانکہ وہ بیعت رضوان میں شریک تھے اور ان کے ایمان کی شہادت پروردگار نے دی ہے اور ان سے رضا کا اعلان کیا ہے لیکن ابو الغادیہ نے اجتہاد کیا تھا اور اس میں غلطی کی تھی لہٰذا اسے ایک اجر بہرحال ملے گا اور اس کا قیاس قاتلان عثمان پر نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں کسی کو اجتہاد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(الفصل ابن حزم ۴/۱۶۱)

یہی بات ابن حجر نے اصابہ میں مختلف صحابۂ کرام کے بارے میں تحریر فرمائی ہے کہ سب مجتہد تھے اور سب کو غلطی پر ایک اجر ملنے والا ہے۔

ی ـ اجمالی مجتہدین

علامہ حلی نے اجمالی طور پر اصحاب کے بارے میں یہ اعتراض کیا کہ "ان حضرات نے عجیب و غریب باتیں ایجاد کی تھیں یہانتک کہ کلبی نے ان کے عیوب میں مکمل کتاب تصنیف کر دی ہے جب کہ اہلبیتؑ کا ایک عیب بھی نہیں بیان کیا ہے"۔

تو ابن تیمیہ نے اس کا جواب دیا کہ "ان معاملات میں اکثر چیزوں کے عذر موجود ہیں لہٰذا انھیں گناہ نہیں کہا جا سکتا ہے بلکہ انھیں موارد اجتہاد میں قرار دے دیا جائے گا جہاں صحیح فیصلہ پر دو ثواب ملتے ہیں اور غلطی پر ایک اجر بہرحال ملتا ہے اور خلفاء راشدین کے تمام معاملات اسی باب سے ہیں۔"

اس کے بعد اس موضوع پر جلد سوم کے ص ۱۹ سے ص ۳۰ تک مفصل بیان دینے کے بعد یہ فیصلہ سنایا ہے کہ علامہ حلیؒ کے تمام اعتراضات موارد اجتہاد میں شامل ہیں۔

(منہاج السنہ ۱۹/۳)

واضح رہے کہ کلبی سے مراد ابوالمنذر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی ہے جس کے بارے میں ذہبی کا بیان ہے کہ اس کی ڈیڑھ سو سے زیادہ تصانیف ہیں۔ (العبر ۱/ ۳۴۶)

ابن حجر نے اصابہ میں ابوالغادیہ کے حالات میں تحریر فرمایا ہے کہ "صحابہ کی تمام جنگوں کے بارے میں صحیح خیال یہ ہے کہ سب تاویل کرنے والے تھے اور مجتہد کو غلطی پر ایک ثواب ضرور ملتا ہے اور جب یہ بات عام مجتہدین کے بارے میں ثابت ہے تو صحابہ تو بطریق اولیٰ ماجور اور مثاب ہوں گے۔ (اصابہ ۴/ ۱۵۱)

یہ ہے مدرسۂ خلافت کی صورت حال جس کا سلسلہ دوسری صدی سے شروع ہوا ہے اور پندرہویں صدی کے آغاز تک جاری ہے اور سب کا ایک ہی ارشاد ہے کہ صحابہ سب مجتہد تھے اور اللہ انھیں تمام جھگڑوں اور خونریزیوں پر اجر عظیم عنایت فرمائے گا۔ وہ انھیں فقط معاف نہیں کرے گا بلکہ غلطیوں پر ثواب بھی عطا فرمائے گا۔

— کیا کہنا اس حاکم یوم الدین کا جو ہم غریبوں کو بُرائیوں پر سزا دے گا اور صحابہ کرام کو خونریزیوں اور بدکاریوں پر اجر عظیم عنایت فرمائے گا کہ وہ مجتہدین کرام تھے اور مجتہدین کے آگے پروردگار بھی کچھ نہیں کر سکتا ہے؟ — انا للہ وانا الیہ راجعون

مدرسۂ خلافت میں معاویہ کے دور تک تو یہ مسئلہ اتفاقی تھا۔ اس کے بعد ابن خلدون جیسے لوگوں نے اس میں دور یزید کو بھی شامل کر لیا ہے اور فرمایا ہے کہ بعض لوگ یزید کی

مخالفت اور اس سے جنگ کو بھی جائز جانتے تھے اور ایسے افراد کی اکثریت تھی لیکن چونکہ سب مجتہد تھے لہٰذا کسی فریق پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا ہے۔ سب نیک رفتار اور حق کے طلبگار تھے لہٰذا اجر و ثواب کے حقدار ہیں اور پروردگار ہمیں بھی ان کی اقتدا کی توفیق عنایت فرمائے"۔ (مقدمہ ابن خلدون طبع دار الکتاب اللبنانی ۱۹۵۶ء ص ۳۸۰)

میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جب سب کے سب مجتہد تھے اور سب نے صحبتِ پیغمبرؐ کا شرف حاصل کر لیا تھا اور اسی بنا پر ان سے مواخذہ نہیں ہو سکتا ہے تو صرف قاتلانِ عثمان ہی اس قانون سے کیوں مستثنیٰ ہیں کہ ابن حزم نے ابو الغادیہ تک کو مجتہد قرار دے کر معاف کرنے کے بعد یہ فیصلہ سنایا ہے کہ یہ مسئلہ قتلِ عثمان سے مختلف ہے کہ وہاں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عثمان نے نہ کسی کو قتل کیا۔ نہ کسی سے جنگ کی۔ نہ کسی شوہر دار عورت سے زنا کی۔ نہ ارتداد کا راستہ اختیار کیا تو ان کے بارے میں اجتہاد کس طرح ہو سکتا ہے۔ ان کے قاتل فاسق، محارب، خونریز اور سفاک ہیں اور اس کی کوئی تاویل نہیں ہے۔ یہ صرف ظلم اور ستم ہے لہٰذا یہ لوگ فاسق اور ملعون ہیں۔ (الفصل ۴/۱۶۱)

اے کاش کوئی یہ سمجھا جاسکتا کہ پھر حضرت علیؑ کا قاتل ابن ملجم جس نے عین حالتِ نماز میں محرابِ مسجد میں آپ کے سرِ اقدس پر ضربت لگائی ہے وہ کس طرح مجتہد قرار پا گیا اور اس کا یہ عمل "عملِ خیر" کس طرح قرار دے دیا گیا۔

ک۔ مجتہد عبد الرحمٰن ابن ملجمؑ قاتل امام علیؑ

ابن حزم نے المحلی ۱۰/۴۸۴ میں اور ابن الترکمانی نے الجوہر النقی در ذیل سنن بیہقی ۸/۵۸-۵۹ میں تحریر فرمایا ہے کہ "امت میں اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ابن ملجم نے امام علیؑ کو بر بنائے تاویل و اجتہاد قتل کیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ راہِ راست پر ہے"۔

کاش کوئی اس امر کی بھی وضاحت کر دیتا کہ ابن ملجم کے بارے میں یہ حسن ظن کہاں سے پیدا ہو گیا۔ وہ تو صحابی بھی نہیں تھا۔ اور پھر یزید بھی مجتہدین میں شامل ہو گیا جب کہ

وہ بھی صحابیت کے شرف سے محروم تھا۔؟

ل۔خلیفہ۔یزید بن معاویہ

۔ابو الخیر الشافعی نے یزید کے بارے میں فرمایا ہے کہ" وہ امام مجتہد تھا"۔
(تاریخ ابن کثیر ۱۳/۹)

ابن کثیر نے ابو الفرج کی طرف سے لعن یزید کا جواز نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ:
"بہت سے افراد نے اسے ناجائز قرار دیا ہے اور اس سلسلہ میں کتابیں بھی لکھی ہیں تاکہ اسے اس کے باپ یا دیگر اصحاب کے لعن کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے اور ان تمام غلط تصرفات کو تاویل اور اجتہاد کی غلطی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ یزید امام فاسق تھا اور امام فاسق بھی ہو جائے تو صحیح فتویٰ کی بنا پر اسے معزول نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس کے خلاف خروج بھی جائز نہیں ہے کہ اس طرح فتنے سر اُبھار لیں گے اور امت میں ناحق خونریزی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

اور بعض لوگوں نے جو یہ بات نقل کی ہے کہ یزید نے اہل مدینہ کی تباہی اور واقعہ حرہ میں مسلم بن عقبہ کے مظالم کو سننے کے بعد انتہائی مسرت کا اظہار کیا تھا تو اس کا راز یہ تھا کہ وہ اپنے کو امام تصور کرتا تھا اور ان لوگوں کو باغی سمجھ رہا تھا کہ انھوں نے اطاعتِ امام کو نظرانداز کر کے دوسرا حاکم بنا لیا ہے لہٰذا ان سے اس وقت تک جہاد جائز تھا جب تک دوبارہ اطاعت گذاروں کی جماعت میں شامل نہ ہو جائیں"۔ (تاریخ ابن کثیر ۸/۲۲۳-۲۲۴)

افسوس کہ مسلمانوں کی انھیں حماقتوں اور بددینیوں نے لفظ اجتہاد کو اسقدر بدنام کر دیا کہ ایک مدت دراز تک مکتبِ اہلبیتؑ کے افراد اس سے چڑھتے رہے اور انھیں اس لفظ سے ایسے ہی مفہوم کی بُو آتی رہی۔ یہاں تک کہ محقق حلیؒ نے اس نکتہ کو اٹھایا کہ ظالموں کے غلط کردار کی بنا پر نہ لفظ کو بدنام کیا جا سکتا ہے اور نہ اصل حقیقت کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے احمقانہ اقدام کو دائرہ اجتہاد سے باہر نکالا جائے نہ یہ کہ اجتہاد کو بدنام کلمات کی صفوں میں شامل کر دیا جائے۔

اجتہادِ استنباط احکام کی اصولی کوشش کا نام ہے۔ اسے خود رائی، من مانی، بے دینی، خونریزی اور بدکاری سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کے پردہ میں جرائم کی پرورش کی جاسکتی ہے۔! جوادی

۴۔ تفصیل موارد اجتہاد

گذشتہ صفحات میں جن اجتہادات کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کی قدرے تفصیل بھی نقل کردی جائے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ مسلمانوں نے کن آراء و افکار اور خیالات و نظریات کو اجتہاد کا نام دیا ہے اور اس کے پردہ میں کیا کیا اعمال انجام دئے ہیں۔

یہ سلسلہ بھی گذشتہ سلسلہ ہی کی طرح سرکار دو عالمؐ سے شروع کیا جارہا ہے۔ جوادی

۱۔ اجتہادِ رسولِ اکرمؐ

یہ پہلے واضح کیا جاچکا ہے کہ مکتبِ خلافت میں سب سے پہلا مجتہد رسولِ اکرمؐ کو قرار دیا گیا ہے اور جیشِ اسامہ کے ذیل میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضور لشکر کی ترسیل کا کام اپنے اجتہاد سے انجام دیتے تھے اور اس کا وحی الٰہی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہذا اب اس امر کی وضاحت کی ضرورت ہے کہ یہ لشکرِ اسامہ کیا تھا اور حضرات شیخین کے تخلف اور علیحدگی کی نوعیت کیا تھی؟

طبقات ابن سعد، انساب الاشراف، عیون الاثر وغیرہ میں اس واقعہ کی تفصیل طبقات کے الفاظ میں یوں ہے کہ "۱۱ھ میں دوشنبہ کے دن جب ماہ صفر کے صرف چار دن باقی رہ گئے تھے۔ رسول اکرمؐ نے روم والوں سے جنگ کا حکم صادر فرمادیا اور دوسرے دن صبح کو اسامہ بن زید کو بلا کر فرمایا کہ وہاں تک جاؤ جہاں تمہارے باپ کا مقتل ہے اور انھیں پامال کردو کہ میں نے تمھیں اس لشکر کا ذمہ دار بنادیا ہے"۔

چہار شنبہ کے دن رسول اکرمؐ کی علالت اور درد سر کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن پنجشنبہ کی صبح آپ نے پرچم لشکرِ اسامہ کے حوالہ کر دیا اور وہ مدینہ سے روانہ ہو کر تین میل دور مقام جرف پر ٹھہر گئے اور انصار و مہاجرین کے تمام نمایاں افراد کو ساتھ چلنے کی دعوت دی جن میں ابوبکر، عمر بن الخطاب، ابو عبیدہ بن الجراح، سعید بن زید وغیرہ سب شامل تھے۔

قوم نے اس اندازِ قیادت پر چہ میگوئیاں شروع کر دیں کہ مہاجرین اوّلین پر ایک نوجوان کو کیسے سردار بنا دیا گیا ہے؟۔ رسول اکرمؐ کو یہ سُن کر شدید غصّہ آیا اور آپ سر پر پٹی باندھ کر چادر اوڑھ کر گھر سے نکل پڑے اور منبر پر جا کر فرمایا "یہ میں تمھارے بعض افراد کی طرف سے کیا سُن رہا ہوں۔ تمھیں اسامہ کی سرداری پر اعتراض ہے؟۔ تم نے اس سے پہلے اس کے باپ کی سرداری پر بھی اعتراض کیا تھا حالانکہ خدا کی قسم وہ اس کا اہل تھا اور اس کا بیٹا بھی آج اس امارت و ریاست کا حقدار ہے"۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اُتر آئے اور مسلمانوں نے آپ سے رخصت ہو کر جرف کا رُخ کر لیا لیکن آپ برابر اصرار فرماتے رہے کہ اسامہ کے لشکر کو روانہ کرو"۔

یکشنبہ کے دن آپ کے مرض میں شدّت پیدا ہو گئی اور اسامہ نے واپس آکر عیادت کی اور آپ کے سر اقدس کو بوسہ دیا۔ جب آپ مرض کی شدّت سے کلام بھی نہیں فرما رہے تھے۔

اسامہ رخصت ہو کر اپنے لشکر تک واپس آ گئے اور جب دوشنبہ کے دن حضورؐ کو قدرے افاقہ ہوا تو فرمایا کہ "جاؤ خدا برکت دے"۔

اسامہ آپ سے رخصت ہو کر لشکر کے پڑاؤ تک واپس آئے اور کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ ابھی سوار بھی نہ ہونے پائے تھے کہ جناب ام ایمن کی طرف سے ایک نمائندہ آگیا اور اس نے خبر دی کہ حضور کا وقت آخر ہے۔

اسامہ فوراً واپس آئے اور ان کے ساتھ عمر اور ابو عبیدہ بھی چلے آئے۔ آپ کا وقت آخر تھا اور آپ نے دوشنبہ کے دن زوال کے وقت دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ یہ واقعہ

ربیع الاول کی بارہ تاریخ کا ہے۔ (طبقات ابن سعد طبع دار صادر بیروت ۱۳۷۶ھ ۱۹۰/۲۔۱۹۲، عیون الاثر ۲/۲۸۱)

اس کے علاوہ ابوبکر اور عمر کے لشکر اسامہ میں شامل ہونے کا تذکرہ حسب ذیل افراد نے بھی کیا ہے۔ (کنز العمال طبع اول ۳۱۲/۵، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۱۸۰/۴ بروایت عروہ، انساب الاشراف ۱/۴۷۴ در حالات اسامہ بروایت ابن عباس، طبقات ابن سعد ۶۶/۴ حالات اسامہ بروایت ابن عمر، تہذیب ابن عساکر حالات اسامہ، تاریخ یعقوبی طبع بیروت ۲/۷۴ در ذکر وفات رسول، ابن اثیر ۲/۱۲۳)

شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ۲/۲۱ میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جب حضرت کو افاقہ ہوا تو آپ نے اسامہ اور لشکر کی روانگی کے بارے میں دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ فرمایا کہ فوراً روانہ کرو۔ خدا اس پر لعنت کرے جو اس لشکر کے ساتھ نہ جائے اور اس جملہ کی تکرار فرماتے رہے۔ یہانتک کہ اسامہ پرچم اسلام اٹھائے ہوئے نکل پڑے اور ان کے ساتھ صحابۂ کرام بھی تھے۔ مقام جرف پر اُترے تو ابوبکر، عمر اور اکثر مہاجرین ہمراہ تھے، انصار میں سے اُسید بن حضیر، بشیر بن سعد وغیرہ بھی تھے۔ یہانتک کہ ام ایمن کا فرستادہ آگیا۔

یہ تھی لشکر اسامہ کی صورت حال۔ سرکار دو عالمؐ کے آخری لمحات تک۔ اس کے بعد کا قصّہ عروہ کی زبانی یہ ہے کہ ـــ

"جب لوگ بیعت سے فارغ ہوئے اور اطمینان حاصل ہو گیا تو ابوبکر نے اسامہ سے کہا کہ اب جدھر رسول اکرمؐ نے بھیجا ہے چلے جاؤ۔" (تاریخ ابن عساکر ۱/۴۳۳)

اور یہ سُن کر اسامہ لشکر کو لے کر روانہ ہو گئے لیکن ابوبکر و عمر نے تخلف فرمایا اور ساتھ نہیں گئے کہ انھیں خلافت کا کاروبار انجام دینا تھا حالانکہ حضرت عمر اسامہ سے برابر کہا کرتے تھے کہ رسول اکرمؐ نے انتقال فرمایا تو تم ہمارے امیر تھے۔

(سیرت حلبیہ ص ۲۳۷)

بعض علمائے اعلام نے اسی تخلف شیخین پر اعتراض کیا ہے جس کا جواب یہ دیا گیا ہے

کہ حضرتؐ لشکر بھیجنے کا کام اپنے اجتہاد سے انجام دیا کرتے تھے لہٰذا اصحابہ مجتہدین کو اجتہاد رسولؐ سے اختلاف کرنے کا حق ہے۔ (شرح نہج البلاغہ ۴/۱۷۳-۱۷۴)

ـــــ واضح رہے کہ یہ بھی اجتہاد کی ایک قسم ہے کہ مجتہد اپنے فتویٰ پر عمل نہ کرنیوالے مجتہدین کو ملعون قرار دیدے اور بار بار اس کی تکرار بھی کرے۔ یالیت قومی یعلمون۔

جوادی

ب۔ اجتہاد ابوبکر

آپ کے اجتہاد کے موارد میں ایک موقع فجاۃ السلمی کے جلا دینے کا بھی ہے جس کی تفصیل طبری، ابن اثیر، ابن کثیر سب نے نقل کی ہے اور طبری کے الفاظ یہ ہیں: "ابوبکر کے پاس بنی سلیم کا ایک شخص آیا جس کا نام تھا فجاۃ۔ بجیر بن ایاس بن عبداللہ بن عبد یالیل بن عمیرہ بن خفاف اور ابوبکر سے کہنے لگا کہ میں مسلمان ہوں اور مرتد لوگوں سے جہاد کرنا چاہتا ہوں لہٰذا آپ مجھے سواری دیں اور میری امداد فرمائیں۔ انھوں نے سواری اور اسلحہ کا انتظام کر دیا اور وہ روانہ ہو گیا اور آگے جاکر مسلمان اور مرتد سب پر حملہ کر کے ان کے اموال لوٹنے لگا اور جس نے بھی انکار کیا انھیں مارنے لگا۔ اس کے ہمراہ بنی الشرید کا ایک شخص نجبہ بن ابی المیثاء بھی تھا۔

حضرت ابوبکر کو یہ خبر ملی تو انھوں نے طریفہ بن حاجر کو لکھا کہ دشمنِ خدا فجاۃ میرے پاس اسلام کا دعویدار بن کر آیا اور مجھ سے مرتدین سے جہاد کرنے کے لئے امداد طلب کی۔ میں نے اسے مسلح کر دیا تو اب خبر یہ ملی ہے کہ دشمنِ خدا مسلمان اور مرتد سب کے اموال پر قبضہ کر رہا ہے اور انکار کرنے والوں کو قتل کر رہا ہے۔ لہٰذا فوراً مسلمانوں کا لشکر لے کر روانہ ہو جاؤ اور اسے قتل کر دو یا گرفتار کر کے میرے پاس لے آؤ۔

طریفہ بن حاجر یہ حکم پا کر روانہ ہو گیا اور جب دشمن کی جماعت تک پہونچا تو اس کے ایک تیر انداز نے نجبہ بن ابی المیثاء کو نشانہ بنا کر اس کا خاتمہ کر دیا اور فجاۃ نے اس خطرناک صورت حال کو دیکھ کر طریفہ سے کہا کہ تم مجھ سے بہتر نہیں ہو۔ تم بھی ابوبکر کے فرستادہ ہو اور

یں بھی انھیں کا مقرر کیا ہوا ہوں۔

طریفہ نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو اسلحہ رکھ دو اور میرے ساتھ ابو بکر کے پاس چلو۔ فجاۃ روانہ ہو گیا اور جب دونوں ابو بکر کے پاس وارد ہوئے تو انھوں نے طریفہ کو حکم دیا کہ اسے اِس گڈھے کے پاس لے جاؤ اور جلا کر راکھ کر دو۔

طریفہ اسے لے کر مصلیٰ کی طرف آیا اور آگ روشن کر کے اسے اس میں جھونک دیا۔

بعد میں حضرت ابو بکر اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوئے اور انھوں نے مرض الموت میں فرمایا کہ "کاش میں نے تین کام نہ کئے ہوتے۔ کاش خانۂ فاطمہؑ پر حملہ نہ کیا ہوتا چاہے وہ لوگ جنگ کی تیاری کے لئے دروازہ بند کئے رہتے اور فجاۃ السلمی کو نذر آتش نہ کیا ہوتا اور اسے باقاعدہ قتل کرتا یا آزاد کر دیتا۔ اور کاش روز سقیفہ اس امر خلافت کو عمر یا ابو عبیدہ کی گردن پر ڈال دیتا اور خود ذمہ داری نہ لیتا۔ (طبری ۴/۵۲)

ابو بکر پر اس سلسلہ میں اعتراض کیا گیا کہ فجاۃ جیسے لوگوں کی سزا سورۂ مائدہ آیت ۳۳ میں موجود ہے کہ "جو لوگ خدا اور رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ ان کی سزا یہ ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے یا پھانسی پر لٹکا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دئے جائیں یا انھیں ملک بدر کر دیا جائے کہ اسی میں ان کے لئے دنیا کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے عظیم عذاب ہے"۔

اور خود رسول اکرمؐ نے بھی کسی شخص کو جلانے کی شدید ممانعت کی ہے جیسا کہ صحیح بخاری ۲/۱۱۵، مسند احمد ۲/۲۰۷، ۳/۴۹۴، سنن ابی داؤد کتاب الجہاد حدیث ۲۶۷۳، ۲۶۷۵، ۳/۵۵-۵۶، کتاب الادب حدیث ۵۲۶۸، ۴/۳۶۷-۳۶۸، بیہقی ۹/۷۱-۷۲ وارد ہوا ہے کہ "آگ کی سزا صرف آگ کا خالق دے سکتا ہے"۔ "آگ کی سزا اللہ کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا ہے"۔ "نار کی سزا صرف رب النار دے سکتا ہے"۔

"اگر کوئی دین بدل دے تو اسے قتل کر دو"۔ (صحیح بخاری، سنن ابی داؤد کتاب الحدود، بیہقی ۹/۷۱، ۷۲)

"کسی بھی مسلمان کا خون صرف تین اسباب سے حلال ہو سکتا ہے۔ یا زوجہ رکھ کر

زنا کرے تو اسے سنگسار کیا جائے گا یا خدا اور رسول سے جنگ کے لئے نکل پڑے تو اسے قتل کیا جائے گا یا پھانسی دی جائے گی یا ملک بدر کر دیا جائے گا۔ یا کسی شخص کو قتل کرے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔" (سنن بیہقی ۹/۷۱)

اس اعتراض کے جواب میں علماء اسلام نے فرمایا ہے کہ ان نصوص صریحہ کی مخالفت کر کے فجاۃ السلمی کو نذر آتش کر دینا ایک اجتہادی غلطی تھی اور ایسی غلطیاں مجتہدین سے ہوتی ہی رہتی ہیں۔

ــــــ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری ــــــ (جوادی)

مورد دوم

حضرت ابوبکر کا فتویٰ کلالہ کے بارے میں۔ کلالہ اس میت کا نام ہے جس کے ورثہ میں نہ کوئی والد ہو اور نہ اولاد۔ اور اس کے ورثہ کو بھی کلالہ ہی کہا جاتا ہے یعنی والدین کے علاوہ دوسرے تمام ورثہ۔

قرآن مجید میں کلالہ کی میراث کا تذکرہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۲ میں بھی ہے اور آیت نمبر ۱۷۶ میں بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب ابوبکر سے کلالہ کی میراث کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں اپنی رائے دے رہا ہوں۔ اگر صحیح ہے تو خدا کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے اور اللہ و رسول اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کلالہ والد اور اولاد کے علاوہ ہے۔

اس کے بعد جب عمر کا دور خلافت آیا تو انھوں نے فرمادیا کہ مجھے ابوبکر کی بات کو رد کرتے ہوئے خدا سے حیا آتی ہے۔ (سنن دارمی ۲/۳۶۵، اعلام الموقعین ابن قیم جوزیہ ۱/۲۸، سنن کبریٰ بیہقی ۶/۲۲۳)

ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ کلالہ وہ ہے جس کے اولاد نہ ہو۔ (تفسیر قرطبی ۵/۷۷)

تیسرا مورد

حضرت ابوبکر کا جواب جدہ کی میراث کے بارے میں۔ جسے موطا مالک ۲/۵۴،

سنن دارمی ۲/ ۳۵۹، سنن ابو داؤد ۲/ ۳۸، ابن ماجہ ص ۹۱۰، بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۷۸ سب نے نقل کیا ہے اور موطا کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک جدہ ابو بکر صدیق کے پاس میراث کا سوال لے کر آئی تو انھوں نے فرمایا کہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ میں تمھارا کوئی حق نہیں ہے۔ اب تم جاؤ میں لوگوں سے سوال کر کے بتاؤں گا اور اس کے بعد لوگوں سے سوال کیا تو مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ حضور نے ۱/۶ دیا تھا۔ انھوں نے گواہی طلب کی تو محمد بن مسلمہ انصاری نے گواہی دے دی اور ابو بکر نے حکم نافذ کر دیا۔

ـــ استیعاب حاشیہ اصابہ ۲/ ۴۴۱، اسد الغابہ ۳/ ۲۹۹، اصابہ ۲/ ۳۹۴، بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۷۹، موطا مالک ۲/ ۵۴ پر یہ روایت نقل کی گئی ہے جسے اہل تاریخ نے عبد الرحمٰن بن سہیل کے حالات میں درج کیا ہے کہ ابو بکر کے پاس دو جدہ آئیں ایک نانی تھی اور ایک دادی تو انھوں نے سارا ترکہ نانی کو دے دیا اور دادی کو محروم کر دیا۔ تو عبد الرحمٰن بن سہیل حارثی نے اعتراض کیا کہ آپ نے اسے دے دیا کہ اگر وہ مرجاتی تو اسے کچھ نہ ملتا تو انھوں نے دونوں کو برابر برابر ۱/۶ دے دیا۔

چوتھا مورد

قتل مالک بن نویرہ اور عقد زوجہ مالک۔ مالک بن نویرہ تمیمی یربوعی کو رسول اکرمؐ نے ان کی قوم کی زکوٰۃ جمع کرنے پر مامور کیا تھا اور وہ زندگی بھر یہ کام کرتے رہے لیکن جب حضور کا انتقال ہو گیا تو ابو بکر کی خلافت کا انکار کر کے مال کو مستحقین میں تقسیم کر دیا۔

جس کی تفصیل طبری نے عبد الرحمٰن بن ابی بکر کی زبانی یوں نقل کی ہے کہ انھوں نے خالد کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ خالد نے وادی بطاح میں قیام کیا اور ضرار بن ازور کو ایک لشکر دے کر روانہ کر دیا۔ اس نے راتوں رات حملہ کر دیا اور سب کو گرفتار کر کے خالد کے سامنے لا کر پیش کر دیا۔ (طبری طبع یورپ ۱/ ۱۹۲۷-۱۹۲۸)

اصابہ ۳/ ۳۲۷ پر یہ داستان یوں ہے کہ "خالد نے مالک کی عورت کو دیکھا کہ نہایت حسین و جمیل ہے تو کہا کہ مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور مالک نے اپنی زوجہ سے کہا

کہ میرے قتل کا اصل سبب تیرا جمال ہے۔

تاریخ یعقوبی ۲/ ۱۳۱ کا بیان یہ ہے کہ خالد کو مالک کی زوجہ پسند آگئی اور اس نے کہا کہ میں تیرے قتل سے کم پر راضی نہیں ہو سکتا ہوں۔

کنز العمال طبع اول ۳/ ۱۳۲ کے الفاظ ہیں" خالد بن ولید کا دعویٰ ہے کہ میرے اخبار کی بنا پر مالک نے کلمۂ کفر زبان پر جاری کیا ہے۔ مالک نے اس کا انکار کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں اور مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اور قتادہ و عبداللہ بن عمر نے گواہی بھی دے دی لیکن اس نے ضرار بن ازور اسدی کو حکم دے دیا اور اس نے مالک کی گردن اڑادی اور خالد نے ان کی زوجہ ام تمیم کو پکڑ کر فوراً عقد کر لیا۔

—— رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی —— انا للہ —— جوادی

وفیات الاعیان ۵/ ۶۷، ابوالفدار ص ۱۵۸، تاریخ یعقوبی ۱/ ۱۳۲، اور کنز العمال طبع اول ۳/ ۱۳۲ حدیث ۲۲۸ میں واقعہ کا تتمہ یوں نقل کیا گیا ہے کہ جب یہ خبر ابوبکر و عمر تک پہونچی تو عمر نے ابوبکر سے کہا کہ خالد نے زنا کیا ہے لہٰذا اسے سنگسار ہونا چاہئے۔ ابوبکر نے کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا ہوں۔ خالد سے خطائے اجتہادی ہو گئی ہے۔

کہا تو کم سے کم معزول کر دیجئے؟ ۔ فرمایا جس تلوار کو خدا نے نیام سے باہر نکال دیا ہے اسے میں نیام کے اندر نہیں رکھ سکتا ہوں۔

(قربان جائیے اس شمشیر کے جو اس طرح شمشیر برہنہ ہو جائے —— جوادی)

یہ ہے مالک کی شہادت اور ان کی زوجہ کے عقد کی مکمل داستان جسے تاویل و اجتہاد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ خالد نے ایک نمازی مسلمان کے بارے میں اجتہاد کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ پھر دوبارہ اجتہاد کر کے قتل کر دیا اور پھر اسکی زوجہ کے بارے میں اجتہاد کر کے عقد کر لیا۔

اور پھر ابوبکر کے اجتہاد کا نمبر آیا اور انھوں نے پہلے اجتہاد کر کے خالد سے قصاص کو ساقط کیا اور پھر دوبارہ اجتہاد کر کے حد شرعی کو بھی ساقط کر دیا۔

آخر میں حضرت عمر نے اجتہاد کیا اور انھوں نے خالد کو قابل سنگسار قرار دے دیا

اور ان کا اجر دُہرا ہے کہ ان کا اجتہاد صحیح تھا ورنہ ایک اجر تو حضرت ابو بکر اور حضرت شمشیر برہنہ کے لئے بھی ہے۔

صرف مالک بن نویرہ کے لئے کوئی اجر نہیں ہے کہ ان کی گرفتاری اور گردن زدنی کا کام حضرت سیف اللہ نے انجام دیا ہے۔ انا للہ

ج۔ موارد اجتہاد حضرت عمر

طبری نے سنہ ۲۳ھ کے حوادث کے ذیل میں حضرت عمر کے خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "آپ نے سب سے پہلے لوگوں کے وظائف کا دفتر مرتب کیا اور قبائل کے اعتبار سے لوگوں کا اندراج کیا اور پھر سب کے وظائف مقرر کئے۔

(تاریخ طبری ۲/ ۲۲-۲۳)

ابن الجوزی نے سیرت عمر کے ذیل میں درج کیا ہے کہ آپ نے عباس بن عبدالمطلب کا بارہ ہزار وظیفہ مقرر کیا۔ ازواج رسولؐ کو دس دس ہزار درہم دئے اور حضرت عائشہ کے لئے دو ہزار کا اضافہ کر دیا۔ جن مہاجرین نے بدر میں شرکت کی تھی انھیں فی کس پانچ ہزار دیا اور انصار میں سے بدر میں شرکت کرنے والوں کے لئے چار ہزار طے کئے اور ایک روایت کی بنا پر تمام اہل بدر کو پانچ پانچ ہزار دئے۔

اُحد سے لے کر حدیبیہ تک کے شرکار کو چار ہزار دئے۔

اس کے بعد کے شرکار کو تین ہزار دئے۔

وفات پیغمبرؐ کے بعد کے معرکوں میں شرکت کرنے والوں کو دو ہزار، ڈیڑھ ہزار، ایک ہزار اور دو سو تک حسب مراتب۔

اس کے علاوہ اہل بدر کی ازواج کو پانچ سو۔ بدر کے بعد حدیبیہ تک کے شرکار کی ازواج کو تین سو۔ اہل قادسیہ کی ازواج کے لئے دو سو اور اس کے بعد سب برابر۔

(شرح النہج حدیدی ۲/ ۱۵۴، فتوح البلدان بلاذری ص ۵۵۰-۵۶۵)

یعقوبی کی روایت اس سے قدرے مختلف ہے۔ اس میں قریش کے اکابر ابو سفیان بن

حرب اور معاویہ بن ابی سفیان کے لئے پانچ ہزار کا ذکر ہے۔ (تاریخ یعقوبی ۲/ ۱۵۳)

اس تفاوت اور تفضیل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض مسلمانوں کو دوسرے افراد کے مقابلہ میں تقریباً ساٹھ گنا زیادہ وظیفہ مقرر ملا جس طرح کہ عام مسلمان عورتوں کے مقابلہ میں حضرت عائشہ کا وظیفہ تھا ۲۰۰ × ۶۰ = ۱۲۰۰۰

اور اس طرح اسلامی سماج کے اندر سنت رسولؐ کے خلاف طبقاتی نظام پیدا ہوگیا اور ایک طرف دولت کے انبار لگ گئے، اور دوسری طرف غربت کے آثار نمایاں ہوگئے اور ایک بے عمل اور ناکارہ طبقہ وجود میں آگیا جس کا اندازہ آخر عمر میں خود خلیفۂ دوم کو بھی ہوگیا اور انھوں نے اعلان فرمادیا کہ اگر میں نے اس انجام کار کا شروع سے اندازہ کرلیا ہوتا تو اغنیار کے تمام اموال کو مہاجرین کے غربار پر تقسیم کر دیتا۔ (طبری ۵/ ۳۳)

افسوس کہ اس وقت بھی خلیفۃ المسلمین کو صرف مہاجرین کے غربار یاد آئے اور انھیں غریب انصارِ مدینہ کے فقرار و مساکین کا خیال نہ آیا اور قبائلی تعصّب کا سلسلہ باقی رہ گیا۔

بیت المال کی اس سالانہ تقسیم کا سب سے بُرا اثر یہ ہوا کہ تمام فقرار و مساکین اور مسلمان، حکام کے رحم و کرم کے زیر اثر آگئے، اور والیوں نے مخالفین کے وظائف قطع کرنا شروع کردئے اور تائید کرنے والوں پر کرم کی برسات کردی جیسا کہ عثمان کے دورِ حکومت میں دیکھنے میں آیا اور پھر زیاد اور ابن زیاد نے اہلِ کوفہ کے ساتھ یہی برتاؤ کیا۔

۵۔ خمس کے بارے میں حضرت ابوبکر و عمر کا اجتہاد

خلفار اسلام کے خمس کے بارے میں اجتہاد اور دختر رسول اکرمؐ کے حقوق کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ان اصطلاحات کا سمجھنا ضروری ہے جو اس موضوع میں استعمال کیجاتی ہیں اور جن کی حقیقت پر صدیوں کی سیاسی گرد پڑی ہوئی ہے۔

اسلامی مالیات میں حسب ذیل اصطلاحات کا استعمال کیا جاتا ہے:

زکوٰۃ، صدقہ، فئ، صفی، انفال، غنیمت، خمس۔

مفردات راغب اصفہانی، نہایۃ ابن اثیر، لسان العرب ابن منظور، قاموس، شرح قاموس، تفسیر طبرسی، تفسیر طبری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ زکوٰۃ شریعتِ اسلام میں ہر مالی حق کا نام ہے۔

اور صدقہ اس حصہ کا نام ہے جو سونے چاندی کے سکّوں۔ چار طرح کے غلات اور تین طرح کے جانوروں میں سے نصاب کی تکمیل کے بعد نکالا جاتا ہے یا جس کا ادا کرنا روزِ عید الفطر ضروری ہوتا ہے۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ خمس، صدقہ، صفی کا تذکرہ رسول اکرمؐ کے نوشتہ میں انواع زکوٰۃ کے ذیل میں کیا گیا ہے "جو تم نے فوائد میں سے زکوٰۃ ادا کی ہے۔ اس میں اللہ کا خمس، نبی کا حصہ، نبی کا منتخب مال اور مومنین کا واجب صدقہ سب شامل ہیں۔" (فتوح البلدان ۱/۸۵، سیرۃ ابن ہشام ۴/۲۵۸-۲۵۹)

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ زکوٰۃ کا مترادف لفظ نہیں ہے بلکہ یہ زکوٰۃ کے اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ پھر زکوٰۃ صدقہ کے معنی میں کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس کا ذکر مکی آیات میں ہوا ہے اور صدقہ کی تشریع مدینہ میں ہوئی ہے (ملاحظہ ہو لفظ زکوٰۃ سورۂ مومنون آیت ۴ میں اور آیت ۱۵۶ سورۂ اعراف میں اور آیت ۱۳، ۳۱، ۵۵ سورۂ مریم میں اور آیت ۷۳ سورۂ انبیاء میں جو سب کے سب مکی سورے ہیں)۔

اور صدقہ ہجرت پیغمبرؐ کے بعد مدینہ میں ۸ھ یا ۹ھ میں واجب کیا گیا ہے۔

بنا بریں حدیث شریف "جب تم نے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی تو گویا اپنے فرض کو ادا کر دیا" کی تفسیر اس طرح ہونی چاہئے کہ جب تم نے اپنے مال کا فرض ادا کر دیا تو گویا کہ حق اللہ کو ادا کر دیا۔ (سنن ترمذی ۳/۹۷)

رہ گیا مال میں سے مستحب خیرات کرنا تو اسے نفل کہا جاتا ہے اور یہ حق نہیں ہے۔

اس طرح حدیث شریف "جس نے کسی مال کا استفادہ کیا اس پر سال گذرنے سے پہلے زکوٰۃ نہیں ہے" اس کی تفسیر بھی حق الٰہی سے کی جائے گی کہ وہ سال تمام ہونے سے پہلے ثابت نہیں ہوتا ہے۔ (سنن ترمذی ۲/۱۲۵)

صدقہ کا لفظ مذکورہ حق کے بارے میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس مال کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو انسان قربۃً الی اللہ نکالتا ہے چاہے مستحب ہو یا واجب ۔ اور دونوں کا فرق یہ ہے کہ اگر حاکم سونے چاندی کے سکّوں اور غلاّت وانعام سے اپنا حصہ جبراً لے لے تو بھی اسے زکوٰۃ اور صدقہ واجب کہا جا سکتا ہے لیکن یہ وہ صدقہ نہیں ہے جو قربۃً الی اللہ نکالا جاتا ہے۔

فیُ ۔ اس مال کا نام ہے جو کفار سے جنگ کے بغیر حاصل ہوتا ہے جیسے کہ بنی نضیر کے اموال تھے اور ان میں پیغمبر اسلامؐ کا تصرف ویسا ہی تھا جیسے مالک اپنی ملکیت میں تصرّف کرتا ہے ۔

صفی ۔ وہ مال یا جائداد یا جاگیر ہے جسے رسول اکرمؐ اپنے لئے مخصوص فرمالیں ۔

انفال ۔ نفل کی جمع ہے جس کے معنی عطیہ اور ہبہ کے ہیں جو واجبات سے زیادہ ہوتا ہے اور اس کا استعمال قرآن مجید میں جنگ بدر کے ذیل میں ہوا ہے جب پروردگار نے مسلمانوں سے ان تمام اموال کو واپس لے لیا جو کفار سے بغیر جنگ حاصل ہوئے تھے اور اس میں وہ تمام زمینیں شامل تھیں جن کے مالک بلا کسی حرب وضرب کے جلاوطن ہو گئے یا جو بادشاہوں کے مخصوص املاک تھے یا جو زمینیں مُردہ تھیں اور ان کا استعمال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

غنیمت اور مغنم ۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس مال کو کہا جاتا ہے جو انسان کو بغیر کسی مشقت کے حاصل ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ دشمن کی طرف سے حاصل ہونے والے لباس، اسلحہ اور جانور کو سلبہ کہا جاتا ہے اور دیگر اموال کو حربہ کہا جاتا ہے کہ اس میں کسی نہ کسی طرح کی مشقت ضرور ہوتی ہے اور غنیمت میں مشقت نہ ہونے کی شرط ہے جس طرح کہ نہبیہ اور نہبیٰ بھی غنیمت ہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

مشقت آمیز مال کے بارے میں لفظ غنیمت کا استعمال سب سے پہلے قرآن مجید نے کیا ہے جہاں بدر کے دشمنوں سے حاصل ہونے والے اموال کو انفال کا نام دیا گیا اور پھر مسلمانوں کے لئے غنیمت قرار دے دیا گیا۔

پھر سورۂ انفال کی آیت نمبر ۴۱ میں تمام فوائد سے خدا و رسول اور ذوی القربیٰ سب کے لئے خمس کا قانون وضع کیا گیا جب کہ دور قدیم میں صرف رؤساء کا حصہ ¼ ہوتا تھا اور اس میں

دوسرے افراد کا کوئی حق نہیں تھا اور خمس کے مورد کو بھی تمام منافع اور فوائد تک عام کر دیا گیا اور کسی ایک مورد کے ساتھ مخصوص نہیں رکھا گیا۔

۔ خمس کے موارد کے عام ہونے کے دلائل میں یہ اجماع مسلمین بھی شامل ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے معدن اور خزانہ سے ملنے والے ان منافع میں سے بھی خمس وصول کیا ہے جن کا کوئی تعلق جنگ یا میدانِ جنگ سے نہیں تھا۔ (مسند احمد ۳/۳۳۵، ۳۳۶، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۶، مجمع الزوائد ۳/۷۸، سنن ترمذی ۱/۲۱۹، اموال ابوعبید ص ۳۳۷، کتاب الخراج ص ۲۵-۲۷)

اس سلسلہ میں سنت پیغمبرؐ سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضور نے عبدالقیس کے وفد کو حکم دیا کہ فوائد کا خمس ادا کریں۔ اور یہ بات اس وقت فرمائی جب ان لوگوں نے مطالبہ کیا کہ آپ ہمیں احکامِ اسلام سے باخبر کریں تاکہ ہم واپس جا کر انھیں احکام کی تعلیم دیں کہ وہ لوگ قبیلۂ مضر کے خوف سے محترم مہینوں کے علاوہ کسی زمانہ میں قبیلہ سے باہر نہیں نکل سکتے ہیں۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ ایسے خوفزدہ قبیلہ کے پاس مال غنیمت جنگ کا کوئی امکان نہیں ہے لہٰذا غنیمت سے مراد مطلق قسم کے فوائد ہوں گے اور ان میں میدانِ جنگ سے حاصل ہونے کی کوئی شرط نہ ہوگی۔

یہی حال سرکارؐ کے ان رسائل کا ہے جنھیں مختلف مسلمان عرب قبائل کی طرف ارسال فرمایا تھا یا والیوں سے عہد لیا تھا حالانکہ ان کے یہاں غنیمت جنگ کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مثال کے طور پر آپ نے یمن والوں کے اسلام لانے کے بعد ان کی طرف جانے والے حکام کو ہدایت دی کہ والی کو چاہئے کہ وہ اللہ کا خمس اور مومنین پر واجب صدقہ وصول کرے۔ (فتوح البلدان ۱/۸۲، سیرۃ ابن ہشام ۴/۲۶۵-۲۶۶، طبری ۱/۱۷۲۷-۱۷۲۹، تاریخ ابن کثیر ۵/۷۶، کتاب الخراج ابو یوسف ص ۸۵)

یا وہ خط جو آپ نے قبیلۂ سعد کے لئے لکھا تھا کہ "خمس اور صدقہ آپ کے نمائندوں کے حوالہ کر دیں"۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ اس قبیلہ نے کوئی جنگ نہیں کی تھی کہ اس سے جنگ کی غنیمت کا خمس طلب کیا جائے بلکہ اس سے مراد جملہ فوائد تھے جن کا خمس واجب ہوتا ہے۔

یہی مقصد ان تمام خطوط و رسائل کا ہے جو مختلف عرب قبائل کی طرف بھیجے گئے تھے اور ان میں خمس کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

اس سلسلہ میں اس نکتہ کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ اسلام میں جنگوں کا نظام جاہلیت کے نظام سے بالکل مختلف ہے اور دونوں کا انداز بالکل جداگانہ ہے۔ جاہلیت میں ہر قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر حملہ کرنے اور اس کے اموال کو لوٹنے کا حق حاصل تھا بشرطیکہ وہ اس کے حلیفوں میں شامل نہ ہو اور اس کے بعد ہر شخص اپنے مال غنیمت کا خود مالک ہو جاتا تھا اور اس کا فرض تھا کہ رئیس قبیلہ کا ¼ ادا کر دے اور باقی پر خود تصرّف کرے لیکن اسلام کی صورت حال ایسی نہیں ہے کہ پیغمبرؐ قبائل عرب سے ¼ کے بجائے ⅕ کا مطالبہ کر دیں۔ بلکہ یہاں جہاد کا ذمہ دار ہی پیغمبرؐ ہوتا ہے اور اس کے بغیر جہاد کا امکان ہی نہیں ہے۔ حاکم اسلامی جہاد کا فیصلہ کرتا ہے اور مسلمان اس فیصلہ کو نافذ کرتے ہیں اور اس کے بعد جو مال حاصل ہوتا ہے اس میں سے صرف مقتول کا لباس وغیرہ قاتل کا حصہ ہوتا ہے اور باقی حاکم اسلامی کے پاس جمع ہوتا ہے اور وہی خمس نکال کر باقی مال کو مجاہدین میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ورنہ کوئی بھی مسلمان ایک سوئی بھی نکال لے تو اس کا نام خیانت ہے اور اس کا مظلمہ دنیا اور آخرت دونوں میں برداشت کرنا پڑے گا۔

ایسی صورت میں حاکم اسلامی ہی اعلان جنگ کرتا ہے اور وہی مالِ غنیمت جمع کر کے اس کا خمس نکالتا ہے اور باقی کو مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دیتا ہے اور کسی دوسرے شخص کے غنیمتِ جنگ میں خمس نکالنے کا سوال ہی نہیں ہے کہ اسے ہدایت دی جائے اور اس کے نام فرمان جاری کیا جائے۔

ہاں صدقہ کے بارے میں یہ امکان ہے کہ وہ مسلمانوں کے اموال میں واجب ہوتا ہے اور اسے مسلمانوں ہی کو ادا کرنا ہے۔ ایسے حالات میں خمس کی بار بار تاکید اس بات کی دلیل ہے کہ خمس تمام فوائد میں واجب ہوتا ہے اور صرف غنیمتِ جنگ سے متعلق نہیں ہے جس کا شاہد یہ ہے کہ حضورؐ تمام مسلمانوں سے صدقہ کے علاوہ دیگر موارد کے خمس کا مطالبہ کیا کرتے تھے اور آپ کے دور میں غنیمت کا مفہوم عام فائدہ تھا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں میں فتوحات کا

دائرہ وسیع ہوا اور خلفاء اسلام نے خمس بند کر دیا تو غنیمت کا مفہوم بھی بدل دیا گیا اور اسے غنیمت جنگ کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا۔

رہ گیا مستحقین خمس کا مسئلہ تو آیت خمس نے صاف فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ اللہ۔ رسول۔ قرابتداران رسولؐ اور ان کے ایتام و مساکین و مسافرین کے لئے ہے اور اس کے چھ حصے کیے جائیں گے۔

جس کے بعد اگر کسی روایت میں پانچ حصوں کا ذکر ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کا حصہ بھی رسول خدا کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ نہ یہ کہ اس کا حصہ ختم کر دیا جائے گا۔

ائمہ اہلبیتؑ نے ہر دور میں اسی امر کی وضاحت کی ہے اور صاف واضح کر دیا ہے کہ اللہ۔ رسولؐ اور اقرباء رسولؐ کا حصہ ان عناوین کے لئے ہے جہاں خدا کا حصہ رسول خدا کے ہاتھ میں رکھا جائے گا اور رسول خدا کا حصہ ان کے بعد امام معصوم کے ہاتھ میں رکھا جائے گا اور اس طرح خمس کے دو حصے ہو جائیں گے۔ ایک حصہ ائمہ اہلبیتؑ کا ہوگا اور دوسرا حصہ اولاد رسولؐ کے ایتام، مسافرین اور مساکین کے لئے ہوگا جو باپ کی طرف اولاد رسولؐ میں شامل ہوں۔

اس کے بعد اگر کچھ بچ جائے گا تو ولی امر کا ہوگا اور کم پڑ جائے گا تو پورا کرنے کی ذمہ داری بھی ولی امر پر ہوگی اور اپنا حق حاصل کرنے کے بعد کوئی شخص مر جائے گا تو اس کی اولاد اس مال کی وارث ہوگی۔

ان اولاد رسولؐ سے مراد عبدالمطلب اور مطلب کی اولاد ذکور ہے جن پر صدقہ حرام کیا گیا ہے اور رسول اکرمؐ نے انھیں عاملین کے حصہ میں سے بھی صدقہ واجب نہیں دیا ہے اور یہی اہلبیتؑ کا کردار رہا ہے۔ (سیرۃ ابن ہشام ۴/۲۷۲-۲۷۵، امتاع ص ۵۰۹)

بنابریں ابن ہشام کا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ حضور اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو یمن کی طرف صدقہ وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ آپ نے خمس وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا جیسا کہ دیگر مورخین نے ذکر کیا ہے اور خود بخاری ۳/۵۰ اور شرح المواہب ابن قیم میں اس امر کی صراحت ہے کہ آپ نے خمس وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ صرف ابن ہشام نے

یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ صدقہ اور اہل نجران کے جزیہ کے لئے بھیجا تھا اور بعد والوں نے اسی کو دُہرانا شروع کر دیا۔

اور یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو خمس وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اگرچہ اُبیّ اور عنبسہ کو بنی قضاعہ کے سعد ہذیم اور جذام کی طرف صدقہ اور خمس دونوں کے لئے بھیجا تھا۔ (طبقات ابن سعد ۱/۲۷۰)

جس طرح کہ دیگر عمال کا کام بھی اصل میں صدقہ وصول کرنا تھا اور ضمناً خمس بھی وصول کر کے رسول اکرمؐ کے حوالہ کر دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب خلفاء اسلام نے خمس کا سلسلہ بند کر دیا تو مورخین اور راویوں نے اس کا ذکر بھی چھوڑ دیا کہ اس کا تذکرہ سیاست وقت کے خلاف تھا اور اہل قلم ایسے امور کے اندراج سے ہمیشہ گریز کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد اگر اس نکتہ کا بھی اضافہ کر لیا جائے کہ شبہ جزیرہ عرب اور جملہ قبائل کی بالعموم آمدنی کا تعلق یا جانوروں کی تربیت سے تھا یا کھیتی باڑی سے اور یہ تمام امور صدقات کے موارد میں شامل ہیں اور ان کا خمس کے موارد سے کوئی تعلق نہیں ہے اور مدینہ منورہ بھی ایک زرعی علاقہ تھا اور وہاں کی عمومی معیشت کا تعلق زراعت اور حیوانات کی تربیت سے تھا۔ تجارت تو صرف اہل مکہ اور بعض اہل کتاب کے قبائل میں تھی اور مدینہ آنے کے بعد اسلام و کفر کی وہ تمام جنگیں جن کی مجموعی تعداد اسّی کے قریب تھی اور جس کا اوسط سالانہ آٹھ جنگوں کا تھا شروع ہو گئیں اور تجارتی راستے بھی خطرناک ہو گئے تو وہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا اور صدقات کے علاوہ کسی حق کا کوئی مورد نہ رہ گیا اور اس طرح مورخین اور اہل قلم خمس کو یکسر فراموش کر بیٹھے اور اس کا تذکرہ ہی ختم ہو گیا۔

رسولِ اکرمؐ کے بعد صدقہ؟

اہلبیتؑ پیغمبرؐ نے رسول اکرمؐ کے اتباع میں ذوی القربیٰ کے لئے صدقہ حرام رکھا جیسا کہ اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ راوی نے امام صادقؑ سے دریافت کیا کہ جب آپ حضرات خمس سے محروم کر دئے گئے ہیں تو کیا آپ کے لئے صدقہ حلال ہو گیا ہے؟ تو آپ نے

فرمایا "لا واللہ جس چیز کو خدا نے حرام کر دیا ہے وہ غاصبوں کے غصب حقوق سے حلال نہیں ہو سکتی ہے اور ان کا حلال کو حرام قرار دے دینا، حرام کو حلال نہیں بنا سکتا ہے"۔

ترکہ رسولِ اکرمؐ

مورخین کے بیان کی بنا پر ترکہ رسولؐ میں حسب ذیل اشیاء شامل تھیں:

۱۔ ساتوں باغات جن کی وصیت مخیرق یہودی نے کی تھی۔

۲۔ اموال بنی نضیر کی زمین۔

۳۔۴۔۵۔ خیبر کے تینوں قلعے۔

۶۔ وادی القریٰ کی زمین کا ۱/۳

۷۔ مہزور (مدینہ کے بازار کا علاقہ)

۸۔ فدک۔

رسول اکرمؐ نے ساتوں باغات میں سے چھ کو وقف کر دیا تھا تو وہ صدقہ رسولؐ ہو گئے تھے اور بنی نضیر کی زمینوں میں سے ایک حصہ ابوبکر، عبدالرحمٰن بن عوف اور ابودجانہ کے نام ہبہ کر دیا تھا۔ خیبر کے قلعوں میں سے ایک حصہ ازواج کو دے دیا تھا اور فدک جناب فاطمہؑ کو ہبہ کر دیا تھا اور حمزہ بن نعمان عذری کو وادی القریٰ کا ایک حصہ دے دیا تھا۔

انجام ترکہ رسولؐ اور شکایت حضرت فاطمہؑ

رسول اکرمؐ کے فوراً بعد دونوں خلیفہ ابوبکر و عمر نے تمام ترکہ رسولؐ پر قبضہ حاصل کر لیا لیکن کسی بھی جائداد کو سرکاری ملکیت میں نہیں لیا اور جس کو جو زمین حضورؐ نے دے دی تھی سب اسی کے پاس رہی۔ صرف ایک فدک کا علاقہ تھا جسے جناب فاطمہؑ کے قبضہ سے نکال لیا گیا اور اس کے نتیجہ میں جناب فاطمہؑ اور ابوبکر میں اس بحث کا آغاز ہو گیا جس کا تذکرہ حضرت عمر کی زبانی اس طرح کیا گیا ہے کہ:

"ہم اور ابوبکر علیؑ کے پاس گئے اور کہا کہ ترکہ رسولؐ کے بارے میں آپ کا کیا

خیال ہے ؟

انھوں نے کہا کہ ہم اس کے سب سے زیادہ حقدار ہیں ۔

ہم نے کہا کہ اور خیبر؟

کہا۔ اس کے بھی۔

ہم نے کہا اور فدک ؟

کہا۔ اس کے بھی۔

ہم نے کہا کہ تم ہماری گردن بھی ریتی سے ریت ڈالو تو تھیں یہ مال نہیں مل سکتا ہے۔ (مجمع الزوائد ۹/ ۳۹ باب "ماترکہ الرسول"، الاوسط طبرانی)

جناب فاطمہؑ اور ابوبکر کا اختلاف تین مسائل میں تھا :

(۱) عطیہ رسول کا مطالبہ (۲) میراث رسول کا مسئلہ (۳) سہم ذوی القربیٰ کا تقاضا۔

۱۔ عطیہ رسولؐ کا مطالبہ

فتوح البلدان ۱/ ۳۴۔۳۵ کا بیان ہے کہ فاطمہؑ نے ابوبکر صدیق سے کہا کہ فدک ہمارے حوالہ کردو جو رسول اکرمؐ نے مجھے عطا کیا ہے۔

انھوں نے بیّنہ اور گواہ کا تقاضا کر دیا۔

جناب فاطمہؑ نے ام ایمن اور رباح (غلام رسولؐ) کو گواہی میں پیش کیا۔

ابوبکر نے کہا کہ اس مسئلہ میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں درکار ہیں۔

دوسری روایت اس طرح ہے کہ پہلے حضرت علیؑ نے گواہی دی۔ اس کے بعد ان کے ساتھ ام ایمن نے گواہی دی اور دونوں کو ملا کر صرف ایک مرد اور ایک ہی عورت نے گواہی دی۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ اس وقت پیدا ہوا ہے جب ابوبکر نے تمام جاگیر فدک پر قبضہ کر لیا۔ جس کے بعد جناب فاطمہؑ نے اپنے دعویٰ کا دوسرا رُخ پیش کیا کہ حکومت نے گواہی کے نصاب کو نامکمل قرار دے دیا ہے۔

۲۔ میراثِ رسولؐ کا جھگڑا

۱۔ مسند احمد ۱/۴ حدیث ۱۴، سنن ابی داؤد ۳/ ۵۰ کتاب الخراج، تاریخ ابن کثیر ۵/۲۸۹، شرح النہج ۴/ ۸۱ نقل از ابو بکر جوہری، تاریخ ذہبی ۱/ ۳۴۶ میں اس داستان کی تفصیل بروایت مسند ابو الطفیل کی زبانی یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کے انتقال کے بعد جناب فاطمہؑ نے ابو بکر کے پاس کہلوایا کہ رسول اکرمؐ کے وارث تم ہو یا ان کے اہل ؟

ابو بکر نے کہا کہ بیشک ان کے اہلبیت۔

کہا پھر رسول اکرمؐ کا حصہ کہاں ہے ؟

ابو بکر نے کہا کہ میں نے رسول اکرمؐ کی زبانی سُنا ہے کہ پروردگار جب کسی نبی کو کوئی غذا عنایت کرتا ہے اور نبی کو اٹھا لیتا ہے تو اس کا حقدار اس کا جانشین ہوتا ہے اور اب میری رائے یہ ہے کہ اسے مسلمانوں کے حوالہ کر دیا جائے۔

تو آپؑ نے فرمایا کہ اس روایت کو آپ بہتر جانتے ہیں۔

۲۔ سنن ترمذی ۷/ ۱۱۱ ابواب السیر میں ابو ہریرہ کا بیان اس طرح ہے کہ جناب فاطمہؑ ابو بکر و عمر کے پاس خود میراثِ رسولؐ کا سوال لے کر آئیں تو ان دونوں نے کہا کہ ہم نے رسول اکرمؐ سے خود سُنا ہے کہ " ہمارے یہاں میراث نہیں ہوتی ہے"۔

تو آپؑ نے کہا کہ میں تم دونوں سے بات بھی نہ کروں گی اور اس طرح مرتے دم تک بات نہیں کی۔

ابو ہریرہ ہی کی دوسری روایت مسند احمد ۱/ ۱۰ حدیث ۶۰، سنن ترمذی ۷/ ۱۰۹، طبقات ابن سعد ۵/ ۲/ ۳۷، ابن کثیر ص ۲۸۹ میں بالالفاظ مسند احمد اس طرح ہے کہ جناب فاطمہؑ نے ابو بکر سے کہا کہ تمھارے مرنے کے بعد تمھارا وارث کون ہوگا ؟

کہا۔ میری اولاد اور میرے اہل۔

فرمایا کہ پھر ہم رسولؐ کے وارث کیوں نہیں ہیں ؟

کہا کہ میں نے حضرت کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ نبی کسی کو وارث نہیں بناتا ہے۔

البتہ میں ان تمام لوگوں پر خرچ کرتا رہوں گا جن پر حضورؐ خرچ کرتے تھے اور جن کی آپ کفالت کرتے تھے۔

طبقات ابن سعد میں عمر کی روایت یہ ہے کہ جس دن رسول اکرمؐ کا انتقال ہوا۔ اسی دن ابوبکر کی بیعت ہوگئی اور دوسرے دن فاطمہؑ علیؑ کو لے کر ابوبکر کے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ میری میراث رسولؐ کہاں ہے؟

ابوبکر نے کہا کہ کون سی میراث؟ گھر کا سامان یا حکومتی اموال؟

فاطمہؑ نے کہا کہ فدک، خیبر، صدقات مدینہ۔ ان سب کی میں اسی طرح وارث ہوں جس طرح تمہاری بیٹیاں تمہاری وارث ہیں۔

ابوبکر نے کہا کہ واللہ تمہارے باپ میرے باپ سے بہتر ہیں اور تم میری بیٹیوں سے بہتر ہو لیکن رسول اکرمؐ نے فرما دیا ہے کہ ہم کسی کو وارث نہیں بناتے ہیں۔ اور جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ (طبقات ابن سعد ۲/۳۱۶)

واضح رہے کہ حضرت عمر نے واقعہ کا جو زمانہ بیان کیا ہے وہ تاریخ کے جملہ واقعات سے الگ ہے ورنہ سقیفہ کی کارروائی کے ساتھ روز وفات بیعت کے کوئی معنی نہیں ہیں اور حقیقت امر وہی ہے جو ابن ابی الحدید نے بیان کی ہے کہ" فدک کا واقعہ اور فاطمہؑ کا ابوبکر کے سامنے دعویٰ پیش کرنا وفاتِ پیغمبرؐ سے دس دن بعد کا واقعہ ہے۔

(شرح نہج البلاغہ ۴/۹۷)

بہرحال واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوبکر نے اپنی بیان کردہ حدیث کی بنا پر جناب فاطمہؑ کو میراث سے محروم کر دیا جیسا کہ حضرت عائشہ کا ارشاد ہے کہ جب میراثِ پیغمبرؐ کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا تو کسی کے پاس کوئی علم نہیں تھا صرف ابوبکر نے بیان کیا تھا کہ" ہم گروہ انبیاء کسی کو وارث نہیں بناتے ہیں اور ہمارا کل ترکہ صدقہ ہوتا ہے"۔

(کنز العمال ۱۴/۱۳۰۔ الفضائل)

یہی بات ابن ابی الحدید نے بیان کی ہے کہ" علماء کے درمیان مشہور یہی ہے کہ اس روایت کے راوی صرف ابوبکر ہیں"۔ (شرح النہج ۴/۸۲)

دوسرے مقام پر ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اکثر روایات کی بنا پر اس روایت کے راوی صرف ابو بکر ہیں اور یہی بات عظیم محدثین نے بھی لکھی ہے بلکہ اسی بنیاد پر اصول فقہ کا یہ مسئلہ تیار ہوا ہے کہ ایک صحابی کی روایت پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے اور ہمارے استاد ابو علی کا ارشاد ہے کہ روایت میں صرف دو افراد کی روایت ہی قابل قبول ہوتی ہے جس طرح کہ شہادت میں دو افراد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس مسئلہ میں تمام متکلمین اور فقہاء نے ان سے اختلاف کیا ہے اور اس بات سے استدلال کیا ہے کہ صحابہ نے میراث کے سلسلہ میں صرف ابو بکر کی روایت کو بھی قبول کیا ہے۔ شرح نہج البلاغہ ۴/ ۸۵)

سیوطی نے حضرت ابو بکر کی روایات کے ذیل میں درج کیا ہے کہ "حدیث ۲۹ حدیث وراثت ہے"۔ (تاریخ الخلفاء ص ۸۹)

مولف : ان تمام باتوں کے باوجود بعد میں ایسی احادیث وضع کر لی گئیں جن سے اس امر کا اظہار کیا جائے کہ یہ تنہا ایک شخص کی روایت نہیں ہے بلکہ اس کے راوی دوسرے افراد بھی ہیں۔

مترجم : علم اصول فقہ میں جن حضرات نے ایک شخص کی روایت کو تسلیم نہیں کیا ہے انھوں نے بھی اطمینان بخش قرائن کے بعد تسلیم کر لیا ہے اور شائد فقہاء اسلام نے اس روایت کو اسی لئے قبول کر لیا ہے کہ اس کے ساتھ دولت، حکومت، تقسیم اموال۔ درہ حضرت عمر جیسے بیشمار قرائن موجود تھے جن سے بآسانی قبول کیا جا سکتا تھا۔؟

۳۔ سہم ذوی القربیٰ کے مسئلہ میں مقابلہ

جب صاحبان اقتدار نے حدیث ابی بکر کی بنا پر بنت رسولؐ کو باپ کے ترکہ سے محروم کر دیا تو آپ نے ذوی القربیٰ کے حصہ کا مطالبہ کیا جیسا کہ ابو بکر جوہری نے تین روایات میں درج کیا ہے :

۱۔ انس بن مالک کا بیان ہے کہ فاطمہؑ ابو بکر کے پاس آئیں اور کہا کہ تمھارے علم میں یہ بات ہے کہ ہم اہلبیتؑ پر ظلم ہوا ہے اور ہمیں صدقات (حوائط سبعہ) اور سہم

ذوی القربیٰ سے محروم کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد آیت خمس کی تلاوت کی۔

جس کے جواب میں ابو بکر نے کہا کہ میرے باپ آپ پر اور آپ کے بچوں کے بابا پر قربان ہو جائیں۔ میں کتاب خدا، حق رسولؐ اور حق ذوی القربیٰ کو تسلیم کرتا ہوں۔ اور کتاب خدا میں میں نے یہ آیت پڑھی ہے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ حق آپ لوگوں کا ہے۔

فرمایا۔ پھر کیا تمھارا اور تمھارے قرابتداروں کا ہے؟

ابو بکر نے کہا کہ میں آپ حضرات کو بقدر مصارف دوں گا اور باقی مصالح مسلمین پر خرچ کروں گا۔

فرمایا۔ مگر یہ تو حکم خدا نہیں ہے۔

(تاریخ الاسلام ذہبی ۱/ ۳۴۷)

ب۔ عروہ کا بیان ہے کہ فاطمہؑ نے ابو بکر سے فدک اور سہم ذوی القربیٰ کا مطالبہ کیا لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور اسے مالِ خدا قرار دے دیا۔

ج۔ حسن بن محمد بن علیؑ بن ابی طالب کا بیان ہے کہ ابو بکر نے جناب فاطمہؑ اور بنی ہاشم کو سہم ذوی القربیٰ سے محروم کر دیا اور اسے فی سبیل اللہ بنا کر اسلحوں اور فوجوں پر صرف کر دیا۔ (شرح نہج البلاغہ ۴/ ۸۱)

۔ کنز العمال میں ام ہانی کی روایت ہے کہ جناب فاطمہؑ ابو بکر کے پاس سہم ذوی القربیٰ کے مطالبہ کے لئے آئیں تو انھوں نے کہہ دیا کہ میں نے رسول اکرمؐ سے سنا ہے کہ ذوی القربیٰ کا حصّہ صرف میری زندگی تک ہے۔ میرے مرنے کے بعد ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

(کنز العمال ۵/ ۳۶۷)

''کیا رحمۃ للعالمین پیغمبرؐ ہے جو اپنی اولاد کو اپنے بعد بے سہارا چھوڑنے ہی کو امت پر مہربانی قرار دیتا ہے؟'' انا اللہ۔۔۔ (جوادی)

۔ ام ہانی کی دوسری روایت میں ہے کہ جناب فاطمہؑ نے میراث اور سہم ذوی القربیٰ دونوں کے بارے میں ابو بکر سے بحث کی۔

۔ فتوح البلدان، طبقات ابن سعد، تاریخ الاسلام ذہبی اور شرح نہج البلاغہ میں یہ روایت

بھی ہے جس کے الفاظ فتوح البلدان میں یہ ہیں کہ ام ہانی فرماتی ہیں کہ فاطمہؑ بنت رسولؐ نے ابو بکر سے سوال کیا کہ تمھارے مرنے کے بعد تمھارا وارث کون ہوگا؟

کہا میرے اہل وعیال۔

فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ تم نے رسول اکرمؐ کا وارث ہمارے علاوہ دوسروں کو بنادیا ہے؟

ابو بکر نے کہا کہ بنت رسولؐ تمھارے باپ کی میراث سونا چاندی نہیں ہے۔

فرمایا کہ پھر خیبر اور فدک کے حصہ کا کیا ہوگا؟ اور اس حصہ کا کیا ہوگا جو خدا نے ہمارے لئے قرار دیا ہے اور صرف ہمارا ہے اور تمھارے قبضہ میں ہے؟

۔ ابن سعد کے الفاظ ہیں۔ آپ کے باپ کی میراث زمین، سونا، چاندی، غلام اور مال نہیں ہے۔

ابو بکر نے کہا کہ بنتِ رسولؐ! میں نے رسول اکرمؐ سے سُنا ہے کہ یہ صرف میری زندگی میں کھانے پینے کا سہارا ہے۔ اس کے بعد تمام مسلمانوں کا ہوگا۔ (طبقات ابن سعد ۲/۲۱۵، کنز العمال ۵/۳۶۵)

۔ ابن ابی الحدید اور ذہبی کے الفاظ ہیں ۔ ابو بکر نے کہا کہ دخترِ رسولؐ یہ تم نے کیا کیا؟

تو فاطمہؑ نے کہا کہ تم نے قصداً فدک پر قبضہ کر لیا ہے جو خاص رسول اکرمؐ کا مال تھا اور پھر ہمارے اس حق کا رُخ کیا جو خدا نے آسمان سے نازل کیا تھا اور اسے بھی ختم کر دیا۔

ابو بکر نے کہا کہ "دخترِ پیغمبرؐ! یہ میں نے نہیں کیا ہے بلکہ رسول اکرمؐ نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ خدا نبیؐ کے کھانے کا سامان فراہم کرتا ہے اور اس کے بعد جب اسے اٹھالیتا ہے تو اس حق کو بھی اُٹھالیتا ہے"۔

جناب فاطمہؑ نے کہا کہ "اسے تم اور تمھارا رسول ہی بہتر جانتا ہے اور میں آئندہ تم سے کوئی سوال نہیں کروں گی"۔ اور یہ کہہ کر چلی گئیں۔

اس روایت میں سہمِ خدا سے مراد خمس کا حصہ ہے اور صافیہ سے مراد خالص پیغمبرؐ کا حصّہ ہے اور آسمان سے نازل ہونے والے حق سے مراد قرابتداروں کا سہم ہے ۔ اور میراث کا قانون ہے جو تمام مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر بیان ہوا ہے اور اس میں

کسی طرح کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

بعض راویوں نے یہانتک بیان کیا ہے کہ اس میراث کے مطالبہ میں جناب فاطمہ ؑ کے ساتھ عباس بھی شریک تھے جیسا کہ ابن سعد نے طبقات ۲/۳۱۵ اور ملا متقی نے کنز العمال ۵/۳۶۵ کتاب الخلافۃ مع الامارۃ میں درج کیا ہے اور اس کا قصہ ابن سعد کے الفاظ میں یوں ہے کہ فاطمہ ؑ ابو بکر کے پاس اپنی میراث کا مطالبہ کرنے آئیں۔ اور عباس بھی اپنی میراث کا مطالبہ کرنے آئے اور ان کے ہمراہ علی ؑ بھی تھے۔ تو ابو بکر نے کہا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ "ہم کسی کو وراثت نہیں دیتے ہیں۔ ہمارا ترکہ صدقہ ہوتا ہے" البتہ جن کی کفالت پیغمبر ؐ کیا کرتے تھے ان کی کفالت میرے ذمہ رہے گی۔

جس پر علی ؑ نے کہا کہ آیت کریمہ "ورث سلیمان داؤد"۔ "یرثنی ویرث من آل یعقوب" کا کیا ہوگا؟

تو ابو بکر نے جواب دیا کہ بات ایسی ہی ہے اور آپ وہ سب جانتے ہیں جو میں جانتا ہوں۔

تو علی ؑ نے کہا کہ میں کتاب خدا کا حوالہ دے رہا ہوں اور وہ بول رہی ہے۔ تو سب خاموش ہو گئے اور چلے آئے۔

نوٹ: اس روایت میں ایک اشتباہ پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت علی ؑ عباس کے ہمراہ میراث کا تقاضا کرنے نہیں آئے تھے بلکہ جناب فاطمہ ؑ کی امداد کرنے آئے تھے اس لئے کہ بیٹی کے ہوتے ہوئے بھائی وارث نہیں ہوتا ہے۔

بہت ممکن ہے کہ عباس خمس کا مطالبہ کرنے آئے ہوں اور راویوں کو حالات کے پیش نظر یہ شبہ ہو گیا ہو کہ میراث کا تقاضا کرنے آئے ہیں۔

جب جناب فاطمہ ؑ تمام دلائل اور شہود پیش کر چکیں اور ابو بکر نے سب کو ماننے سے انکار کر دیا اور آپ کو کچھ بھی نہ دیا تو آپ نے چاہا کہ اب مسلمانوں کے سامنے فریاد کی جائے اور اپنے بابا کے انصار سے مدد لی جائے۔ چنانچہ آپ نے مسجد کا رُخ کیا اور ابو بکر جوہری

کی کتاب السقیفہ کے مطابق (جس کی روایت ابن ابی الحدید نے بھی کی ہے اور بلاغات النساء احمد بن ابی طاہر بغدادی نے بھی کی ہے) جب جناب فاطمہؑ کو معلوم ہو گیا کہ ابو بکر کچھ دینے والا نہیں ہے تو آپ نے سر پر چادر ڈالی اور خاندان کی عورتوں کے حلقہ میں پیغمبرِ اسلامؐ کے اندازِ رفتار سے چل کر مسجد میں داخل ہوئیں۔ جہاں ابو بکر مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف فرما تھے اور آپ نے ایک فریاد بلند کی جس کے نتیجہ میں شورِ گریہ بلند ہو گیا اور مجلس کا رنگ بدل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ماحول پُرسکون ہوا تو آپ نے اپنے کلام کا آغاز حمد و ثنائے پروردگار اور رسول اکرمؐ پر صلوات و سلام سے کرتے ہوئے فرمایا۔ ایہا الناس! میں فاطمہؑ ہوں اور پھر سمجھا رہی ہوں کہ "تمھارے پاس ایک رسول آیا تھا جسے تمھاری تکلیفوں سے دُکھ ہوتا تھا اور وہ تمھاری ہدایت کے لئے بیچین تھا اور مومنین کے حال پر مہربان تھا" تو اگر تم اس کے رشتوں کو دیکھو گے تو تمھیں معلوم ہو گا کہ وہ میرا باپ تھا تمھاری عورتوں کا باپ نہیں تھا اور میرے ابن عم کا بھائی تھا تمھارے مَردوں میں کسی کا بھائی نہیں تھا۔"

یہ کہہ کر آپ نے خطبہ کے سلسلہ کو شروع کیا اور آخر میں فرمایا کہ "تم لوگوں کا خیال ہے کہ میرے لئے کوئی میراث نہیں ہے تو کیا تم دوبارہ جاہلیت کا فیصلہ کرنا چاہتے ہو۔ یقین والوں کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

اے ابو قحافہ کے فرزند! تم اپنے باپ کے وارث ہو سکتے ہو اور میں اپنے باپ کی وارث نہیں ہو سکتی۔۔؟ یہ تم نے افترا کیا ہے۔ تو آج تمھارے سامنے ایک ستم رسیدہ ہے جو عنقریب دنیا سے چلی جائے گی اور تم سے روزِ قیامت ملاقات کرے گی جب بہترین حاکم اللہ ہو گا اور ذمہ دار پیغمبرؐ ہوں گے اور موعد قیامت کا ہو گا جہاں اہلِ باطل بہرحال خسارہ میں رہیں گے۔

یہ کہہ کر باپ کی قبر کا رُخ کیا اور چند اشعار پڑھے جن میں اپنے دردِ دل اور مصائبِ دہر کا تذکرہ فرمایا۔

راوی کہتا ہے کہ اس دن سے زیادہ گریہ و نالہ و شیون کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

اس کے بعد آپ نے انصار کا رُخ کیا اور فرمایا اے پیغمبرؐ کے باقیماندہ انصار؟ اے ملّت کے ارکان اور اسلام کے محافظو! یہ میری نصرت میں سُستی اور میری مدد میں کوتاہی کیسی ہے؟ میرے حق سے آنکھ کیوں بند ہو گئی ہے اور میری فریاد کے بارے میں سو کیوں گئے ہو؟ کیا رسول اکرمؐ نے نہیں فرمایا کہ انسان کا تحفظ اس کی اولاد کے ذریعہ ہوتا ہے۔

کتنی جلدی تم نے بدعتیں ایجاد کر دیں اور یہ حرکات کر بیٹھے۔ ابھی رسول اکرمؐ کا انتقال ہوا ہے اور تم نے دین کو مُردہ بنا لیا۔ میری جان کی قسم، ان کی موت واقعاً بڑا عظیم حادثہ ہے جس کا زخم کاری ہے اور اس کا مداوا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ زمین تاریک ہو گئی۔ پہاڑ ٹکڑے ہو گئے۔ امیدیں ناکام ہو گئیں۔ حرمتیں ضائع ہو گئیں۔ حفاظتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اسی دن کے لئے کتابِ خدا نے اعلان کیا تھا کہ "محمد اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔ دیکھو اگر وہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو خدا کا کوئی نقصان نہیں ہوگا اور وہ شکر گذار بندوں کو بہر حال اجر عطا کرے گا۔"

ہاں اے اولاد قیلہ! بڑے افسوس کی بات ہے کہ میرے باپ کی میراث ہضم کی جا رہی ہے اور تم دیکھ بھی رہے ہو اور سُن بھی رہے ہو۔ تم تک میری دعوت پہنچ رہی ہے اور میری آواز سُن رہے ہو۔ تمھارے پاس سامان بھی ہے اور افراد بھی ہیں اور اسبابِ دفاع بھی ہیں اور تم اللہ کے وہ منتخب بندے ہو جن کا اس نے انتخاب کیا ہے اور پسند کیا ہے۔ تم نے جملہ امور کا سامان کیا ہے اور بہادروں سے مقابلہ کیا ہے یہاں تک کہ اسلام کی چکّی چلنے لگی اور اس کا دودھ نکلنے لگا۔ جنگ کی آگ بجھ گئی اور شرک کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہرج و مرج کی آواز دب گئی اور دین کا نظام مستحکم ہو گیا۔ کیا ان تمام اقدامات کے بعد اب تم پیچھے ہٹ رہے ہو؟ اور طاقت کے بعد منھ پھیر رہے ہو اور شجاعت کے بعد بزدلی کا اظہار کر رہے ہو۔ اس قوم کے مقابلہ میں جس نے عہد کے بعد عہد شکنی کی اور تمھارے دین میں رخنہ پیدا کیا۔ حکم پروردگار ہے "سردارانِ کفر سے جہاد کرو کہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور شاید اس طرح شرارت سے باز آجائیں۔"

میں دیکھ رہی ہوں کہ تم پستی کی طرف مائل ہو گئے ہو اور آرام طلب ہو گئے ہو تم نے

حقیقت کو پہچان کر اس کا انکار کیا ہے اور لقمہ کو کھا کر اُگل دیا ہے۔ خیر اگر تم اور تمام اہلِ زمین سب مل کر بھی کفر اختیار کر لیں تو پروردگار سب سے بے نیاز بھی ہے اور قابلِ حمد بھی ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ مجھے جو کچھ کہنا تھا میں کہہ چکی جب کہ مجھے تمھاری کمزوری، ناطاقتی، بے یقینی سب کا علم ہے۔ خیر جاؤ اب خلافت تمھارے سامنے ہے لیکن یہ یاد رکھنا کہ یہ سواری راس نہ آئے گی اور اس کا عار باقی رہ جائے گا جس کا سلسلہ نارِ جہنم سے مل جائے گا جو خدا کی بھڑکائی ہوئی ہے اور دلوں پر بھڑکنے والی ہے۔ خدا تمھارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے اور عنقریب ظالموں کو ان کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

ابن ابی الحدید ـــ فدک کا یہ قصہ اور جناب فاطمہؑ کا ابو بکر کے پاس جانا رسول اکرمؐ کے انتقال کے دس روز بعد کا واقعہ ہے اور حقیقت امر یہ ہے کہ ان کے دربار سے واپس آنے کے بعد کسی مرد یا عورت نے میراث کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ (شرح النہج ۴/۹۷)

فدک، ترکہ رسولؐ اور خمس کے سلسلہ میں خلفاءِ اسلام کا طرزِ عمل

دورِ ابو بکر و عمر

ابو یوسف کی کتاب الخراج، سنن نسائی، کتاب الاموال ابو عبید، سنن بیہقی، تفسیر طبری، احکام القرآن جصاص کی روایت کی بنا پر (ابو یوسف کے الفاظ میں) حسن بن محمد بن الحنفیہ کا بیان ہے کہ لوگوں نے رسول اکرمؐ کے سہم رسولؐ اور سہم ذوی القربیٰ کے بارے میں اختلاف کیا۔ ایک قوم نے کہا کہ سہم رسولؐ آپ کے بعد خلیفہ کا حق ہے اور دوسری جماعت نے کہا کہ سہم ذوی القربیٰ قرابتدارانِ پیغمبرؐ کے لئے ہے۔ ایک جماعت کا خیال تھا کہ ذوی القربیٰ کا حصہ خلیفہ کے قرابتداروں کے لئے ہے اور آخر میں اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ سب کا مصرف جہاد کی تیاری اور آبادکاری ہے۔

سنن نسائی اور الاموال ابو عبید کی بنا پر دورِ اول و ثانی میں یہی ہوتا رہا۔ (کتاب الخراج ص ۲۴-۲۵، سنن نسائی ۲/۱۷۹، کتاب الاموال ص ۳۳۲، تفسیر طبری ۱۰/۶، احکام القرآن ۳/۶۲، سنن بیہقی ۶/۳۴۲-۳۴۳)

ابن عباس کی روایت ہے کہ سہم خدا، سہم رسولؐ کو ایک بنا دیا گیا اور سہم ذوی القربیٰ کے ساتھ سب کو لشکر اور اسلحہ میں صرف کر دیا گیا اور ایتام و مساکین و ابنا ءسبیل کا حصہ صرف انھیں دیا جانے لگا۔ (تفسیر طبری ۱۰/۶)

دوسری روایت ہے کہ رسول اکرمؐ کے بعد ابو بکر نے قرابتداروں کا حق مسلمانوں کو دے دیا اور راہ خدا میں خرچ ہونے لگا۔ (تفسیر طبری ۱۰/۶، احکام القرآن ۳/۶۰ باب قسمۃ الخمس)

قتادہ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ یہ ایک آذوقہ تھا جسے رسول اکرمؐ کے بعد ابو بکر و عمر نے راہ خدا میں خرچ کرنا شروع کر دیا۔ (تفسیر طبری ۱۰/۶)

شائد جبیر بن مطعم کا مقصد بھی یہی تھا جب انھوں نے بیان دیا تھا کہ ابو بکر نے اقربا پیغمبرؐ کو وہ حق نہیں دیا جو رسول اکرمؐ انھیں دیا کرتے تھے۔ (سنن ابی داؤد باب بیان مواضع الخمس، سنن بیہقی جلد ۶ باب سہم ذوالقربیٰ، مسند احمد ۴/۸۳، مجمع الزوائد ۵/۳۴۱)

مذکورہ بالا روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ لشکر سازی میں خمس کا مصرف ابتدائے امر میں ابو بکر کے زمانہ میں ہوا ہے جب کہ حکومت وقت کو لشکر سازی کی ضرورت تھی اور ایک طرف مالک بن نویرہ وغیرہ نے خلافت کا انکار کر کے زکوٰۃ دینے سے منع کر دیا تھا اور دوسری طرف کندہ کے بعض قبائل صدقات کی مقدار پر اختلاف کر رہے تھے جنھیں مرتد کا نام دے دیا گیا تھا۔ ورنہ اس کے بعد حکومت کا رُخ فتوحات کی طرف ہو گیا اور ثروت اسلامی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تو خمس تمام مسلمانوں پر بلا تفریق بنی ہاشم و غیر بنی ہاشم صرف ہونے لگا اور رسول اکرمؐ کے ترکہ کے ایک حصہ کا متولی بنی ہاشم کو بنا دیا گیا جیسا کہ جابر کی روایت میں ہے کہ خمس فی سبیل اللہ خرچ ہو رہا تھا لیکن مال میں اضافہ ہو گیا تو اس کا مصرف بدل گیا۔ (الخراج لابی یوسف ص ۲۳، احکام القرآن ۳/۶۱)

اکثر روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام عمر کے زمانہ میں ہوا ہے اور انھوں نے یہ چاہا تھا کہ بنی ہاشم کو بھی تھوڑا سا خمس دیدیا جائے جس سے کہ ان لوگوں نے انکار کر دیا جیسا کہ ابن عباس نے نجدہ حروری کے جواب میں بیان کیا تھا جب اس نے سہم ذوی القربیٰ

کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا قول یہ تھا کہ ذوی القربیٰ ہم ہیں لیکن قوم نے ماننے سے انکار کر دیا اور سارے قریش کو قرابتدار بنا دیا۔ (صحیح مسلم ۴/۱۹۸ باب النساء الغازیات، مسند احمد ۱/۲۴۸، ۲۹۴، ۳۰۴، ۳۰۸، سنن دارمی ۲/۲۲۵، مشکل الآثار طحاوی ۲/۱۳۶، ۱۷۹، مسند شافعی ص ۱۸۳، حلیۃ ابونعیم ۳/۲۰۵)

دوسری روایت میں ہے کہ ابن عباس نے کہا کہ ذوی القربیٰ کا حصہ رسول اکرمؐ کے قرابتداروں کا تھا اور آپ انھیں میں تقسیم کرتے تھے۔ اس کے بعد عمر نے اس کا ایک حصہ ہم کو دینا چاہا تو ہم نے اپنے حق سے کم دیکھ کر انکار کر دیا۔ (مسند احمد ۱/۲۲۴، ۳۲۰، سنن ابی داؤد ۲/۵۱ کتاب الخراج، سنن نسائی ۲/۱۷۷، سنن بیہقی ۶/۳۴۴، ۳۴۵)

دوسری روایت کی بنا پر ابن عباس نے کہا کہ یہ ہم اہلبیتؑ کا حق تھا لیکن عمر نے ہم سے کہا کہ ہم اس سے تمہارے کنواروں کی شادی کرا دیں گے، ناداروں کو سامان فراہم کر دیں گے اور مقروضوں کا قرض ادا کر دیں گے مگر رہے گا ہمارے ہاتھ میں ـــــ تو ہم نے انکار کر دیا کہ اسے ہمارے ہاتھ میں رہنا چاہیئے اور انھوں نے قبول نہیں کیا تو ہم نے صبر کر لیا اور اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ (الخراج ابو یوسف ص ۲۳، ۲۴، مغازی واقدی ص ۶۹۷، الاموال ص ۳۳۳، سنن نسائی ۲/۱۷۸، احکام القرآن ۳/۶۳، لسان المیزان ۶/۴۸۱ حالات بجدہ)

ایسی ہی ایک روایت سنن بیہقی میں عبدالرحمٰن بن ابی یعلیٰ کے حوالہ سے امام علیؑ سے نقل کی گئی ہے کہ میں نے آپ سے ملاقات کر کے دریافت کیا کہ ابو بکر و عمر نے آپ حضرات کے حق خمس کا کیا کیا؟ تو فرمایا کہ عمر نے ہم سے کہا کہ آپ کا حق ہے لیکن اگر زیادہ ہو گیا تو ہم سب آپ کو نہیں دے سکتے ہیں۔ اگر چاہیں تو اپنی رائے کے مطابق بقدر ضرورت دیدیں تو میں نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور کہہ دیا کہ یہ سارا مال ہمارا ہے لہٰذا ہمیں ملنا چاہیئے۔ (سنن بیہقی ۶/۳۴۴ سہم ذوی القربیٰ، مسند شافعی ص ۱۸۷ باب قسم الفیٔ)

غالباً سابقہ روایت جس میں عمر کے عباس اور امام علیؑ کے ہاتھوں میں بعض متروکات پیغمبرؐ کے بطور متولی صدقات رہنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق اسی دور خلافتِ عمر سے ہے۔ (صحیح بخاری ۲/۱۲۵، ۲/۳۸ کتاب المغازی باب غزوۂ خیبر، سنن ابی داؤد ۳/۷۴ کتاب الخراج

فی صفایا رسول اللہ، مسند احمد ۱/۶، طبقات ابن سعد ۸/۲۸)

دورِ عثمان

عثمان نے جنگ افریقہ کا خمس عبداللہ بن ابی سرح (خالہ زاد بھائی) کو دے دیا اور دوسری جنگ کا خمس اپنے چچا زاد بھائی اور داماد مروان بن الحکم کو دے دیا اور فدک بھی اسی کے نام الاٹ کر دیا، دوسرے داماد حارث کو مدینہ کا بازار مہزور الاٹ کر دیا جب کہ رسول اکرمؐ اسے مسلمانوں پر صرف کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد اپنے چچا حکم کو بنی قضاعہ کے صدقات کا مالک بنا دیا اور جب بھی کسی بازار مسلمین کا عامل عثمان کے پاس کوئی مال لے کر آتا تھا تو حکم ہو جاتا تھا کہ اسے حَکَم کے حوالہ کر دو۔ (تاریخ ذہبی ۲/ ۷۹، ابن اثیر ۳/ ۷۱، شرح نہج البلاغہ ۱/ ۶۷، طبری ۱/ ۲۸۱۸، ابن کثیر ۷/ ۱۵۲)

بیہقی نے عثمان کے اس طرح کے تصرّفات کے بارے میں فرمایا ہے کہ "یہ ان کا اجتہاد تھا اس روایت کی بنیاد پر جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب خدا کسی نبی کو آذوقہ فراہم کرتا ہے تو وہ اس کے بعد خلیفہ کا ہو جاتا ہے اور چونکہ خلیفہ اپنی دولت کی بنا پر بے نیاز تھے لہذا انھوں نے اپنے اقربا کو دے کر صلۂ رحم کا حق ادا کر دیا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمان نے ایک مرتبہ اجتہاد کر کے اپنے اقربا کو ترکہ رسولؐ دے دیا۔ دوبارہ اجتہاد کر کے خمس دے دیا۔ تیسری مرتبہ اجتہاد کر کے صدقات دیدئے اور اسی طرح برابر اجتہاد کرتے رہے اور خاندان کا پیٹ بھرتے رہے۔ کیا کہنا اس اجتہاد کا اور اس کی وسعتِ بیکراں کا۔؟

دورِ امام علیؑ

اس دور میں صورت حال وہی رہی جو عہد ابوبکر و عمر میں تھی۔ اس لئے کہ حضرت کوئی ایسا تصرّف نہیں کر سکتے تھے جس کا تعلق اہلبیتؑ کے مصالح اور منافع سے ہو ورنہ امتِ اسلامیہ

میں قبل از وقت قیامت برپا ہو جاتی۔

دور معاویہ

معاویہ کا اجتہاد بھی ترکہ رسولؐ اور خمس ذوی القربیٰ کے بارے میں ویسا ہی تھا جیسا کہ سابق خلفاء کا اجتہاد تھا۔ صرف اضافی اجتہاد یہ تھا کہ تمام اطراف میں حکم جاری کر دیا کہ فتوحات کے غنائم کے تمام دراہم و دنانیر اور بہترین اموال معاویہ کے ہوں گے اور انھیں مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ (مستدرک حاکم ۳/۴۴۲، طبقات ابن سعد طبع یورپ ۷/۱۸، اسد الغابہ ۲/۱۲۶، طبری ۲/۱۱۱، ابن اثیر ۳/۳۹۱)

دور عمر بن عبدالعزیز

عمر بن عبدالعزیز نے کوشش کی کہ ذریت پیغمبرؐ کو ان کا حق خمس بھی دیا جائے اور ان کا فدک بھی انھیں واپس کر دیا جائے تو اس کا انتقال اس شان سے ہوا کہ آجتک اس کا سبب نہ معلوم ہو سکا۔

عمر بن عبدالعزیز کے بعد

یزید بن عبدالملک نے یہ اجتہاد کیا کہ فدک کو بنی فاطمہؑ سے واپس لے لیا جائے۔ اس کے بعد سفاح نے واپس کر دیا اور منصور نے دوبارہ اجتہاد کر کے لے لیا اور مہدی نے واپس کر دیا۔

پھر موسیٰ بن مہدی نے اجتہاد کر کے قبضہ کر لیا اور مامون نے واپس کر دیا جو ان کے ہاتھ میں رہا یہاں تک کہ متوکل نے اجتہاد کیا اور پھر قبضہ کر لیا اور اسے عبداللہ بازیار کے حوالہ کر دیا اور اس نے گیارہ درخت خرما کاٹ ڈالے جنھیں رسول اکرمؐ نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔

(واضح رہے کہ "بازیار" فارسی لفظ ہے جس کا مفہوم شکاری ہو سکتا ہے اور شائد

یہ شخص متوکل کا "وزیر شکاریات" رہا ہو جس کے انعام میں فدک اس کے حوالہ کر دیا گیا)۔

بہر حال یہ اجتہاداتِ خلیفہ کی آخری خبر تھی۔ اس کے بعد علمار کرام کا اجتہاد شروع ہوتا ہے جس کی مختصر داستانِ غم یہ ہے:

خمس کے بارے میں علمار کی رائے

رسول اکرمؐ کے بعد خمس کے بارے میں علمار اسلام میں اتنا ہی تضاد پایا جاتا ہے جتنا تضاد خلفار اسلام کے افکار میں تھا کہ بعض افراد نے کہا کہ سہم رسولؐ کا تعلق خلیفہ سے ہے اور سہم ذوی القربیٰ کا تعلق اس کے قرابتداروں سے ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ سب کا مصرف لشکر سازی اور اسلحہ کی خریداری ہے۔ ایک جماعت کا عقیدہ ہے کہ اس کا تعلق خلفار اسلام کے اجتہاد سے ہے۔

عمر کے اہلبیتؑ کو خمس نہ دینے کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ "یہ ان کا اجتہاد تھا"۔ "حضرت عمر اپنے فیصلہ میں حدود اجتہاد سے باہر نہیں گئے اور ان پر اعتراض اصل اجتہاد پر اعتراض ہے جو تمام خلفار اسلام کا شعار رہا ہے"۔ اور "یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے"۔

اس کے بعد جب یہ اعتراض کیا گیا کہ خلیفہ نے ازواج پیغمبرؐ کو ان کا حصہ دے دیا اور جناب فاطمہؑ اور دیگر اہلبیتؑ کو ان کے خمس سے محروم کر دیا جب کہ زمانۂ پیغمبرؐ میں ایسا کچھ نہیں تھا۔

تو اس کا یہ جواب دیا گیا کہ مجتہدین میں اجتہادی مسائل میں اختلاف ہوتا ہی رہتا ہے لہٰذا حضرت عمر کو بھی رسول اللہ سے اختلاف کرنے کا حق تھا۔!

اس مقام پر یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ ان تمام بحثوں کا تعلق فتوحات کے مالِ غنیمت سے ہے اور مدرسۂ خلافت کا عقیدہ ہی یہ ہے کہ "واعلموا انما غنمتم" کا تعلق فتوحات کے غنیمت سے ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے جو مصرف آیتِ خمس میں معین کر دیا ہے۔ اس میں بھی خلفار اسلام کو خدا کے مقابلہ میں اجتہاد کرنے کا حق حاصل ہے۔

بہر حال خلفار اسلام کی سیرت سے خمس کا مصرف اس طرح طے ہوتا ہے کہ:

ابوبکر و عمر نے اجتہاد کیا تو فاطمہؑ بنت رسولؐ اور تمام اقربار رسولؐ کو ان کے حصۂ خمس سے محروم کر دیا۔

اس کے بعد عثمان نے اجتہاد کیا تو سارے ترکہ رسولؐ اور خمس کو اپنے اقربار کے حوالہ کر کے صلۂ رحم کا کارنامہ انجام دیا۔

اس کے بعد معاویہ نے اجتہاد کیا تو خمس اور ترکہ رسولؐ کے ساتھ تمام زر د و سفید اور بہترین اموال کو اپنے ذاتی خزانہ میں جمع کر لیا۔

اس کے بعد بنی امیہ اور بنی عباس کے خلفار نے اجتہاد کیا تو سارے اموال کو ذاتی ملکیت میں داخل کر کے فحش نگار شعرار اور گلوکار کنیزوں پر صَرف کر دیا۔

اس کے بعد علمار کرام نے اجتہاد کیا اور خلفار کے ہر عمل کو حکم اسلامی کا درجہ دے دیا اور اس کے مخالف کو سنت و جماعت کا دشمن قرار دے دیا۔

جب کہ اجتہادِ خلیفہ سے مراد صرف ذاتی رائے اور شخصی خیال ہے اور گویا اسے بھی فرمانِ خدا و رسولؐ کی طرح حکم شریعت کا درجہ حاصل ہے اور خیالِ خلیفہ بھی اسلامی شریعت کا ایک مصدر ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ ہیں خمس کے بارے میں مدرسۂ خلافت کے افکار و خیالات۔ اس کے بعد مدرسۂ اہلبیتؑ کا نظریہ وہی ہے جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے کہ خمس کے چھ۶ حصے کئے جائیں گے۔ تین حصے خدا، رسولؐ اور قرابتداران پیغمبرؐ کے ہوں گے اور باقی تین حصے بنی ہاشم کے فقرار، مساکین، ایتام اور مسافرین غربت زدہ کے لئے ہوں گے۔

اس کے علاوہ خمس کا تعلق تمام فوائد سے ہے۔ صرف میدانِ جنگ کے مال غنیمت سے نہیں ہے جس کی دلیل خود آیت خمس میں "ماغنمتم" کا عموم ہے جس میں کسی طرح کی تخصیص نہیں ہے اور آیت اگرچہ میدان بدر کے ذیل میں نازل ہوئی ہے لیکن مورد نزول حکم میں تخصیص نہیں پیدا کرتا ہے اور تخصیص بلا دلیل بھی جائز نہیں ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ آیت کا لفظ عام اور تخصیص کی صرف ایک وجہ ہے کہ آیت کا نزول غنیمتِ بدر کے بارے میں ہوا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح تو

چار گواہوں کے نہ ہونے پر حد جاری کرنے کا حکم واقعہ افک میں نازل ہوا ہے لہٰذا دوسرے افراد پر تہمت لگانے میں کوئی حد نہیں ہونی چاہیئے۔

یا ظہار کا حکم ایک خاص عورت کے اپنے شوہر سے جھگڑے کے ذیل میں نازل ہوا ہے لہٰذا دوسرے گھروں میں یہ قانون نہیں ہونا چاہیئے جبکہ ایسا کچھ نہیں ہے تو آیت خمس کی تخصیص بھی الگ سے دلیل کی محتاج ہے اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں عمومیت پر عمل کیا جائے گا۔

اس کی ایک تائید علامہ قرطبی کی تفسیر سے بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے "ماغنمتم من شیئ" کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے کہ اس سے مراد صرف کفار سے حاصل ہونیوالے وہ تمام اموال قرار دئے گئے ہیں جو قہر و غلبہ سے حاصل ہوں۔ حالانکہ لغت میں ایسی کوئی تخصیص خلاف ظاہر ہے اور لفظ میں بظاہر اطلاق پایا جاتا ہے۔

ایک دوسرا جواب تخصیص کے مقابلہ میں یہ بھی دیا گیا ہے کہ اگرچہ آیت کا نزول غنائم جنگ بدر کے بارے میں ہوا ہے لیکن اسے بہر حال جنگ بدر سے مخصوص نہیں کیا گیا ہے اور تمام جنگوں کو محیط کر دیا گیا ہے۔ تو جس طرح جنگ بدر کی خصوصیت کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصلِ جنگ کی تخصیص کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے اور خمس ہر استفادہ میں ہونا چاہیئے۔ چاہے اس کا تعلق جنگ سے ہو یا غیر جنگ سے ہو۔

آیۂ خمس کے علاوہ علماء شیعہ نے اس موضوع پر روایات اہلبیتؑ سے بھی استدلال کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے حدیث ثقلین وغیرہ کے ذریعہ ان سے تمسک کا حکم دیا ہے اور ان کا بیان اسلام میں حجت ہے چاہے اسے رسول اکرمؐ کی طرف نسبت دیں یا نہ دیں جیسا کہ شیخ صدوقؒ نے خصال ص ۳۱۲ میں حضرت جعفر بن محمدؑ سے ان کے آباء و اجداد کے واسطہ سے رسول اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے حضرت علیؑ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ "عبد المطلب نے دور جاہلیت میں پانچ سنتیں جاری کیں اور خدا نے سب کو اسلام میں جاری کر دیا۔ انھوں نے باپ کی منکوحہ کو اولاد پر حرام قرار دے دیا تو قرآن مجید نے بھی سورۂ نساء آیت ۲۲ میں اس کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے خزانہ کا خمس نکالا تو اسلام نے بھی "ماغنمتم من شیئ" کہہ کر اسے واجب بنا دیا"۔

جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آیت کا مفہوم غنیمت جنگ کے علاوہ دیگر فوائد کو بھی شامل ہے جیسا کہ سابق میں سیرتِ پیغمبرؐ کے ذیل میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

۶۔ اجتہادِ خلیفہ دوم در متعتین

جب حضرت عمر نے متعۃ الحج اور متعۃ النساء کو حرام قرار دیا تو اسے بھی ان کے اجتہادات میں شامل کر لیا گیا جیسا کہ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ ۱/۶۱، ۳/۱۶۷-۱۶۸ میں طعن ہشتم کے جواب میں درج کیا ہے اور احمد نے مسند ۳/۳۶۳ میں جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے نقل کیا ہے کہ "ہم لوگوں نے عہد رسول اکرمؐ میں متعۂ حج بھی کیا اور متعۃ النساء بھی لیکن جب عمر نے روک دیا تو ہم بھی رُک گئے"۔

تفسیر سیوطی ۲/۱۴۱، کنز العمال طبع اول ۸/۲۹۳، مشکل الآثار طحاوی ص ۳۷۵ میں سعید بن المسیب کی روایت ہے کہ "عمر نے دو متعہ سے روک دیا متعۂ حج اور متعۂ نساء۔

بدایۃ المجتہد ۱/۳۴۶ باب القول فی التمتع، زاد المعاد ابن قیم ۲/۲۰۵ فصل اباحۃ متعۃ النساء، شرح نہج البلاغہ ۳/۱۶۷، المغنی ابن قدامہ ۷/۵۲۷، المحلیٰ ابن حزم ۷/۱۰۷، تفسیر قرطبی ۲/۱۶۷، ۳/۲۰۱، ۲۰۲، کنز العمال ۳/۲۹۳-۲۹۴، البیان والتبیین جاحظ ۲/۲۲۳ میں بالفاظ بدایہ عمر سے روایت کی گئی ہے اور بالفاظ زاد المعاد عمر سے یہ بات ثابت ہے کہ "انھوں نے فرمایا کہ رسول اکرمؐ کے عہد میں دو متعہ تھے اور میں ان سے روک رہا ہوں اور ان پر سزا بھی دوں گا۔ ایک متعۃ الحج اور ایک متعۃ النساء"۔

آئندہ روایات میں ان دونوں اجتہادات کی تفصیل کا ذکر کیا جائے گا کہ یہاں بھی نص قرآن و حدیث کی مخالفت کو اجتہاد کا نام دیا گیا ہے۔!

۱۔ متعۃ الحج (حج تمتع)

بخاری اور مسلم دونوں نے اپنی صحیح میں اور احمد نے اپنی مسند میں اور بیہقی نے اپنی سنن میں (بالفاظ بخاری) ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انھوں نے مشرکین کے

دورِ جاہلیت کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ وہ لوگ حج کے مہینوں میں عمرہ کو بدترین فسق و فجور تصور کیا کرتے تھے۔ (بخاری کتاب الحج والعمرۃ باب التمتع والقِران والافراد، فتح الباری ۴/۱۶۸-۱۶۹ کتاب مناقب الانصار، صحیح مسلم باب جواز العمرۃ فی اشہر الحج حدیث ۱۹۸، مسند احمد ۱/۲۴۹، ۲۵۲، ۳۳۲، ۳۳۹، سنن ابی داؤد کتاب المناسک باب العمرۃ، نسائی کتاب الحج ص ۷۷، سنن بیہقی ۴/۳۴۵، المنتقی حدیث ۲۴۲۲، مشکل الآثار طحاوی ۳/۱۵۵، شرح معانی الآثار ۱/۳۸۱ مناسک الحج)

عمرہ میں سنّتِ پیغمبرؐ

ابن القیم کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ نے ہجرت کے بعد چار عمرے کئے اور سب کے سب ذی القعدہ میں تھے اور اس کی تائید انس، ابن عباس اور عائشہ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ "حضور نے ذی القعدہ کے علاوہ کوئی عمرہ نہیں کیا ہے"۔ (زاد المعاد ۱/۲۰۹ فصل فی ہدیۃ فی حجہ وعمرتہ، بخاری ۱/۲۱۲، مسلم کتاب الحج حدیث ۲۱۷-۲۲۰، سنن کبریٰ بیہقی ۴/۲۵۷ باب من استحب الاحرام بالعمرۃ من الجعرانۃ، ابن کثیر ۵/۱۰۹)

اس کے بعد ابن القیم نے اس کی توضیح اس طرح کی ہے کہ اس کا مقصد مشرکین کے طریقہ کار کی مخالفت تھا کہ وہ لوگ حج کے مہینوں میں عمرہ کو ناپسند کرتے تھے اور اسے روئے زمین کا سب سے بڑا فجور تصوّر کرتے تھے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ رجب کے مہینہ میں عمرہ سے یقیناً بہتر ہے۔ (زاد المعاد ۱/۲۱۱، ۲۲۳، سنن بیہقی ۴/۳۴۵ باب العمرۃ فی اشہر الحج)

واضح رہے کہ قرآن مجید نے اپنے نصوص میں عمرہ تمتع کا ذکر کیا ہے اور رسول اکرمؐ نے حجۃ الوداع میں اس پر عمل بھی فرمایا ہے کہ ہجرت کے بعد آپ نے ۹ سال تک حج نہیں کیا ہے اور سنہ۱۰ھ میں مدینہ سے ذی القعدہ میں حج کے ارادہ سے برآمد ہوئے جبکہ جزیرۃ العرب کے علاوہ یمن والے بھی اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ آپ کا اعلانِ حج کرنا تھا کہ چاروں

طرف سے لوگ مدینہ آنے لگے تاکہ آپ کے ساتھ مناسکِ حج انجام دے سکیں اور آپ سے مناسک کا علم حاصل کر سکیں۔

آپ کے ساتھ مدینہ سے ازواج، اہلبیت، مہاجرین، انصار، قبائل عرب، عوام الناس کی لاتعداد جماعت روانہ ہوئی جس کا شمار خالق و رازق کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

(سیرت سید الناس ۲/۲۷۳)

اس کے بعد راستہ میں بیشمار افراد شامل ہو گئے جو آپ کے ہمراہ تاحد نظر داہنے بائیں، آگے پیچھے چل رہے تھے۔ (زاد المعاد ۲/۲۱۳ فصل فی حجہ بعد ہجرتہ)

جابر کا بیان ہے کہ جب رسول اکرمؐ ہمارے درمیان تھے تو آپ پر قرآن نازل ہوتا تھا اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے اور یہ لوگ بھی اسی کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔

(ابن کثیر نے اپنی تاریخ ۵/۱۰۹-۱۱۰ میں تحریر کیا ہے کہ اس حج کا نام حجۃ البلاغ بھی ہے اس لئے کہ حضور نے لوگوں تک قول و فعل کے ذریعہ تمام احکام کی تبلیغ کر دی تھی اور یہ حج اسلام بھی تھا کہ اس سے پہلے مدینہ سے آپ نے کوئی حج نہیں کیا تھا)

وادی عقیق تک پہونچنے کے بعد آپ نے عمر بن الخطاب سے فرمایا کہ میرے پاس ایک خدائی نمائندہ "جبریل" آیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ یہ عمرہ حج کا حصّہ ہے لہٰذا میں نے اسے حج میں قیامت تک کے لئے شامل کر دیا ہے۔ (بخاری ۱/۱۸۶، سنن ابی داؤد مناسک ۲/۱۵۹، ابن ماجہ حدیث ۲۹۷۶، سنن بیہقی ۵/۱۳-۱۴)

منزل عسفان پر پہونچ کر آپ سے سراقہ نے عرض کی کہ آپ مسائل کو اس طرح واضح فرمائیں جیسے قوم آج ہی پیدا ہوئی ہے؟

تو آپ نے فرمایا کہ پروردگار نے تمھارے اس حج میں عمرہ کو بھی داخل کر دیا ہے لہٰذا جو شخص بھی طواف اور سعی تمام کر لے اس کا احرام ختم ہو جائے گا علاوہ اس شخص کے جو قربانی کا جانور ساتھ لے کر آیا ہے۔

مقام سرف پر آپ نے عام اصحاب کے درمیان اعلان فرمایا کہ "جس کے ساتھ قربانی کا جانور نہیں ہے وہ اس عمرہ کو عمرہ قرار دے سکتا ہے"۔ جس کے بعد حضرت عائشہ

کے مطابق کچھ لوگوں نے اس بات پر عمل کیا اور کچھ اصحاب نے اسے نظر انداز کر دیا۔

(صحیح بخاری ۱/۱۸۹، سنن بیہقی ۴/۳۵۶)

یہانتک کہ بطحاء مکہ پہونچ کر آپ نے پھر تکرار فرمائی کہ جو اسے عمرہ قرار دینا چاہتا ہے وہ قرار دے سکتا ہے۔

مولف: مذکورہ صورت حال سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور نے اس حکم کو بتدریج بیان فرمایا ہے۔ پہلے وادی عقیق میں عمر کو خبر دی کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے کہ حج و عمرہ دونوں کو جمع کر دیا جائے ۔ اس کے بعد منزل غسفان پر سراقہ سے کہا کہ پروردگار نے اس حج میں عمرہ بھی داخل کر دیا ہے اور جس کے ساتھ قربانی نہیں ہے اسے احرام ختم کر دینا چاہئے۔

مقام سرف میں عام اصحاب کے درمیان اعلان کیا جس کے نتیجہ میں بقول عائشہ اصحاب دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے اور بعض نے حضرت کے کہنے پر عمل کیا اور بعض نے انکار کر دیا۔

اور عجب نہیں ہے کہ انکار کرنے والے مہاجرین مکہ رہے ہوں جن کے ذہنوں میں دور جاہلیت سے یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ حج کے مہینوں میں عمرہ نہیں ہو سکتا ہے اور اسی لئے حضرت برابر اس حکم کی تکرار فرما رہے تھے۔

حد یہ ہے کہ جب صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کے بعد آپ آخری چکّر میں مروہ پر پہونچے تو پھر اعلان فرمایا کہ جس نے حج کے نام پر احرام باندھا ہے اگر اس کے ساتھ قربانی نہیں ہے تو اس عمل کو عمرہ بنا دے اور میں بھی اگر قربانی نہ لایا ہوتا تو مُحل ہو جاتا ہے۔ لیکن اب جب تک قربانی اپنی منزل تک نہ پہونچ جائے میں احرام ختم نہیں کر سکتا ہوں۔

جس پر سراقہ نے کہا کہ حضور اس طرح وضاحت فرمائیں کہ جیسے قوم شکم مادر سے آج ہی پیدا ہوئی ہے اور یہ فرمائیں کہ یہ صرف اس سال کا قانون ہے۔ یا ابدی قانون ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ بالکل ابدی ہے اور ایک ہاتھ کے پنجہ کو دوسرے میں ڈال کر فرمایا کہ میں نے یوں عمرہ کو حج کے اندر داخل کر دیا ہے۔

جس کے بعد ایک قیامت کھڑی ہو گئی اور جن لوگوں کے خیال میں ایام حج میں عمرہ

نہیں ہو سکتا تھا انھیں سخت ناگوار گذرا اور صاف صاف کہہ دیا کہ یہ احرام ختم کرنے کی کون سی قسم ہے ؟ فرمایا مکمل طور پر ختم کرنا ہے لہٰذا اگر قربانی ساتھ نہیں ہے تو بالکل احرام ختم کر دو کہ میں نے قیامت تک کے لئے عمرہ کو حج میں داخل کر دیا ہے"۔

"اب تمھارا قیام روز ترویہ تک بلا احرام رہے گا اور روز ترویہ حج کا احرام باندھنا ہوگا اور اس وقت کا عمل عمرۂ تمتع ہے"۔

لوگوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے تو حج کا احرام باندھا ہے ؟

فرمایا کہ "میں جو کچھ حکم دے رہا ہوں وہ کرو۔ اور میرے ساتھ بھی قربانی نہ ہوتی تو میں بھی یہی کرتا۔ جاؤ احرام ختم کرو اور اپنی عورتوں سے تعلقات پیدا کرو"۔ (مسلم ص ۸۸۲ حدیث نمبر ۱۴۱، سنن ابی داؤد باب افراد الحج، مسند احمد ۳/ ۳۵۶)

لوگوں نے یہ سن کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا یہاں تک کہ حضرت تک خبر پہونچی کہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اب تو عرفات میں صرف پانچ روز باقی رہ گئے ہیں مگر یہ چاہتے ہیں کہ ہم عورتوں کے پاس جائیں اور عرفات اس عالم میں پہونچیں کہ ہمارے اعضا سے منی ٹپک رہی ہو"۔

حضرت نے یہ سنا تو آپ کو شدید غصہ آگیا اور اسی عالم میں عائشہ کے پاس پہونچے۔ انھوں نے حالات کا اندازہ کر کے کہا حضور کس نے آپ کو غضبناک کیا۔ اللہ اس پر غضب نازل کرے اور اسے واصل جہنم کر دے۔

فرمایا کہ مجھے کس طرح غصہ نہ آئے۔ میں حکم دیتا ہوں اور یہ لوگ اطاعت نہیں کرتے ہیں۔ (سنن ابن ماجہ ص ۹۹۳، مسند احمد ۴/ ۲۸۶)

اس کے بعد آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا کہ " مجھے خبر ملی ہے کہ لوگ ایسا کہہ رہے ہیں۔ خدا کی قسم میں ان سب سے زیادہ متقی اور نیک کردار ہوں ـ یا بروایتے ـ تم سب کو معلوم ہے کہ میں تم سب سے زیادہ متقی، صادق اور نیک کردار ہوں اور اگر قربانی نہ لایا ہوتا تو میں بھی احرام ختم کر دیتا۔

لوگوں نے کہا کہ حضور کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص منیٰ جائے اور اس کے عضو سے منی ٹپک رہی ہو ؟

فرمایا بے شک! جس کے بعد لوگوں نے احرام ختم کر دیا اور خوشبو استعمال کی اور عورتوں سے مباشرت بھی کی اور جب ترویہ کا دن آیا تو حج کا احرام باندھ لیا۔

(زاد المعاد ۱/۲۴۶)

یہ تھا صحابہ کرام کا انداز اطاعت کہ قہراً جبراً حج کے مہینوں میں عمرہ کر لیا۔ اگرچہ ام المومنین عائشہ اس سے بھی محروم رہ گئیں کہ ایام حیض کی بنا پر اعمال عمرہ نہ کر سکیں اور حضور نے حج کے بعد ان کے بھائی عبدالرحمٰن کو حکم دیا کہ انھیں تنعیم سے عمرہ کا احرام بندھوا دیں اور وہ صرف حج کر کے واپس نہ جائیں۔

۔ رسول اکرمؐ کا انتقال ہونا تھا کہ ابوبکر نے خلیفہ بنتے ہی حج کو الگ کر دیا اور عمر نے بھی اپنے دور میں یہی کیا اور جب عرفہ میں ایک شخص کو بال سنوارے ہوئے دیکھا تو دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں تمتع کی نیت سے آیا تھا اور آج حج کا احرام باندھا ہے جس پر عمر نے کہا کہ خبردار اس زمانہ میں عمرہ تمتع نہ کرنا کہ اگر میں نے اس امر کی اجازت دے دی کہ لوگ بیویوں سے تعلقات پیدا کریں گے اور انھیں کے ہمراہ حج کریں گے۔

دیکھو حج و عمرہ کو الگ الگ انجام دو اور حج کے مہینوں میں صرف حج کرو۔ عمرہ کسی اور زمانے میں کرو۔ اپنے حج اور عمرہ کو حکم قرآن کے مطابق تمام کرو اور تمامیت یہی ہے کہ درمیان میں احرام ختم نہ ہونے پائے جیسا کہ سنت پیغمبرؐ میں بھی یہی ہے کہ قربانی کے نحر ہونے سے پہلے احرام ختم نہیں کیا تھا۔

یہی بات عمر نے ابوموسیٰ کے جواب میں کہی مگر افسوس کہ ابوموسیٰ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ یہ کہہ سکتا کہ رسول اکرمؐ نے بار بار وضاحت کی تھی کہ میرے احرام نہ کھولنے کی وجہ یہ ہے کہ میں قربانی لے کر آیا ہوں اور تمتع بالعمرہ کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔

صرف حضرت علیؑ نے عمر کو ٹوکا تھا کہ حج تمتع کتاب خدا اور سنت رسولؐ کا اتباع ہے اور شائد اسی کے بعد حضرت عمر مجبور ہو گئے کہ حقیقت کا اقرار کر لیں اور سنت پیغمبرؐ کا سہارا نہ لیں۔ چنانچہ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ "دو متعہ عہد پیغمبرؐ میں تھے اور میں دونوں کو روک رہا ہوں اور اس پر سزا بھی دوں گا۔"

بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ "میں تم کو متعہ سے روک رہا ہوں اگرچہ اس کا ذکر کتاب خدا میں ہے اور میں نے خود رسول اکرمؐ کے ساتھ عمرہ تمتع کیا ہے۔" (نسائی ۱۶/۲)

شائد خلیفہ دوم کی یہ شدّت اس امر کی طرف اشارہ تھی کہ صحابۂ کرام حضرت علیؑ کا اتباع نہ کرنے پائیں اور رسول اکرمؐ کا حوالہ دینے سے ان کا موقف کمزور ہو جائے گا لہٰذا انھوں نے اپنے حکم کا سہارا لیا اور وجہ یہ بیان کی کہ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ لوگ درخت اراک کے نیچے مزہ اڑائیں اور پھر حج کے لئے اس عالم میں جائیں کہ ان کے "سروں" سے پانی ٹپک رہا ہو۔

اہلِ مکہ کے پاس کوئی زراعت یا مویشی نہیں ہے۔ ان کا کل گذارا ان لوگوں پر ہوتا ہے جو وارد ہوتے ہیں۔ گویا کہ قریش کا خلیفہ اسی نظریہ کو واپس لانا چاہتا ہے جو ان لوگوں نے رسول اکرمؐ کے مقابلہ میں پیش کیا تھا اور حجۃ الوداع کے ساتھ عمرہ تمتع سے انکار کر دیا تھا۔

اور حقیقت امر یہ ہے کہ خلیفہ نے اجتہاد کر کے اپنی قریش برادری کے منافع کا انتظام کیا تھا اور تمام حج و عمرہ کا مفہوم دونوں کو الگ الگ انجام دینا قرار دیا تھا۔ اگرچہ یہ بات سنت رسولؐ کے سراسر خلاف تھی۔

اس کے بعد مسلمان ان کے راستہ پر چلتے رہے اور جب عثمان کا دور آیا تو انھوں نے بھی یہی طریقہ رائج رکھا اور یہ اعلان کر دیا کہ اگر حج و عمرہ الگ الگ ہوں گے تو دوبارہ زیارت کعبہ کا شرف حاصل ہوگا۔

جس کے بعد امام علیؑ نے فرمایا کہ تم نے سنت رسولؐ سے روکا ہے جس کا تعلق تمام محتاج اور بعید افراد سے تھا اور یہ کہہ کر حج اور عمرہ دونوں کو انجام دیا اور عثمان نے روکنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ صرف ایک رائے تھی۔ (مسند احمد ۱/ ۹۲ حدیث ۷۰۷)

دوسری روایت کی بنا پر امام علیؑ نے فرمایا کہ تم تمتع سے روک رہے ہو؟

عثمان نے کہا یقیناً۔

فرمایا کیا تم نے نہیں سُنا ہے کہ رسول اکرمؐ نے تمتع کیا ہے؟

کہا بے شک۔

جس کے بعد حضرت علیؑ اور دیگر اصحاب نے عمرہ کا احرام باندھ لیا۔

تیسری روایت کا فقرہ ہے کہ امامؑ نے فرمایا کہ سنت رسولؐ سے کیوں روک رہے ہو؟ تو عثمان نے کہا کہ آپ ہمیں چھوڑ دیجئے!

فرمایا یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہہ کر عمرہ اور حج کے لئے احرام باندھ لیا۔

چوتھی روایت میں ہے کہ جب امام علیؑ نے عثمان کو ایک سال میں حج و عمرہ سے روکتے ہوئے دیکھا تو یوں دعا کی "لبّیك بعمرة وحجة معًا"۔ اور عثمان نے کہا کہ میرے حکم کے خلاف کر رہے ہیں؟ فرمایا کہ میں کسی کی خاطر سنت رسولؐ کو نہیں ترک کر سکتا ہوں۔ (بخاری ۱/۱۹۰، سنن نسائی ۲/۱۵)

البتہ امام علیؑ کے علاوہ دیگر افراد پر شدّت جاری رہی اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ "جو شخص حج کے مہینوں میں عمرہ کرے اسے مارا جائے اور اس کا سر مونڈ دیا جائے"۔

معاویہ کے دور میں۔ سعد نے معاویہ سے کہا کہ عمرۂ تمتع بہترین چیز ہے۔ تو اس نے کہا مگر عمر نے منع کر دیا ہے۔

اور معاویہ کا سردارِ شیاطین ضحاک تو کہنے لگا کہ عمرۂ تمتع وہی کرے گا جو حکم الٰہی کا جاہل ہوگا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ عمر نے منع کر دیا ہے۔ اس کے بعد معاویہ نے روایت وضع کرائی کہ حضور اکرمؐ نے بھی حج و عمرہ کو جمع کرنے سے منع کیا ہے۔ اور جب لوگوں نے انکار کیا تو اس کا اصرار اور بڑھ گیا۔

غرض معاویہ کا دور انتہائی دہشت ناک تھا اور مشہور صحابی عمران بن حصین سانس روکے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ مرض الموت میں ایک شخص سے عہد لے کر خاموشی سے کہا کہ میری زندگی میں اس کا اظہار نہ کرنا۔ رسول اکرمؐ نے حج و عمرہ ایک سال میں انجام دیا تھا اور پھر اس سے نہی نہیں کی تھی اور نہ کسی آیت نے اس قانون کو منسوخ کیا ہے۔ حضورؐ کے بعد ایک شخص نے جو چاہا کہنا شروع کر دیا۔ (صحیح مسلم ص ۱۹۹ حدیث ۱۶۶، ۱۶۸، ۱۶۹، شرح النووی ۳۰۵ - ۳۰۶)

معاویہ کے دور کا مکمل جائزہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ دور اپنے سابق ادوار پر

نہ باقر میں سبقت لے گیا:

پہلی بات یہ ہے کہ سنت عمر کو دین بنا لیا گیا اور ضحاک جیسے بے ایمانوں نے یہ اعلان کر دیا کہ حج و عمرہ ایک ساتھ انجام دینا امر الٰہی سے جہالت کا نتیجہ ہے اور اس کا ثبوت عمر کی ممانعت کو قرار دیا جب کہ سعد برابر فعل رسولؐ سے استدلال کر رہے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی زبان سے حدیث تیار ہو گئی کہ آپ نے عمر سے پہلے ہی منع کر دیا تھا۔ جس کے بعد مدرسۂ خلافت نے اسی سبق کو دُہرانا شروع کر دیا اور ابن زبیر نے ابن عباس کے مقابلہ میں ابوبکر و عمر کی ممانعت کے حوالہ سے مکہ میں عمرۂ تمتع پر پابندی لگا دی جب کہ ابن عباس برابر اس کا حکم دے رہے تھے اور جب کسی نے کہا کہ تم کب تک ابوبکر و عمر کے اوامر کے خلاف لوگوں کو گمراہ کرتے رہو گے ؟ تو انھوں نے کہا کہ عنقریب یہ لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ میں حکم رسولؐ کا حوالہ دے رہا ہوں اور یہ ابوبکر و عمر کی بات کر رہے ہیں اور اس طرح طرفین میں شدید اختلاف جاری رہا۔

اور اُس طرف عُروہ نے حدیث گڑھ دی کہ رسول اکرمؐ اور اصحاب نے حجۃ الوداع میں بھی حج و عمرہ کو الگ الگ رکھا ہے اور گواہی میں اپنی ماں اور خالہ کو پیش کر دیا۔ اگرچہ ان دونوں کا بیان یہی تھا کہ ہم لوگوں نے حجۃ الوداع میں عمرہ بھی کیا ہے۔

بہر حال مدرسۂ خلافت کے پرستار اس کے بعد بھی رسول اکرمؐ۔ امام علیؑ کی زبان سے روایت بیان کرتے رہے کہ انھوں نے دونوں کو الگ رکھا ہے اور اسی کا حکم دیا ہے۔

اور پھر ابوذر کی زبان سے روایت تیار کی کہ عمرہ تمتع صرف ہم اصحاب رسولؐ کے لئے تھا اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابوذر سے روایت ربذہ کی سرزمین پر وضع کی اور امام علیؑ کی روایت محمد حنفیہ سے وصیت کی شکل میں تیار کی اور پھر ایک صحابی سے روایت منسوب کی کہ اس نے عمر کو اطلاع دی تھی کہ رسول اکرمؐ نے منع کر دیا ہے۔

لیکن ان سب کوششوں کے بعد بھی لوگوں کے دل عمرۂ تمتع میں لگے رہے جیسا کہ ابن عباس کو بتایا گیا اور اس کا راز مخالفت عمر نہیں تھا بلکہ امکانات کی کمی تھی کہ دور رہنے والا انسان دو مرتبہ مکہ نہیں آسکتا ہے جیسا کہ خراسانی نے مکہ میں حسن بصری سے سوال کیا کہ ہم اتنی دور سے بار بار نہیں آسکتے ہیں۔ یا ایک دوسرے شخص نے مجاہد سے سوال کیا کہ

یہ میرا پہلا حج ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اب آپ فرمائیں کہ اسی حال میں رہوں یا اسے عمرہ بنادوں۔ (المحلیٰ ۷/۱۰۳)

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا مکان حجاز میں نہیں تھا کہ ایک مرتبہ حج کے لئے آئیں اور ایک مرتبہ عمرہ کے لئے اور اس طرح ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کی پیروی کرسکیں۔

بھلا وہ شخص جو صرف ایک مرتبہ استطاعت پیدا کرلے وہ کیا کرے؟ اور سنت عمر پر کس طرح عمل کرے؟ جب کہ مثل مشہور ہے کہ "اگر چاہتے ہو کہ تمھاری اطاعت نہ کی جائے تو ایسی چیز کا حکم دے دو جو ناممکن ہو۔"

یہی وجہ ہے کہ اکثر مسلمان سنت عمر ترک کرنے پر مجبور ہوگئے اور بعض لوگوں نے صرف یہ طریقہ اختیار کرلیا کہ عمرہ اور حج کے درمیان احرام نہ ختم کریں گے اور حنبلی حضرات نے سیدھے سیدھے سنت عمر کا انکار کردیا اور حج وعمرہ دونوں کو ایک ساتھ جائز کردیا۔

سامانِ عبرت

کھلی ہوئی بات ہے کہ سرکار دو عالمؐ کے ساتھ حجۃ الوداع کے موقع پر بحث ومباحثہ کے بعد کم سے کم ستر ہزار ورنہ ایک لاکھ سے زیادہ افراد نے عمرۂ تمتع کیا اور اس کی روایت اسی مقدار میں افراد نے بیان کی جنھوں نے اس منظر کو دیکھا بھی ہے اور خود بھی عمل کیا ہے لیکن اس کے باوجود ایک خلیفہ عمر بن الخطاب میں اتنی طاقت پیدا ہوگئی کہ انھوں نے صاف صاف انکار کردیا اور سب نے مان بھی لیا بلکہ بعض لوگوں نے ان کی حمایت میں روایتیں بھی گڑھ دیں اور سب نے نصوص کتاب وسنت کے مقابلہ میں ان کے اجتہاد کو قبول کرلیا اور اسی کو قانون اسلام بنا دیا۔

تو ایسے حالات میں اگر نص غدیر کا انکار کردیا جائے تو کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ ریاست وامارت کے مسئلہ میں تو جذبات وخواہشات کی کارفرمائی زیادہ ہوتی ہے۔ حج وعمرہ میں تو ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن بدلنے والوں نے دین بدل دیا اور ماننے والوں نے اسے تسلیم کرلیا۔ فاعتبروا یا اولی الالباب؟

ب۔ متعۃ النساء

سابق کے صفحات میں متعدد حوالوں سے یہ بات نقل کی جاچکی ہے کہ حضرت عمر نے واضح لفظوں میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ "عہد رسالت میں دو متعہ تھے اور میں دونوں کو بند کر رہا ہوں بلکہ اس پر سزا بھی دوں گا۔ ایک متعۂ حج اور ایک متعۃ النساء"۔

مذکورہ مصادر کے علاوہ اس کا تذکرہ تفسیر قرطبی ۲/ ۳۸۸، تفسیر فخر رازی ۲/ ۱۶۷۔ ۳/ ۲۰۱، ۲۰۲، کنز العمال ۸/ ۲۹۳، ۲۹۴، البیان والتبیین جاحظ ۲/ ۲۲۳ میں بھی پایا جاتا ہے۔

مسئلہ کے تفصیلات اور اس میں اجتہادی کیفیت کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ اس وقت اس عقد کی حقیقت اور اس کی ممانعت کے اسباب کا جائزہ لیا جا رہا ہے جس میں پہلے مدرسۂ خلافت میں اس کی حقیقت کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس کے بعد مدرسۂ امامت میں اور پھر آخر میں کتاب و سنت سے اس کی حیثیت کا تعین کیا جائے گا۔

— مدرسۂ خلافت میں متعہ کی تعریف یہ ہے کہ کوئی شخص کسی عورت سے دو گواہوں کی موجودگی میں ولی کی اجازت کے ساتھ ایک محدود مدت کے لئے عقد کرے اور بقدر اتفاق مہر ادا کر دے۔ اس کے بعد جب مدت ختم ہو جائے گی تو عورت سے کوئی تعلق نہ رہ جائے گا اور وہ اپنے رحم کے حمل سے پاک ہونے کا انتظار کرے گی کہ بہرحال لڑکا باپ ہی سے ملحق کیا جائے گا۔ اس کے بعد اگر رحم صاف ہے اور حمل نہیں ہے تو ایک حیض کے بعد دوسرے شخص سے عقد کر سکتی ہے اور دونوں کے درمیان کوئی میراث نہیں ہوتی ہے۔

مدت کے خاتمہ کے بعد اگر دونوں سلسلہ کو باقی رکھنا چاہیں تو دوسرا مہر ادا کرنا ہوگا۔

— مدرسۂ اہلبیتؑ میں متعہ کا مفہوم یہ ہے کہ عورت خود یا اس کا وکیل یا نابالغ ہونے کی صورت میں ولی اس کا عقد کسی مرد سے کر دے اور وہاں نسب، سبب، رضاعت، عدہ، شوہر داری وغیرہ جیسا کوئی مانع بھی نہ ہو۔ مہر بھی معین ہو اور مدت بھی مقرر ہو۔ اس کے بعد جب مدت ختم ہو جائے گی یا شوہر باقی مدت کو عورت کو بخش دے گا تو رشتہ ختم ہو جائے گا اور دخول کی صورت میں اگر عورت پاک نہیں ہے تو اسے دو حیض تک عدہ

رکھنا ہوگا اور اگر حیض نہیں آتا ہے تو ۴۵ دن کا عدہ ہوگا۔ لیکن اگر دخول نہیں ہوا ہے تو اس کا حال قبل دخول طلاق کا ہوگا یعنی کسی طرح کا کوئی عدہ نہ ہوگا۔

اولاد کا حال وہی ہوگا جو دائمی عقد میں ہوتا ہے اور اولاد وارث بھی ہوگی۔

متعہ۔ کتابِ خدا میں

ارشاد الٰہی ہے: "فما استمتعتم بہ منھن فاٰتوھن اجورھن فریضۃ ولاجناح علیکم فیما تراضیتم بہ من بعد الفریضۃ" (نساء-۲۴)

ابن عباس کے مصحف میں "اجل مسمی" کا لفظ بھی تھا اور یونہی ابی بن کعب، سعید بن جبیر اور ابن عباس قرات کرتے تھے اور قتادہ اور مجاہد نے اسی کی روایت کی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ۱/۴۷۴)

متعہ۔ سنّتِ رسولؐ میں

عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ نے ایک کپڑے پر ایک مدت کے لئے عقد کی اجازت دی تھی اور اس کے بعد ابن مسعود نے اس آیت کی تلاوت کی:

"یایھا الذین اٰمنوا لاتحرموا طیّبات ما احل اللہ لکم ولاتعتدوا"

(مائدہ-۸۷)

جابر اور سلمہ بن الاکوع راوی ہیں کہ ہمارے سامنے منادی رسولؐ نے آواز دی کہ حضور نے متعہ کی اجازت دے دی ہے۔ (صحیح مسلم ۱/۲۲ حدیث ۱۴۰۵)

سبرہ الجہنی کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ہم کو متعہ کی اجازت دے دی تو ہم بنی عامر کے ایک شخص کے ساتھ ایک عورت کے پاس گئے اور دونوں نے اپنا پیغام دیا۔ اس نے مہر دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ اپنی چادر۔

اس نے قبول کر لیا تو میں اس کے ساتھ تین روز رہا۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ جس کے پاس کوئی ممتوعہ عورت ہے وہ اسے آزاد کر دے۔ (صحیح مسلم ۱/۲۴ حدیث ۱۴۰۶)

ابو سعید خدری راوی ہیں کہ ہم سرکار کے زمانہ میں ایک کپڑے پر متعہ کیا کرتے تھے۔

اسماء بنت ابی بکر فرماتی ہیں۔ میں نے خود عہد پیغمبرؐ میں متعہ کیا ہے۔

جابر کہتے ہیں کہ ہم ایک مٹھی خرما یا آٹے پر رسول اکرمؐ، ابو بکر اور عمر کے دور میں متعہ کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد عمر کے آخری دور خلافت میں عمرو بن حریث نے ایک عورت سے متعہ کیا اور وہ حاملہ ہوگئی اور عمر کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے ممنوع قرار دے دیا۔

(صحیح مسلم ۱/۲۳ حدیث ۱۴۰۵)

دوسری روایت میں ہے کہ عمرو بن حوشب نے بنی عامر بن لوئی کی باکرہ لڑکی سے متعہ کیا اور وہ حاملہ ہوگئی تو حضرت عمر نے کہا کہ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو متعہ کرتے ہیں اور عادل گواہ نہیں بناتے ہیں۔ اگر کسی نے بغیر گواہ کے متعہ کیا تو میں اس پر حد جاری کر دوں گا جس کے بعد لوگوں نے ان کی بات کو قبول کر لیا۔ (المصنف عبدالرزاق ۷/۵۰۰-۵۰۱)

دوسری روایت میں ہے کہ ربیعہ بن امیہ بن خلف نے ایک عورت سے دو عورتوں کو گواہ بنا کر متعہ کیا اور وہ حاملہ ہوگئی تو عمر نے منبر پر جا کر اعلان کیا کہ اگر میں پہلے منع کر چکا ہوتا تو اس شخص کو سنگسار کر دیتا۔

ایک روایت یہ ہے کہ سلمہ بن امیہ نے حکیم بن امیہ کی کنیز سے متعہ کیا اور جب بچّہ پیدا ہوا تو اس کا انکار کر دیا جس کے بعد عمر نے متعہ کو حرام کر دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ اب اگر کسی کے متعہ کرنے کی خبر آئی اور وہ شادی شدہ ہوگا تو سنگسار کروں گا ورنہ کوڑے لگاؤں گا۔

(المصنف ابن ابی شیبہ ۴/۲۹۳)

۔ عمر کی اس ممانعت کے بعد متعہ اسلامی معاشرہ میں بالکل حرام ہوگیا اور عمر کا اصرار اس کی تحریم پر جاری رہا۔ یہاں تک کہ عمران بن سوادہ کی روایت ہے کہ انھوں نے خلیفہ سے کہا کہ ایک نصیحت ہے؟

پوچھا بتاؤ کیا ہے؟

کہا۔ یہ تمھارے لئے عیب ہے کہ تم نے زمانۂ حج میں عمرہ کو منع کر دیا ہے۔ حالانکہ نہ رسول اکرمؐ نے ایسا کیا تھا اور نہ ابو بکر نے اور یہ امر حلال تھا۔

عمر نے کہا کہ بات یہ ہے کہ اگر زمانۂ حج میں عمرہ بھی ہو گیا تو اس کے بعد مکہ خالی رہ جائے گا لہٰذا میرا فیصلہ صحیح ہے۔

اس نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے متعہ کو بھی حرام کر دیا ہے جب کہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے اور ہم اس پر عمل بھی کرتے تھے۔

عمر نے کہا کہ رسول اکرمؐ نے ضرورت کے زمانہ میں حلال کر دیا تھا۔ اب حالات بہتر ہو گئے ہیں لہٰذا اب تو ایک مٹھی خرما یا آٹے پر نکاح ہو سکتا ہے اور تین دن کے بعد طلاق ہو سکتی ہے لہٰذا متعہ کی، کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مولف : کیا واقعاً مکہ مکرمہ کے خالی ہو جانے کے خوف سے حلال خدا کو حرام بنایا جا سکتا ہے۔؟

اور متعۂ نساء کے بارے میں کیا سفر صرف رسول اکرمؐ کے زمانہ میں ہوتا تھا جب آپ نے اجازت دے دی تھی اور آج کسی شخص کا سفر چند ماہ یا سال کا ہو تو اسے کیا کرنا ہوگا۔

یا اگر کوئی شخص وطن میں بھی عقد دائم کا امکان نہ رکھتا ہو تو اسے کیا کرنا ہوگا؛ فطرت کو تبدیل کرنا ہوگا یا خفیہ طریقہ سے کوئی راستہ نکالنا ہوگا یا اسلامی معاشرہ بھی دیگر معاشروں کی طرح کھلّم کھلاّ زنا کی اجازت دیدے گا۔

خلیفہ کا یہ ارشاد کہ مٹھی بھر خرمے پر عقد دائم کرے اور تین دن کے بعد طلاق دیدے۔ یہ تو عورت سے کھلی ہوئی خیانت اور دھوکہ بازی ہے جسے اسلام کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا ہے۔

ـــ مذکورہ تمام روایات و بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دورِ رسولِ اکرمؐ میں متعہ رائج تھا اور حضور نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی تھی اور ممانعت کی تمام روایتیں دورِ عمر کے بعد پیدا ہوئی ہیں ورنہ وہ خود حوالہ میں پیش کرتے اور کوئی صحابی یہ نہ کہہ سکتا کہ ممانعت کا سلسلہ عمر کے آخری دورِ خلافت سے شروع ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امام علیؑ اور ابن عباس دونوں یہ کہا کرتے تھے کہ "اگر عمر نے متعہ حرام نہ کر دیا ہوتا تو سوائے بدبخت آدمی کے کوئی زنا نہ کرتا"۔

اس سارے ہنگامہ کے باوجود حضرت علیؑ، ابن مسعود، ابن عباس، اسماء، ابو سعید خدری، جابر، سلمہ، معبد، معاویہ بن ابی سلیمان، عمران بن الحصین سب اسے حلال ہی کہتے رہے اور عمر

کے فتویٰ سے متاثر نہیں ہوئے۔

بلکہ تابعین میں طاؤس، عطار، سعید بن جبیر اور تمام فقہار مکہ واہل یمن نے اسے حلال ہی تسلیم کیاہے اور اسی پر قائم رہے ہیں۔

حضرت عمر کا اتباع کرنے والے بھی دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے۔ بعض لوگوں نے جعلی روایات پر اعتماد کر کے حرمت کو رسول اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا اور بعض کا یہ خیال تھا کہ یہ خلیفہ کا اجتہاد ہے اور خلیفہ کا اجتہاد بھی دین کی حیثیت رکھتا ہے۔

روایاتِ رسول اکرمؐ میں تناقض

جن افراد نے حُرمت عمرۂ تمتع کو رسول اکرمؐ کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان کی روایات میں بھی کھُلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے۔

ایک طرف وہ روایات ہیں جن میں رسول اکرمؐ کے حج افراد کا ذکر کیا گیاہے اور گویا آپ نے حج و عمرہ کے جمع کرنے کو منع کیاہے۔

دوسری طرف وہ روایات ہیں جن میں آپ نے حج تمتع کا حکم دیاہے اور تمام اصحاب نے اس پر عمل بھی کیاہے۔

اور شائد اس تضاد کا راز یہ ہے کہ جن روایات میں دونوں کو جمع کرنے سے روکا گیاہے وہ خلفار کے موقف کی حمایت کے لئے وضع کی گئی ہیں اور جب بھی روایات میں اختلاف ہوتاہے تو ہم ان روایات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں اہل اقتدار کی تائید ہوتی ہے کہ انھیں کے جعلی ہونے کا امکان رہتاہے۔

۷۔ دوسری صدی اور اس کے بعد کا اجتہاد اور عمل صحابہ کی حیثیت

اجتہاد ۔ حقیقت اجتہاد ۔ ارتقار ۔ دلائل۔

اجتہاد کے معنی مکتب خلافت میں اپنی رائے پر عمل کرنے کے ہیں اور اس کا اصلی

مدرک صحابۂ کرام اور خلفاء اسلام کا عمل ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ذاتی رائے پر عمل کیا ہے
اور مسلمانوں نے انھیں کا اتباع کر لیا ہے۔

علامہ دوالیبی کتاب "المدخل الیٰ علم اصول الفقہ" مطبوعہ دارالعلم للملایین بیروت ۱۳۸۵ھ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "صحابہ کے سامنے جب کوئی ایسا مسئلہ آتا تھا جس کی کوئی نص کتاب خدا اور سنت رسولؐ میں نہ ہوتی تھی تو وہ مجبوراً اجتہاد کیا کرتے تھے اور اسے اپنی رائے سے تعبیر کیا کرتے تھے جیسا کہ ابوبکر اور عمر کے عمل سے واضح ہے"۔

اس کے بعد موصوف نے اس بیان پر اس امر سے استدلال کیا ہے کہ "حضرت عمر نے شریح اور ابوموسیٰ کو اسی امر کی ہدایت دی تھی"۔ اور اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "صحابہ کے یہاں اجتہاد کے نہ قواعد مقرر تھے اور نہ موازین۔ وہ فقط روح شریعت پر اعتماد کیا کرتے تھے جس کا انھیں ادراک اور احساس حاصل تھا"۔

آگے چل کر فرماتے ہیں "بعد کے افراد کو یہ بات اس سہولت سے حاصل نہ ہو سکی لہٰذا اجتہاد برابر متغیر ہوتا رہا اور بڑی حد تک مجتہد کے حالات سے متاثر ہوتا رہا جس کے نتیجہ میں جس قدر مجتہد کا زمانہ تنزیل کے زمانہ سے دور تر ہوتا گیا علمی نزاع میں اضافہ ہوتا گیا اور رجال اجتہاد قواعد مقرر کرنے پر مجبور ہو گئے جسے علم اصول فقہ سے تعبیر کیا گیا اور اجتہاد دوسرے مرحلہ پر پہلے مرحلہ سے بالکل مختلف ہو گیا اور اس کا اعتماد قواعد و قوانین پر ہونے لگا جب کہ دور اول میں اس کا دار و مدار اسرار شریعت کے ذوق سلیم پر تھا۔ (المدخل ص۱۴-۱۷)

اس کے بعد قرآن حکیم کے تصریحات سے حسب ذیل مصادر حکم کا استنباط کیا ہے:

۱۔ قرآن مجید میں احکام اور حقوق کا پہلا مصدر خود قرآن مجید ہے۔

۲۔ دوسرا مصدر سنت رسولؐ ہے "ما آتاکم الرسول فخذوہ"۔

۳۔ تیسرا مصدر وہ امور ہیں جن کا سنت نے اعتراف کیا ہے اور وہ ہے اجماع اور اجتہاد۔ (المدخل ص ۳۰)

اس طرح تشریع کے چار مصدر یا چار اصول ہوں گے:

(۱) کتاب (۲) سنت (۳) اجماع (۴) اجتہاد

دوالیبی کا ارشاد ہے کہ اس طرح چوتھی اصل استنباط وہ ہے جسے اجتہاد، رائے اور عقل کہا جاتا ہے۔ (المدخل ص ۵۳)

دلائل صحت اجتہاد

مکتب خلافت میں اجتہاد کے صحیح ہونے کے تین دلائل ہیں:

ا۔ حدیث معاذ

سنن دارمی وغیرہ میں اس امر کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب رسول اکرمؐ نے معاذ کو یمن کیطرف بھیجا تو فرمایا کہ تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟

انھوں نے کہا۔ کتاب خدا سے!

فرمایا اگر کتاب خدا میں مدرک نہ مل سکا تو؟

کہا۔ سنت رسول اللہ سے!

فرمایا اگر معاملہ سنت رسولؐ میں بھی نہ ہوا تو؟

عرض کی۔ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوئی کوتاہی نہ کروں گا!

حضرتؐ نے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے رسول کو یہ توفیق عنایت کر دی ہے۔ (مقدمہ دارمی ۱/۶۰، مسند احمد ۵/۲۳۰، ۲۷۶)

ب۔ حدیث عمرو عاص

صحیح بخاری ۴/۱۷۸ باب اجر الحاکم من کتاب الاحکام، صحیح مسلم کتاب الاقضیہ باب بیان امر الحاکم ص ۱۲۴۳ حدیث نمبر ۱۵، ابن ماجہ باب الحاکم یجتھد فیصیب حدیث نمبر ۲۳۱۴ کتاب الاحکام۔ مسند احمد ۲/۱۸۷، ۴/۱۹۸، ۲۰۴، ۲۰۵ میں یہ روایت درج ہے جس کے بارے میں بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ اگر حاکم فیصلہ کرنے میں اجتہاد کرلے اور فیصلہ صحیح ہو تو اس کے لئے دُوہرا اجر ہے اور اگر غلطی ہو جائے تو اس کے لئے ایک اجر ہے۔

ج۔ رسالہ عمر برائے ابوموسیٰ اشعری

"ہوشیار ہوشیار۔ جو خیالات تمھارے دل میں پیدا ہوں اور ان کا ذکر کتاب و سنت

میں نہ ہو۔ ان کے بارے میں سمجھداری سے کام لینا اور معاملات کا ایک دوسرے پر قیاس کرنا"۔ (الکتاب المنسوب الی وشرحہ فی الاحکام لابن حزم ۵/۳..۱۰، اعلام الموقعین ۱/۸۵-۸۶)

۔ یہ ہیں جواز اجتہاد و قیاس کے بہترین دلائل اور ان کے علاوہ دیگر دلائل نہ قابل ذکر ہیں اور نہ قابل بحث و مناقشہ کہ ان کی سندیں بھی کمزور ہیں اور ان کا مفہوم بھی اصل موضوع سے الگ ہے۔

لیکن مذکورہ بالا دلائل کے بارے میں بھی ابن حزم کا بیان یہ ہے کہ "روایت معاذ سے استدلال کرنا مہمل کام ہے کہ اس کا راوی حارث بن عمرو ہے اور وہ ایک مجہول شخص ہے جس کے بارے میں یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ یہ کون ہے بلکہ بخاری نے تاریخ اوسط میں لکھا ہے کہ "حارث کا نام ہی صرف اس روایت سے پہچانا گیا ہے لہٰذا یہ حدیث صحیح نہیں ہے"۔

اس کے بعد حارث نے بھی اہل حمص سے روایت کی ہے اور ان کا حال بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ پھر نہ اس کا کوئی ذکر صحابہ کے دور میں تھا اور نہ تابعین کے دور میں۔ بس ابوعون نے اسے نہ لیا اور کہاں سے۔ یہ بھی نہیں معلوم ہے اور جیسے ہی اصحاب رائے نے شعبہ کے پاس اس روایت کو دیکھ لیا چاروں طرف لے اڑے اور ساری دنیا میں اس کی اشاعت کر دی جب کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور بالکل مہمل ہے۔ (الاحکام ابن حزم ۵/۳، ۷۷۵-۷۷ طبع المطبعۃ العاصمۃ بالقاہرہ)

"اس کے بعد اس کلام کے مہمل اور باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کبھی یہ کہہ ہی نہیں سکتے ہیں کہ اگر کتاب و سنت میں نہ ہو تو؟ اس لئے کہ آپ ہی نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ "جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کا اتباع کرو"۔ "آج ہم نے دین کو کامل کر دیا"۔ "جو حدود خدا سے تجاوز کرے اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے"۔ اور پھر دین خدا میں رائے کی دخل اندازی یوں بھی حرام ہے۔

پھر اگر یہ روایت صحیح بھی ہوتی تو اس میں اجتہاد بالرائے کا مفہوم صرف یہ ہوتا کہ میں اپنی کوشش صرف کر دوں گا تاکہ کتاب و سنت میں حق تلاش کر سکوں اور مسلسل جد و جہد جاری رکھوں گا۔

اس کے علاوہ اگر روایت کو صحیح مان لیا جائے تو دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں:

یا یہ حکم صرف معاذ کے لئے ہے تو ان کے علاوہ کسی کی رائے پر عمل نہیں کیا جا سکتا ہے اور اصحاب رائے اس امر سے اتفاق نہیں کرتے ہیں۔

یا یہ حکم عام ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے بھی کوئی رائے قائم کر لی گو یا حکم خدا پر عمل کر لیا اور تمام اصحاب رائے اہل حق ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حق بھی متضاد ہو سکتا ہے کہ رائیں متضاد ہو سکتی ہیں جب کہ یہ بات ان لوگوں کے مسلک کے خلاف بھی ہے اور عقل کے خلاف بھی ہے۔ بلکہ ایک واضح محال ہے کہ اس طرح کسی کو اپنی بات پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ اس کا مخالف بھی حق ہے اور اس کی رائے بھی مذہب میں سند ہے۔

حدیث میں صرف اجتہاد بالرائے کا ذکر ہے لہٰذا کسی رائے کو دوسری رائے پر مقدم نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ان جاہلوں کے خیال میں حضور نے معاذ کو حلال و حرام بنانے، فرائض کو ثابت و ساقط کرنے کا اختیار دے دیا تھا اور اس کا کوئی مسلمان گمان بھی نہیں کر سکتا ہے اور شریعت میں قانون الٰہی کے علاوہ کسی چیز کی گنجائش نہیں ہے۔" (الاحکام ۵/۵،۷)

۔ اس کے بعد ابن حزم ہی عمرو عاص کی حدیث کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ یہ ان لوگوں کے خلاف ایک حجت ہے کہ اس میں حکم حاکم کے غلط ہونے کا تذکرہ بھی موجود ہے اور دین میں غلطی سے کوئی قانون نہیں تیار ہو سکتا ہے اور نہ پروردگار کسی کی غلطی کو مستند بنا سکتا ہے لہٰذا یہ استدلال بالکل مہمل ہے۔" (الاحکام ابن حزم ۵/۱۷،)

۔ "حضرت عمر کے خط کے بارے میں ان کا ارشاد ہے کہ اس کی دو سندیں ہیں۔ پہلی سند میں عبد الملک بن ولید بن معدان ہے جو کوفہ کا رہنے والا اور متروک الحدیث ہے جو بلا اختلاف ساقط ہے اور اس کا باپ بھی مجہول ہے۔

اور دوسری سند میں کرجی سے لے کر سفیان تک سب مجہول ہیں لہٰذا اس سے استدلال غلط ہے اور یہ مسلک باطل ہے۔" (الاحکام ۵/۱۰۰۳، اعلام الموقعین ۱/۸۵-۸۶)

اجتہاد بالرائے کے بارے میں ہماری بحث

ا۔ مفہوم اجتہاد کیا ہے؟

۲۔ دلائل مذکورہ کا مفہوم کیا ہے ؟

جہاں تک اجتہاد کا تعلق ہے اس کا مفہوم پہلی صدی میں وہی تھا جو لغت میں تھا یعنی کسی معاملہ میں اپنی طاقتوں کا صرف کرنا۔ اور معاذ و عمرو عاص کی روایات میں اگر ان کی سند صحیح بھی ہو تو اس کا مفہوم یہی ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ان دونوں روایات کا اصل موضوع سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔ اصل موضوع احکام کا رائے سے طے کرنا ہے اور ان دونوں کا تعلق قضاوت سے ہے جہاں احکام طے شدہ ہوتے ہیں اور انھیں منطبق کیا جاتا ہے۔ قاضی احکام کو منطبق کرتا ہے۔ وہ احکام وضع نہیں کرتا ہے اور یہی حال عمر کے خط کا بھی ہے کہ اس کا تعلق بھی تنفید احکام سے ہے تشریع احکام سے نہیں ہے۔

بنا بریں حدیث معاذ کا مفہوم یہ ہوگا کہ کتاب و سنت کے بعض احکام بالکل واضح ہیں وہ صاف نظر آجاتے ہیں اور بعض ذرا دقیق ہیں لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ اپنی فکری طاقت صرف کر کے ان کا استنباط کرے اور اسی کا نام لغت میں اجتہاد ہے۔

مدرسۂ خلافت کے اس روایت سے استدلال سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گویا شریعت الٰہیہ ہی ناقص تھی اور اب حکام اور مفتیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی رائے سے نئے مسائل طے کر کے دین خدا کو مکمل بنائیں جو انتہائی غیر معقول امر ہے۔

عمل صحابۂ کرام سے قواعد سازی

علامہ دوالیبی نے اجتہاد کی تعریف یہ کی ہے کہ اجتہاد وہ رائے ہے جس پر اتفاق نہ ہو۔ ورنہ اس کا نام اجماع ہو جائے گا اور یہی وجہ ہے کہ اجتہاد کا مرتبہ اجماع سے کمتر ہے۔ (المدخل ص ۵۵)

اس کے بعد انھوں نے اجتہاد کی تین قسمیں بیان کی ہیں :

۱۔ کتاب و سنت کے بیانات کی تشریح و تفسیر۔

۲۔ ایک جیسے مسائل پر قیاس۔

۲۔ وہ رائے جس کا کوئی مدرک نہ ہو۔ صرف روح شریعت سے اس کا استنباط کیا جائے کہ شریعت کا مقصد مصلحت ہے اور جہاں مصلحت سمجھ میں آجائے سمجھو وہی شریعت ہے"۔ بالفاظ دیگر "جس کو مسلمان اچھا سمجھ لیں سمجھو وہی اچھا ہے"۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ "اجتہاد کی واضح ترین مثال رسول اکرمؐ کے بعد حاصل ہونیوالی عراق، شام اور مصر کی زمینوں کی تقسیم کا مسئلہ ہے جس کے بارے میں نص قرآن یہ تھی کہ غنیمت سے حاصل ہونے والے مال کا پہلے خمس نکالا جائے گا اور اسے اس کے مصارف میں صرف کیا جائے گا اور اس کے بعد ۴/۵ حصہ کو مفہوم آیت کی بنا پر مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا جیسا کہ خیبر میں خود سرکار دو عالمؐ نے کیا ہے"۔

اور اسی بنا پر مجاہدین نے حضرت عمر سے مطالبہ کیا کہ خمس نکالنے کے بعد باقی مال کو ان کے درمیان تقسیم کر دیں لیکن انھوں نے فرمایا "بعد کے آنے والے مسلمان کیا کریں گے جب وہ دیکھیں گے کہ ساری زمینیں تقسیم ہو چکی ہیں اور اب میراث میں چل رہی ہیں۔ یہ بات میری رائے کے خلاف ہے"۔

عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ پھر رائے کیا ہے؟ یہ علاقہ تو خدا نے مجاہدین کو دیا ہے۔

فرمایا کہ "بات یہی ہے لیکن میری رائے نہیں ہے"!

اس پر ہنگامہ ہو گیا اور لوگوں نے کہا کہ جو مال خدا نے ہمیں دیا ہے اور ہم نے بزور شمشیر حاصل کیا ہے اسے ان لوگوں پر وقف کرنے کا جواز کیا ہے جنھوں نے اس جہاد میں شرکت بھی نہیں کی ہے۔

فرمایا۔ میرا جواب صرف یہ ہے کہ میری یہی رائے ہے۔

اور اس کے بعد سب نے کہہ دیا کہ بیشک پھر رائے یہی ہے۔ (المدخل الی علم اصول الفقہ ص ۹۱-۹۵)

۔ ابن حزم کا بیان ہے کہ رائے اس خیال کا نام ہے جو دماغ میں بلا کسی دلیل کے داخل ہو جائے۔

اور قیاس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی مسئلہ میں نص شریعت کے بغیر حکم کرے۔

صرف اس بنیاد پر کہ یہ مسئلہ فلاں مسئلہ سے ملتا جلتا ہے۔ (الاحکام ابن حزم ۱/ ۴۰-۴۱)

دوالیبی نے استحسان کی یہ تعریف کی ہے کہ "کسی مسئلہ میں قیاس سے فیصلہ کرنا۔ یا اس بنیاد پر کہ استحسان کی دلیل میں کوئی ترجیح کا رُخ پایا جاتا ہے۔ یا کسی مصلحت کی بنا پر یا کسی نقصان کو دفع کرنے کے لئے"۔ (المدخل ص ۲۹۳)

اس کے بعد حنفیوں کی زبان سے استحسان کی یہ تعریف کی ہے کہ "اشباہ و امثال کے قانون سے کسی قوی ترین دلیل کی بنا پر عدول کرنا" اور مالکیوں کی طرف سے یہ تعریف نقل کی ہے کہ فقیہ جزئیات کی تلاش میں اس بات کا پابند نہ ہو کہ قیاس کے مطابق ہی حکم دے اور نقصان و مشقت کو برداشت کرے اور مصلحت سے ہاتھ دھولے۔ (المدخل ص ۲۹۶)

استصلاح کی تعریف یہ ہے کہ "یہ درحقیقت رائے سے فیصلہ کرنے کی ہی کی قسم ہے جس میں مصلحت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے"۔ (المدخل ص ۳۵۱ باب ہشتم)

اس کے بعد تینوں اصول کا فرق اس طرح واضح کیا ہے کہ قیاس و استحسان میں ہمیشہ دوسرے احکام کو نگاہ میں رکھا جاتا ہے۔ قیاس میں صرف مشابہت و مماثلت کی بنا پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور استحسان میں اشباہ و امثال کو چھوڑ کر دوسرے اسباب حسن کی بنا پر فیصلہ کیا جاتا ہے جو اتحاد حکم سے زیادہ قوی ہوتے ہیں۔

استصلاح میں اصلاً دوسرے امثال پر نظر نہیں کی جاتی ہے بلکہ صرف مصلحت کو دیکھا جاتا ہے اور اسی کی بنا پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ (المدخل ص ۳۰۴-۳۰۵ باب ہشتم)

اس کے بعد ایک باب قائم کیا ہے "نصوص اور زمانہ کے تغیر کے ساتھ احکام کا تغیر" اور اس کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ ایسے احکام کی تبدیلی جن کی نص شارع اعظم کی طرف سے منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ ان کے بارے میں علماء اعلام نے قاضیوں اور مفتیوں کو زمانہ کے تغیر کے ساتھ احکام بدل دینے کی اجازت دی ہے اور اسے دیگر شریعتوں کے مقابلہ میں اسلام کے امتیازات میں شمار کیا ہے جس میں ایک طرف آزادئ عقل کا سبق پایا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف احکام اسلام میں مصالح کی بنیاد پر نرمی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس طرح یہ قانون تغیر" ایک بہترین قانون ہو گیا ہے جس کا اعلان یہ ہے کہ "زمانہ کے تغیر" کے ساتھ

احکام بھی بدل جاتے ہیں"۔ (المدخل ص ۳۱۹)

اس سلسلہ میں اعلام الموقعین ابن القیم ۳/۳۰-۳۶ سے بھی استدلال کیا ہے کہ انھوں نے اس فصل کو بیحد مفید قرار دیا ہے اور بہت سی مثالیں بھی دی ہیں مثلاً مثال ہفتم... یہ ہے کہ دور رسول اکرمؐ وابوبکر اور ابتداء خلافت عمر تک جب کوئی شخص ایک وقت میں تین مرتبہ طلاق دے دیتا تھا تو اسے ایک ہی شمار کیا جاتا تھا جس کے بارے میں مختلف صحیح روایات بھی ہیں جیسے رکانہ بن عبد یزید کی طلاق کا مسئلہ کہ انھوں نے ایک مجلس میں تین مرتبہ طلاق دے دی اور پھر رنجیدہ ہوکر حضور کی خدمت میں آئے۔ آپ نے ماجرا دریافت کیا۔ انھوں نے ایک نشست میں تین طلاق کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا یہ صرف ایک ہے لہذا تم رجوع کر سکتے ہو۔ اور انھوں نے رجوع کرلی۔

ظاہر ہے کہ عمر بن الخطاب پر یہ سنت رسولؐ مخفی نہیں تھی اور وہ جانتے تھے کہ اس میں اللہ کی طرف سے وسعت اور آزادی پائی جاتی ہے لیکن انھوں نے اسے تین طلاق بنا دیا۔ حالانکہ لعان میں "اربع شھادات" سے چار شہادتیں نہیں ہوجاتی ہیں اور قسم میں "خمسین قسامۃ" سے پچاس قسم نہیں ہوجاتی ہیں۔

اسی طرح اور دوسری مثالیں پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ کتاب خدا اور سنت رسول اللہ اور لغت عرب اور لغت خطاب ہے اور یہی خلیفۂ رسول، صحابۂ کرام اور دور عمر کے ابتدائی تین برسوں کا مذہب ہے جہاں ہزار سے زیادہ افراد نے عمل کیا ہے لیکن کتاب، سنت، اجماع، قیاس سب کے ہوتے ہوئے "امیر المومنین" عمر نے یہ فرما دیا کہ اس زمانہ کی مصلحت یہی ہے تو وہی قانون شریعت بن گیا۔

اجماع

دوالیبی نے اجماع کی دو قسمیں بیان کی ہیں:

۱۔ کسی موضوع پر تمام امت کے اتفاق کے بجائے صرف صاحبانِ علم کا اجماع ہوجائے۔

۲۔ جس مقام پر واقعہ پیش آئے وہاں کی ساری امت کا اتفاق ہوجائے چاہے دیگر مقامات کے افراد متفق نہ ہوں۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ صحابہ کے دور کے بعد علمار نے اجماع کو بھی شریعت کے اصول میں شامل کر لیا ہے لیکن اس کے صحیح حدود کا تعین نہیں کر سکے ہیں۔

درحقیقت مذکورہ بالا تمام مثالوں کا دارومدار رائے پر تھا چاہے اس کا نام تاویل رکھا جائے یا اجتہاد یا کوئی اور شے۔

قیاس میں مجتہد اپنی رائے سے دو متشابہ چیزوں کا حکم ایک بنا دیتا ہے۔

استحسان میں مشابہت کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور اس کا سبب مجتہد کا اپنا خیال اور اس کی اپنی پسند ہوتی ہے۔

استصلاح میں بھی مجتہد ہی مصلحت کا فیصلہ کرتا ہے اور اس سلسلہ میں کوئی نص نہیں ہوتی ہے۔

اجماع اس سے قدرے بہتر ہے۔ لیکن اس میں بھی تمام علمار یا ایک علاقہ کے علمار کی رائے کا اتفاق ہی ہوتا ہے اور اس طرح مدرسۂ خلافت کا کل دارومدار صرف رائے پر ہے اور اس طرح بعض اوقات رائے کو نص شرعی پر بھی مقدم کر دیا جاتا ہے جیسے کہ حضرت عمر نے عراق و شام کی زمینوں کے ۴/۵ حصہ کو مجاہدین میں تقسیم کرنے کے بجائے روک لیا اور تمام کتاب و سنت کے نصوص کا انکار کر دیا۔

یا اسی طرح ایک مجلس میں تین طلاق کو واقعاً تین بنا دیا جب کہ یہ بات کتاب و سنت کے بالکل خلاف تھی۔

اور نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب و سنت کو ٹھکرا کر رائے پر عمل کرنا بھی باعث فخر و مباہات بن گیا اور مجتہدین یہ کہنے کی ہمت ہو گئی کہ میں نص رسول اکرم کو نہیں مانتا ہوں اور میری رائے رسول اکرمؐ کے قول پر عمل کرنے سے بہتر ہے۔

حضرت ابو حنیفہ اور رائے

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد ۱۳/۳۹۰ میں یوسف بن اسباط سے روایت

کی ہے کہ ابو حنیفہ نے فرمایا کہ اگر میرا اور رسول اللہ کا زمانہ ایک ہوتا تو وہ میرے بہت سے اقوال کو اختیار کر لیتے اس لیے کہ دین بہترین رائے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ (کتاب المجروحین ابن حبان بستی [متوفی ۳۵۴ھ] ۲۵/۳)

۔علی بن عاصم سے نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں رسول اکرمؐ کے اقوال کو اختیار نہیں کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ رسول اکرمؐ کے اقوال کو ؟

فرمایا ہاں میں ان پر عمل نہیں کرتا ہوں۔

۔اسحاق فزاری کی روایت ہے کہ میں ابو حنیفہ کے پاس مسائل جہاد دریافت کرنے جاتا تھا تو ایک دن ایک مسئلہ دریافت کیا اور انھوں نے جواب دے دیا تو میں نے کہا کہ رسول اکرمؐ سے تو اس کے خلاف نقل کیا جاتا ہے۔؟

فرمایا چھوڑو ان باتوں کو۔

۔دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہ دیدہ و دانستہ رسول اکرمؐ کے اقوال سُن کر ان کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

۔تیسرے مقام پر ان کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ کی طرف تلوار کی واپسی کے بارے میں حدیث بیان کی تو ابو حنیفہ نے کہا یہ خرافات حدیث ہے۔

۔حماد بن سلمہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ابو حنیفہ تمام آثار کو اپنی رائے سے طے کرتے تھے یا دوسرے الفاظ میں اپنی رائے ہی سے رد بھی کر دیتے تھے۔ (کتاب المجروحین ۷۰/۳)

۔وکیع کا بیان ہے کہ ابو حنیفہ نے دو سو حدیثوں کی مخالفت کی ہے۔ (کتاب المجروحین ۷۰/۳)

۔صالح الفراد کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابو حنیفہ نے رسول اکرمؐ کی چار سو سے زیادہ احادیث کی مخالفت کی ہے اور جب میں نے دریافت کیا کہ کیا آپ کو وہ حدیثیں معلوم ہیں ؟۔ تو فرمایا بیشک !

میں نے کہا ذرا بتلائیے ؟

تو انھوں نے کہا کہ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ میدانِ جنگ میں سوار کے دو حصے ہیں اور

پیدل کا ایک حصہ۔ اور میں جانور کا حصہ مومن سے زیادہ نہیں قرار دے سکتا ہوں۔

۔ اس کے علاوہ رسول اکرمؐ نے حج میں جانور کی پشت کو زخمی کر دیا تھا اور ابوحنیفہ نے اسے مثلہ قرار دے دیا۔

۔ اسی طرح آپؐ نے فرمایا کہ طرفین تجارت جب تک الگ نہ ہو جائیں انھیں معاملہ کو توڑنے کا اختیار رہتا ہے اور ابوحنیفہ نے کہا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔

۔ رسول اکرمؐ سفر میں جاتے وقت ازواج کے درمیان قرعہ ڈالا کرتے تھے اور اصحاب نے بھی یہی عمل کیا ہے۔ لیکن ابوحنیفہ نے اسے جُوا قرار دے دیا۔

۔ حماد کا بیان ہے کہ مسجد الحرام میں ابوحنیفہ کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا کہ اگر مُحرِم کے پاس جوتا نہ ہو اور وہ موزہ پہن لے؟

فرمایا۔ ایک قربانی دینا ہوگی۔

میں نے کہا کہ سبحان اللہ۔ ہم سے ایوب نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ اگر محرم کے پاس نعلین نہ ہوں تو موزے پہن لے اور اسے گٹے کے نیچے کے حصہ سے کاٹ دے۔

(تاریخ بغداد ۱۳/۳۹۲)

۔ بشر بن مفضل کا بیان ہے کہ میں نے ابوحنیفہ سے کہا کہ نافع نے ابن عمر کے حوالہ سے رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "خرید و فروخت کے طرفین جب تک الگ نہ ہو جائیں معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار رہتا ہے"۔ تو ابوحنیفہ نے کہا کہ یہ صرف رجز ہے۔

میں نے کہا کہ اور قتادہ نے انس سے روایت کی ہے کہ ایک یہودی نے ایک کنیز کا سر پتھر سے کچل دیا تو رسول اکرمؐ نے بطور سزا اس کا بھی سر کچل دیا۔ تو ابوحنیفہ نے کہا کہ یہ سب بکواس ہے۔ (تاریخ بغداد ۱۳/۳۸۸، مجروحین البستی ۳/۶۷)

۔ عبدالصمد نے اپنے باپ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ابوحنیفہ کے سامنے رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا کہ حجامت کرنے والے اور جس کی حجامت کی جائے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تو فرمایا کہ یہ صرف قافیہ پیمائی ہے۔ (تاریخ بغداد ۱۳/۳۸۸)

۔ عبدالوارث کہتے ہیں کہ میں مکہ میں تھا اور ابوحنیفہ بھی وہیں تھے تو میں ان کے پاس

گیا جب کہ ایک شخص اور تھا اور اس نے ایک مسئلہ دریافت کیا۔ تو انھوں نے جواب دیا۔ اس نے کہا کہ پھر عمر بن الخطاب کی روایت کا کیا ہوگا؟

فرمایا۔ وہ شیطان کا قول ہے۔

وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے کہا سبحان اللہ۔ تو دوسرے شخص نے کہا کہ آپ کو تعجب ہو رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک شخص نے رسول اکرمؐ کے ارشاد کا حوالہ دیا تھا تو انھوں نے فرمایا کہ صرف قافیہ پیمائی ہے اور کچھ نہیں ہے۔ تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب کبھی اس بزم میں نہیں آؤں گا۔ (تاریخ بغداد ۱۳/۳۸۸)

ـ یحییٰ بن آدم کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ سے رسول اکرمؐ کی اس حدیث کا ذکر کیا گیا کہ وضو نصف ایمان ہوتا ہے تو مذاق اُڑاتے ہوئے فرمایا۔ ٹھیک ہے میں دو مرتبہ وضو کر لوں گا تاکہ پورا ایمان مکمّل ہو جائے۔

یحییٰ نے کہا کہ یہاں ایمان سے مراد نماز ہے جیسا کہ پروردگار نے "ما کان اللہ لیضیع ایمانکم" میں فرمایا ہے۔ اور رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ نماز بغیر وضو کے نہیں ہو سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے وضو نصف نماز یعنی نصف ایمان ہے۔

سفیان بن عیینہ کا بیان ہے کہ میں نے خدا کے مقابلہ میں ابو حنیفہ جیسا جسور نہیں دیکھا ہے۔ لوگ حدیث رسولؐ کی مثال دیتے تھے اور وہ نہایت آسانی سے ٹھکرا دیتے تھے۔ یہانتک کہ ان سے روایت بیان کی گئی کہ خریدار اور بیچنے والے جب تک جُدا نہ ہوں معاملہ کو توڑنے کا اختیار رہتا ہے۔ تو فرمایا اگر دونوں کشتی میں سوار ہوں۔ یا قید خانہ میں ہوں۔ یا سفر میں ساتھ ہوں تو کس طرح الگ ہوں گے اور کب تک یہ اختیار باقی رہے گا۔!

مذکورہ بالا علمار نے امام اہل رائے ابو حنیفہ کے بارے میں جن الزامات کا ذکر کیا ہے۔ ان روایات کے بارے میں ہم نے خود بھی تحقیق کی تو یہ انکشاف ہوا کہ یہ روایات واقعاً رسول اکرمؐ سے منقول ہیں اور اس کے بعد ابو حنیفہ کے فتاویٰ کا مطالعہ کیا تو اندازہ

ہوا کہ واقعاً یہ فتاویٰ رسول اکرمؐ کے ارشادات کی ضد اور ان کے سراسر خلاف ہیں۔ چنانچہ روایات کے بارے میں ملاحظہ ہو:

ا۔ صحیح بخاری، مسلم، سنن ابی داؤد، ترمذی، موطا مالک، مسند احمد میں یہ روایت درج ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرس کے لئے دو حصہ قرار دئے ہیں اور صاحب فرس کے لئے ایک حصہ۔ (بخاری کتاب الجہاد باب سہام الفرس ۲/۹۹، المغازی باب غزوۃ خیبر ۳/۶۳، مسلم کتاب الجہاد باب کیفیۃ قسمۃ الغنیمۃ بین الحاضرین حدیث ۵۷، ابو داؤد کتاب الجہاد باب ۱۴۳، ۱۴۷، ترمذی السیر باب ۶۸، مسند احمد ۲/۲، ۶۲، ۸۰، ۴/۱۳۸)

لیکن ابو حنیفہ نے اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ (بدایۃ المجتہد ابن رشد ۲/۴۱۱)

ب۔ صحیح بخاری، مسلم، سنن ابن ماجہ، دارمی، ترمذی، مسند احمد کی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے داہنے کوہان پر جانور قربانی کے اشعار (زخم لگانا) کر دیا تھا۔ (بخاری کتاب الحج باب ۵۱، مسلم حدیث ۲۰۵، ترمذی ص ۶۴، کتاب المناسک ابن ماجہ باب اشعار البُدن ص ۹۶، سنن دارمی باب ۶۸، مسند احمد ۱/۲۱۶، ۲۵۴، ۲۸۰، ۳۴۴، ۳۷۲، ۳۴۷، ۳۳۹)

لیکن ابن حزم نے المحلیٰ میں لکھا ہے کہ ابو حنیفہ اشعار کو مُثلہ قرار دیا کرتے تھے اور یہ عالم اسلام کا عظیم ترین المیہ ہے کہ رسول اکرمؐ کوئی عمل انجام دیں اور اُمتی اسے مُثلہ قرار دے کر ناپسند کرے۔ حیف ہے اس عقل پر جو رسول اکرمؐ کے عمل پر حاشیہ لگائے۔

ج۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ تجارت کے طرفین کو فسخ کرنے کا اختیار رہتا ہے جبتک مجلس معاملہ سے الگ نہ ہوں۔ (بخاری کتاب البیوع باب ۱۹، ۲۲، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۶، ۴۷۔ مسلم حدیث ۴۳، ۴۶، ۴۷۔ سنن ابی داؤد باب ۵۱، ترمذی ۳۶، نسائی ۴، ۷، ۹۔ دارمی باب ۱۵، موطا ۷۹، ابن ماجہ کتاب التجارات ۱۷، مسند احمد ۱/۴، ۹، ۵۲، ۵۴، ۷۳، ۱۳۵، ۳۱۱۔ ۳/۴۰۲، ۴۳۴۔ ۵/۱۲، ۱۷، ۲۱، ۲۲، ۲۳)

لیکن بدایۃ المجتہد ۲/۲۲۶ کتاب بیع الخیار میں مذکور ہے کہ شافعی اور ابو حنیفہ نے اختیار کو تین دن تک قرار دیا ہے اور ابن حزم نے المحلیٰ میں اس سلسلہ کی تمام حدیثوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ان سب احادیث سے الگ راستہ ابو حنیفہ اور مالک اور ان کے

مقلدین کا ہے جنھوں نے معاملہ کو کلام سے مکمل کر دیا ہے چاہے جسمانی طور پر فریقین الگ نہ ہوں اور ایک دوسرے کو اختیار نہ دے اور اس ذیل میں تمام سنن ثابتہ کی مخالفت کی ہے۔

(المحلیٰ ۸/۳۵۱-۳۵۲ مسئلہ ۱۴۱۷)

د۔ صحیح بخاری، مسلم، دارمی، ابن ماجہ وغیرہ میں ہے کہ "مُحرِم کو نعلین میسر نہ ہوں تو موزے پہن لے"۔ (بخاری کتاب الحج باب ۲۱، مسلم حدیث ۱-۵، ترمذی ۱۹، نسائی ۵۲، ۵۴، ۵۵، ۵۷، ۵۹، ۶۱، ۶۳، موطا ۸-۹، ابن ماجہ کتاب المناسک ۱۹، ۲۰، دارمی ۹، مسند احمد ۱/۲۱۵، ۲۲۵، ۲۲۸، ۲۷۹، ۲۸۵، ۳۳۷، ۲/۳، ۴، ۸، ۲۹، ۳۲، ۳۴، ۴۱، ۴۷، ۵۰، ۵۴، ۶۶، ۷۳، ۷۴، ۸۱، ۱۱۱، ۱۱۹، ۳/۳۲۳، ۳۹۵)

لیکن ابن حزم کا بیان ہے کہ ابو حنیفہ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ (المحلیٰ ۷/۸۱)

ھ۔ صحیح بخاری، مسلم، سنن ابی داؤد، ابن ماجہ وغیرہ میں ہے کہ رسول اکرمؐ نے اس یہودی کے سر کو کچل دیا تھا جس نے ایک کنیز کے سر کو دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تھا۔ (بخاری کتاب الخصومات ۱، الوصایا ۵، الدیات ۴، ۱۲، مسلم کتاب القسامہ ۱۷، سنن ابی داؤد کتاب الدیات ۱، ابن ماجہ ۲۴، دارمی باب ۴، مسند احمد ۳/۱۹۳، ۲۶۲، ۲۶۹)

لیکن ابن رشد کا بدایۃ المجتہد میں بیان ہے کہ ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے قصاص کے بارے میں فرمایا ہے کہ ظالم نے کسی طرح بھی قتل کیا ہو قصاص صرف تلوار سے لیا جا سکتا ہے۔ (بدایۃ المجتہد ۲/۳۷۴)

ان احادیث کی تفصیل المحلیٰ ۱۰/۳۶۰ میں مذکور ہے۔

و۔ صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، ترمذی، دارمی وغیرہ میں ہے کہ حجامت کرانے سے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ (بخاری کتاب الصوم باب ۳۲، سنن ابی داؤد باب ۲۸، ترمذی باب ۵۹، دارمی باب ۲۶، سنن ابن ماجہ کتاب الصیام ۱۸، مسند احمد ۲/۳۶۴، ۳/۴۶۵، ۴۷۴، ۴۸۰-۴/۱۲۳، ۱۲۴-۵/۲۱۰، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۸۰، ۲۸۲، ۲۸۳-۶/۱۲، ۱۵۷، ۲۵۸)

لیکن بدایۃ المجتہد میں ہے کہ ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے فرمایا ہے کہ یہ عمل

نہ روزہ شکن ہے اور نہ مکروہ۔ (بدایہ ۱/۳۰۰، المحلیٰ ابن حزم ۶/۲۰۴، ۲۰۵ مسئلہ ۷۵۲)

ن۔ سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی وغیرہ میں ہے کہ وضو نصف ایمان ہے۔ (سنن ترمذی کتاب الدعاء باب ۸۵، نسائی کتاب الزکوٰۃ باب ۱، ابن ماجہ الطہارۃ ۵، دارمی الوضوء باب ۲، مسند احمد ۵/۳۶۵)

ح۔ صحیح بخاری، مسلم، سنن ابی داؤد، دارمی وغیرہ میں ہے کہ رسول اکرمؐ جب سفر کا ارادہ فرماتے تھے تو ازواج کے درمیان قرعہ ڈالتے تھے اور جس کا نام نکل آتا تھا اسی کو ساتھ لے جاتے تھے۔ (بخاری کتاب الجہاد باب ۶۴، الہبۃ ۱۵، الشہادات ۱۵، ۳۰، المغازی ۳۴، تفسیر سورہ ۳۴، صحیح مسلم کتاب التوبہ حدیث ۵۶، سنن ابی داؤد کتاب النکاح باب فی القسم بین النساء، دارمی کتاب النکاح ۲۶، مسند احمد ۶/۱۱۷، ۱۵۷، ۱۹۵، ۲۶۹)

واضح رہے کہ مذکورہ روایت ام المومنین عائشہ کی ہے حالانکہ تاریخی اعتبار سے حضورؐ حج اور عمرہ کے علاوہ کسی سفر میں ازواج کو ساتھ نہیں لے گئے۔

(خصوصیت کے ساتھ جنگ کے موقع پر کسی کو نہیں لے گئے اور نہ ازواج کو جنگ کی تربیت دی۔ جوادی)

مذکورہ بالا روایت کے علاوہ سیکڑوں صحیح حدیثیں ہیں جو کتب صحاح و مسانید میں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود ابو حنیفہ اور دیگر مجتہدین نے ان کی مخالفت کی ہے اور تاریخ بغداد میں خطیب بغدادی کے اعداد و شمار کے مطابق ان کی تعداد ۴۰۰ ۲ سے بھی زیادہ ہے۔ المحلیٰ ابن حزم نے تو ان مسائل کو انتہائی تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ ان مجتہدین کرام نے قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ کا دروازہ کھول کر ایک نئی شریعت کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کا قرآن و سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور قرآن و سنت کے مقابلہ میں انھیں امور کو مصدر قرار دے دیا ہے اور اس طرح احکام اسلامی میں ایک نیا انقلاب پیدا ہو گیا ہے اور سب کا نام اسلام پڑ گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض نادان مسلم اور بعض دشمنانِ اسلام نے یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ اسلام ابتدا میں ناقص تھا اور اسے بعد میں مکمل کیا گیا ہے جیسا کہ یہودی مستشرق گولڈزیہر نے اپنی

کتاب "اسلام میں عقیدہ و شریعت کا ارتقاء" میں درج کیا ہے اور دوالیبی نے المدخل الیٰ اصول الفقہ" میں اشارہ کیا ہے۔

اور آخر کار اس رائے اور نام نہاد اجتہاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکتب خلافت کے بعض مجتہدین نے "شرعی حیلوں" کے نام سے ایسے احکام ایجاد کر دئے جن کا کسی قانون دنیا میں بھی جواز نہیں ہے اور جن سے انسانیت کی پیشانی شرم سے عرق آلود ہو جاتی ہے۔

(انھیں حیلوں میں ایک یہ بھی ہے کہ جس طرح مزدور سے سارا کام لینے کا اختیار ہے اسی طرح کرایہ کی عورت کو استعمال کیا جا سکتا ہے....)

اس سے بڑا حادثہ یہ ہے کہ ایسے ہی مجتہدین کی شان میں حدیثیں بھی تیار کر دی گئیں جیسا کہ خطیب بغدادی نے ابوہریرہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک شخص پیدا ہوگا جس کا نام نعمان اور کنیت ابوحنیفہ ہوگی اور وہ اس امت کا چراغ، اس امت کا چراغ، اس امت کا چراغ ہوگا۔ (تاریخ بغداد ۱۳/۳۳۵)

(اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے ـــــــ جوادی)

اب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ مصر میں غلاموں کے دور کے بادشاہ الملک الظاہر بیبرس البندقداری نے ۶۶۵ھ میں اجتہاد کا جو دروازہ بند کیا تھا ـــ وہ کوئی برا کام کیا تھا یا اچھا کام کیا تھا۔؟

مختصر یہ ہے کہ اجتہاد یعنی خود رائی کا دروازہ سلاطین و حکام نے کھولا تھا اور بعد میں پھر انھیں کے ہاتھوں بند ہو گیا اور آجتک بند پڑا ہے۔

ـــ لیکن مدرسۂ اہلبیتؑ کا مسئلہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے اس وقت تک لفظ اجتہاد کو استعمال نہیں کیا جب تک اس پر حکومتوں کی چھاپ لگی رہی اور اس سے قیاس اور استحسان کی بو آتی رہی۔ اور اس کے مقابلہ میں ہمیشہ لفظ فقہ و فقاہت استعمال کیا ہے جیسا کہ علامہ کشیؒ نے معرفۃ الرجال میں عنوان قائم کیا ہے۔

اصحاب امام باقرؑ و امام صادقؑ کے فقہاء اور پھر ان حضرات کے نام درج کیے ہیں جن کی وثاقت وصداقت پر تمام اہل مذہب کا اتفاق ہے اور ان میں افقہ الاوّلین چھ نفر

ہیں زرارہ، معروف بن خربوذ، برید العجلی، ابو بصیر الاسدی، فضیل بن یسار، محمد بن مسلم الطائفی۔ اور ان سب میں افقہ زرارہ تھے۔

اس کے بعد امام صادقؑ کے فقہا راصحاب کا تذکرہ کیا ہے اور متفق علیہ چھ افراد کا ذکر کیا ہے۔ جمیل بن دراج، عبداللہ بن سکان، عبداللہ بن بکیر، حماد بن عیسیٰ، ابان بن عثمان۔

اور آخر میں لکھا ہے کہ ابو اسحاق الفقیہ ثعلبہ بن میمون کا عقیدہ یہ ہے کہ ان سب میں افقہ جمیل بن دراج تھے

۔ اس کے بعد اصحاب امام کاظمؑ و امام رضاؑ کے فقہار کا ذکر کیا ہے اور چھ افراد کے نام درج کئے ہیں۔

۔ اس کے علاوہ شیخ صدوقؒ (متوفی ۳۸۱ھ) نے جب پہلی فقہی کتاب لکھی تو اس کا نام بھی "فقیہ من لا یحضرہ الفقیہ" رکھا کہ اس دور کے علمار لفظ اجتہاد سے گھبرایا کرتے تھے یہانتک کہ شیخ طوسیؒ نے کتاب مبسوط کے آغاز میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہمارے مخالف ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ جو قیاس اور اجتہاد کا مخالف ہے اس کے پاس استنباط احکام کا کوئی راستہ نہیں ہے"۔

یعنی مذہب شیعہ کی شہرت مخالفین اجتہاد کے نام سے تھی کہ اہلسنت اجتہاد کو قیاس کے معنی میں استعمال کیا کرتے تھے۔

۔ اس کے بعد ساتویں صدی کے قریب قیاسی اجتہاد کا دروازہ بند ہونے لگا تو دھیرے دھیرے یہ لفظ قابلِ استعمال ہو گیا اور علمار شیعہ نے اپنی واقعی جد و جہد کے اظہار کے لئے اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ابتدا میں اجازات کا تعلق صرف احادیث معصومینؑ سے تھا کہ استاد اپنے شاگرد کو احادیث معصومینؑ نقل کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ اس کے بعد اس کا دائرہ وسیع ہو کر کتب احادیث تک پہونچ گیا جہاں کتب احادیث سے روایات نقل کرنے کی اجازت دی جانے لگی اور اس کے بعد مزید وسیع ہو کر ہر اس کتاب تک پہونچ گیا جسے شاگرد نے استاد کے سامنے پڑھ دیا ہے یا استاد سے سُن لیا ہے اور اجازہ ایک طرح کی علمی سند شمار ہونے لگا۔

۔ انھیں اجازات کے درمیان وہ اجازہ بھی ہے جس میں سب سے پہلے آٹھویں صدی

میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور علامہ حلیؒ کے فرزند نے شیخ محسن بن مظاہر کو ۷۰۶ھ میں اجازہ دیتے ہوئے اپنے والد کو "شیخ الاسلام" اور "امام المجتہدین" کے لقب سے یاد کیا ہے۔
(بحار ۱۰۷/۲۱۵)

اور پھر شیخ علی النیلی نے ابن فہد کے اجازہ میں ۷۹۱ھ میں علامہ حلیؒ کے فرزند کی تعریف میں "خاتم المجتہدین" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (بحار ۱۰۷/۲۲۲-۲۲۵)

اس کے بعد درجۂ اجتہاد پر فائز ہو جانا عظیم ترین علمی سند شمار ہونے لگا جیسا کہ علامہ محمد باقر مجلسیؒ نے ۱۰۸۵ھ میں اپنے مولفات کا اجازہ علامہ خاتون آبادی کو عطا کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ درجۂ اجتہاد تک پہونچ گئے ہیں۔

اور اس طرح اجازہ اجتہاد کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو آجتک جاری ہے۔

لیکن بہرحال یہ صرف لفظی اشتراک ہے کہ دونوں مکاتب فقہ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے ورنہ مغز اور مفہوم کے اعتبار سے دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے اور ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اور شائد اسی اشتراک اسم کا نتیجہ تھا کہ بعض اخباری حضرات نے یہ خیال کر لیا کہ یہ لوگ مکتب قیاس کی طرف مائل ہو گئے ہیں یا اجتہاد واقعاً کوئی بڑی شے ہے جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے فقہاء اہلبیتؑ ہرگز ان قواعد واصول پر اعتبار نہیں کرتے ہیں جنھیں مدرسۂ خلافت نے ایجاد کیا ہے۔ ان کا تمامتر اعتماد کتاب وسنت پر ہے اور انھیں سے اپنے احکام کا استنباط کرتے ہیں اور انھیں کو قابلِ عمل تصور کرتے ہیں۔

(اگر کوئی پڑھا لکھا اور انصاف پسند انسان تاریخ کا مطالعہ کرے تو اسے اندازہ ہوگا کہ کتاب وسنت سے استنباط کی جدوجہد روز اول سے جاری تھی اور خود ائمہ معصومینؑ نے اپنے اصحاب کو اس امر کی تعلیم دی تھی اور اس کا حکم دیا تھا لیکن چونکہ عام مسلمانوں نے بلاجدوجہد خود رائی کے عمل کو بھی اجتہاد کا نام دے دیا تھا لہٰذا علماء شیعہ نے اپنے واسطے فقہ وفقاہت کا لفظ اختیار کیا جس کا استعمال قرآن مجید میں بھی ہوا ہے اور اُس دور کے لئے مناسب ترین نام یہی تھا کہ استنباط میں واقعی وہ جدّ وجہد نہیں تھی جو ابتدا ز زمانہ سے حالات کے بدل جانے کے بعد

پیدا ہوگئی ہے اور استنباط کا عمل اجتہادی عمل بن گیا ہے اور حُسن اتفاق سے اُدھر بساطِ اجتہاد لپیٹ دی گئی اور خود رائی کا سلسلہ بند ہوگیا۔ اب ضرورت تھی کہ استنباط کرنے والوں کی جد و جہد کو دیکھ کر پھر اس لفظ کو زندہ کیا جائے جو زمانہ کے تصرفات اور تغیرات سے بدنامی کے خانہ میں ڈال دیا گیا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اب فقاہت سے زیادہ اجتہاد کا لفظ عزیز ہوگیا کہ فقاہت میں علم دین شامل ہے لیکن علم دین کی جد و جہد شامل نہیں ہے اور آخری صدیوں میں یہ عمل علم سے زیادہ جہد علم پر مشتمل ہوگیا ہے لہٰذا اس کے لئے مناسب ترین نام اجتہاد ہی کا ہے جو واقعی اعتبار سے روز اول سے تھا اور لفظی اعتبار سے تقریباً ساتویں صدی سے شروع ہوا ہے۔ !)

[جوادی]

فصل چہارم

مدرسۂ اہلبیتؑ کے مصادرِ شریعت

قرآن وسنت

مدرسۂ اہلبیتؑ کے مصادر شریعت دریافت کرنے کے لئے ہم اسی مدرسہ کے مصادر و مآخذ کا جائزہ لیں گے جس طرح کہ مدرسۂ خلافت کے مصادر دریافت کرنے کے لئے ان کے صحیح مصادر و مآخذ پر اعتماد کیا تھا اور اپنے خیال میں یہی غیر جانبدار اور دیانتدار طریقۂ بحث ہے کہ ہر مکتب فکر کے افکار کو معلوم کرنے کے لئے اسی مکتب کے مصادر پر اعتماد کیا جائے اور دوسرے مکاتب فکر کے بیانات یا تشریحات پر اعتماد نہ کیا جائے۔

مذکورہ طریقۂ بحث کی بنیاد پر مدرسۂ اہلبیتؑ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مدرسہ میں اُس اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے جس کا اعتماد ذاتی رائے اور اپنے استحسان واستصلاح پر ہو بلکہ اس کا تمامتر اعتماد ان ارشادات اور احادیث پر ہے جو انھیں سرکار دو عالمؐ سے وراثت میں حاصل ہوئے ہیں اور جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

ائمہ اہلبیتؑ کا اعتماد ذاتی رائے پر نہیں ہوتا ہے

اصول کافی ۱/۵۸، وافی ۱/۵۹ میں یہ روایت ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے مسئلہ دریافت کیا۔ آپ نے اس کا جواب دے دیا تو اس نے کہا کہ اگر مسئلہ اس طرح ہوتا تو آپ کی رائے کیا ہوتی۔؟

فرمایا: "خاموش! میں نے جو جواب دیا ہے وہ رسول اکرمؐ کا حکم ہے۔ ہمارے احکام میں رائے کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔

ائمہ اہلبیتؑ کی سند

بصائر الدرجات میں امامؑ کا ارشاد ہے کہ ہم جب بھی کوئی جواب دیں تو اس کا مصدر رسول اکرمؐ ہوتے ہیں اور ہم اپنی رائے سے کوئی بات نہیں کرتے ہیں۔ (بصائر الدرجات تالیف محمد بن الحسن الصفار متوفی ۲۹۰ھ طبع ۱۲۸۵ھ ص ۳۰۱)

علامہ مجلسیؒ نے مرآۃ العقول میں اس روایت کی تشریح اس طرح کی ہے کہ سائل کا مقصد یہ تھا کہ آپ اس رائے کے بارے میں بتائیں جو آپ کے ذاتی خیال اور اجتہاد کا تقاضا ہے تو آپ نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا کہ ہم اہلبیتؑ ظن وخیال سے بات نہیں کرتے ہیں۔ ہمارا ہر حکم جزم ویقین کی بنیاد پر ہوتا ہے جس کا سلسلہ رسول اکرمؐ سے ملا ہوا ہے۔

بصائر الدرجات ص ۲۹۹ حدیث ۲ میں فضیل بن یسار نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ "ہم اگر اپنی رائے سے فتویٰ دیتے تو اسی طرح گمراہ ہو جاتے جس طرح دوسرے لوگ گمراہ ہو گئے ہیں۔ ہمارا حکم اس دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے جسے پروردگار نے اپنے نبیؐ کو بتایا ہے اور انھوں نے ہم لوگوں کو بتایا ہے۔"

بصائر الدرجات ص ۳۰۱ حدیث ۹ میں فضیل ہی نے امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے کہ "یہ ہمارے رب کا بیّنہ ہے جسے اس نے اپنے نبیؐ کو بتایا ہے اور انھوں نے ہم لوگوں سے بتایا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ہم لوگ بھی باقی لوگوں جیسے ہو جاتے۔"

— واضح رہے کہ فضیل بن یسار بنی نہد کے غلام اور امام باقرؑ وصادقؑ کے اصحاب میں تھے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور بعد میں بصرہ منتقل ہو گئے تھے۔ (قاموس الرجال ۷/۳۴۳)

بصائر الدرجات ص ۳۰۱ حدیث ۱ میں سماعہ نے ابوالحسنؑ سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت سے سوال کیا کہ آپ کے احکام کا مصدر کتاب وسنت ہے یا اپنی رائے سے ارشاد فرماتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ "ہمارا ہر بیان کتاب وسنت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔"

اہلبیتؑ میں توارث علوم

بصائرالدرجات میں داؤد بن ابی یزید الاحول کی روایت امام جعفر صادقؑ سے ہے کہ میں نے حضرت کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر ہم بھی اپنی رائے اور خواہش سے فتویٰ دیتے تو ہمارا شمار بھی ہلاک ہو جانے والوں میں ہو جاتا۔ ہمارے پاس یہ آثارِ رسولِ اکرمؐ ہیں جن کو ہم ایک کے بعد ایک وراثت میں حاصل کرتے ہیں اور اسی طرح محفوظ رکھتے ہیں جس طرح لوگ سونے چاندی کے خزانوں کا تحفظ کرتے ہیں۔ (بصائر ص ۲۹۹)

اسی کتاب میں محمد بن شریح سے تین اسناد کے ساتھ یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا کہ اگر اللہ نے ہماری اطاعت، مودت اور ولایت کو واجب نہ کر دیا ہوتا تو ہم تمھیں اپنے دروازہ پر کھڑا نہ کرتے اور نہ اپنے گھر میں داخل کرتے۔ خدا گواہ ہے کہ ہمارے بیانات کی بنیاد خواہش اور رائے نہیں ہے اور ہم وہی کہتے ہیں جو ہمارے پروردگار نے کہا ہے۔ ہمارے پاس یہ اصول ہیں جنھیں اسی طرح محفوظ رکھتے ہیں جس طرح لوگ سونے چاندی کے خزانے محفوظ رکھتے ہیں۔ (بصائرالدرجات ص ۳۰۰ - ۳۰۱ حدیث ۵، ۷، ۱۰)

احادیث ائمہ کی نسبت رسول اکرمؐ کی طرف

گزشتہ احادیث سے اس امر کی وضاحت ہو چکی ہے کہ ائمہ اہلبیتؑ کبھی اپنے احکام کو اپنی فکر اور رائے کا نتیجہ نہیں قرار دیتے تھے بلکہ ہر مسئلہ کو اپنے جد بزرگوار کے حوالہ سے بیان فرمایا کرتے تھے جس کے شواہد درج ذیل روایات میں پائے جاتے ہیں۔

۔ سماعہ بن مہران نے امام صادقؑ سے نقل کیا ہے کہ "پروردگار نے اپنے رسول کو حلال و حرام اور تاویل قرآن کا علم دے دیا تھا اور انھوں نے اسے حضرت علیؑ کے حوالہ کر دیا تھا۔"

(بصائرالدرجات ص ۲۹۰ باب تعلیم رسول اکرمؐ برائے امیرالمومنینؑ، وسائل طبع ۱۳۲۳ھ ۳۹۱/۳ حدیث ۱۹، مستدرک الوسائل طبع ۱۳۲۱ھ ۱۹۲/۳ حدیث ۲۸ از تفسیر عیاشی)

۔ ایسی ہی روایت حمران بن اعین نے چار اسناد کے ذریعہ نقل کی ہے اور ابو بصیر، ابوالاغر،

حماد بن عثمان سے بھی ایسی ہی روایت نقل کی گئی ہے۔ (بصائر الدرجات ص ۲۹۰-۲۹۲ حدیث حمران ۶، ۷، ۱۱، حدیث ابو بصیر ۸، حدیث ابو الاغر ۱۰، حدیث حماد ۱۲)

نوٹ: حدیث حمران ۶ میں وارد ہوا ہے کہ یہ رازدارانہ گفتگو رسول اکرمؐ اور امیر المومنینؑ کے درمیان طائف میں ہوئی ہے اور ابو حمزہ یا ابو الحسن حمران بن اعین الشیبانی تابعی ثقہ تھے جنھوں نے بقول "قاموس الرجال" امام باقرؑ اور امام صادقؑ دونوں سے روایت کی ہے۔

۔ یعقوب بن شعیب نے دو سندوں کے ساتھ امام جعفر صادقؑ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "اللہ نے رسول اللہ کو قرآن اور اس کے علاوہ تمام چیزوں کا علم دے دیا اور انھوں نے یہ تمام علوم حضرت علیؑ کے حوالہ کر دئے۔ (بصائر الدرجات ص ۲۹۰-۲۹۱ حدیث ۳، ۹)

۔ محمد الحلبی نے امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؑ کے پاس ان تمام چیزوں کا علم تھا جن کا علم رسول اللہ کے پاس تھا کہ اللہ نے جس چیز کی تعلیم رسول اکرمؐ کو دی آپ نے اس کا علم حضرت علیؑ کے حوالہ کر دیا۔ (بصائر الدرجات ص ۲۹۲ حدیث ۱۳)

(محمد الحلبی ابو جعفر بن علی بن ابی شعبہ ہیں جنھوں نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے اور انھیں کے دور میں انتقال کیا ہے — قاموس الرجال ۸/۲۷۶)

۔ سلیم بن قیس نے امیر المومنینؑ سے نقل کیا ہے کہ میں جب رسول اکرمؐ سے سوال کرتا تھا تو فوراً جواب دیتے تھے اور جب میرے سوالات ختم ہو جاتے تھے تو آپ خود بیان شروع کر دیتے تھے۔ کوئی آیت ایسی نہیں ہے جو دن میں یا رات میں نازل ہوئی ہو اور اس کا تعلق آسمان سے ہو یا زمین سے، دنیا سے ہو یا آخرت سے۔ جنت سے ہو یا جہنم سے، میدان سے ہو یا پہاڑ سے، روشنی سے ہو یا تاریکی سے۔ مگر یہ کہ رسول اکرمؐ نے مجھے بتا بھی دیا ہے اور لکھوا بھی دیا ہے میں نے سب لکھ لیا ہے اور آپ نے مجھے اس کی تاویل، تفسیر، محکم، متشابہ، خاص، عام، طریقۂ نزول، جائے نزول اور کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے سب سے باخبر کر دیا ہے اور میرے حق میں دعا کی ہے کہ خدا مجھے سب کا شعور اور حافظہ عنایت فرمائے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے نہ کسی آیت کو فراموش کیا ہے اور نہ اس کے محل نزول کو۔ (بصائر الدرجات ص ۱۹۸ حدیث ۳)

مذکورہ حدیث کی تائید ان تین احادیث سے ہوتی ہے جنھیں مدرسۂ خلافت کے محدثین نے

طبقات ابن سعد میں درج کیا ہے :

ا۔ محمد بن عمر بن علیؑ بن ابی طالب سے روایت ہے کہ حضرت علیؑ سے دریافت کیا گیا کہ اصحابِ رسولؐ میں سب سے زیادہ احادیث آپ کی کیوں ہیں ؟ تو فرمایا کہ میں جب رسول اکرمؐ سے سوال کرتا تھا تو وہ مجھے باخبر کرتے تھے اور جب خاموش ہوجاتا تھا تو خود ابتدا فرمادیتے تھے۔

ب۔ سلیمان احمسی نے اپنے والد کے حوالہ سے حضرت علیؑ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ خدا کی قسم کوئی ایسی آیت نازل نہیں ہوئی ہے جس کے بارے میں مجھے نہ معلوم ہو کہ کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کہاں نازل ہوئی ہے ؟ اور کس پر نازل ہوئی ہے ؟ ــ پروردگار نے مجھے باشعور دل اور رواں زبان عنایت فرمائی ہے۔

ج۔ ابوالطفیل کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ کتاب خدا کے بارے میں مجھ سے دریافت کرو مجھے ہر آیت کے بارے میں معلوم ہے کہ دن میں نازل ہوئی ہے یا رات میں۔ صحرا میں نازل ہوئی ہے یا پہاڑ پر۔ (طبقات ابن سعد حالات امام علیؑ ۲ ۲/۱۰۱ طبع یورپ)

نوٹ : اس سلسلہ کی پہلی حدیث احمد بن حنبل کی قلمی کتاب (فضائل علی بن ابی طالبؑ) میں بھی موجود ہے۔!

ــ بصائر الدرجات نے ص ۱۹۷ حدیث ۲ میں زید بن علی سے نقل کیا ہے کہ امیرالمومنینؑ نے فرمایا کہ میں اس وقت تک آرام نہیں کرتا تھا جب تک رسول اکرمؐ سے یہ نہ معلوم ہوجائے کہ جبرئیل امین آج کے دن کون سا حلال و حرام، سنت، امر، نہی۔ کس موضوع کے بارے میں اور کس شخص کے بارے میں پیغام لے کر آئے ہیں۔ لیکن جب میں نے باہر نکل کر بیان کیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے جب کہ دونوں الگ بھی ہوجایا کرتے تھے۔

میں نے زید سے اس اعتراض کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ رسول اکرمؐ روزانہ کے خدائی پیغامات کو محفوظ رکھتے تھے اور جب حضرت علیؑ سے ملاقات کرتے تھے تو روزانہ کی وحی کے تفصیلات بیان فرمادیا کرتے تھے۔

اس روایت کی تائید مدرسۂ خلافت کے مصادر سنن نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد کے روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں نسائی کے الفاظ یہ ہیں :

ا۔ عبد اللہ بن نجی کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ رسول اکرمؐ کے پاس میرا وہ مقام تھا جو کسی مخلوق کا نہیں تھا۔ میں آپ کے پاس روزانہ سحر کے وقت حاضر ہو کر عرض کرتا تھا کہ اے رسول خدا! آپ پر میرا سلام۔ اس کے بعد اگر آپ نے اشارہ کر دیا تو گھر واپس آجاتا تھا ورنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔

ب۔ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ رسول اکرمؐ کے پاس میری ایک ساعت مخصوص تھی جب میں آکر اجازت طلب کرتا تھا۔ اگر آپ نماز میں مشغول ہوتے تھے تو واپس آجاتا تھا ورنہ اجازت دے دیتے تھے اور حاضر ہو جاتا تھا۔

ج۔ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے کہ رسول اکرمؐ کے پاس میری ایک حاضری دن میں ہوتی تھی اور ایک رات میں۔ اور جب رات میں حاضر ہوتا تھا تو آپ اشارہ کر دیا کرتے تھے۔ (سنن نسائی ۱/۱۷۸ باب التنحنح فی الصلوٰۃ ۱/۱۷۸ میں مذکورہ تینوں روایات ہیں اور روایت ۳ سنن ابن ماجہ حدیث ۳۷۰ باب الاستیذان کتاب الادب میں بھی ہے اور روایت ۲ ۱/۷۰ احدیث ۸۴۵ کے طور پر نقل ہوئی ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں کہ میں ہر صبح حاضر ہوتا تھا۔ اگر آپ کنکھار دیتے تھے تو حاضر ہو جاتا تھا اور اگر خاموش رہتے تھے تو گھر میں داخل نہیں ہوتا تھا۔

روایت ۳ مسند ۱/۸۰ حدیث ۶۰۸ کے طور پر نقل ہوئی ہے۔ بخاری نے ابتدائی حصہ حذف کر کے آخری حصہ اپنی تاریخ ۴ ۲/۱۲۱ میں نجی کے حالات میں نقل کیا ہے)۔

رسول اکرمؐ کا روایات کو محفوظ کرنے کا حکم

امالی شیخ طوسیؒ، بصائر الدرجات، ینابیع المودۃ میں یہ روایت احمد بن محمد بن علی الباقرؑ کے حوالہ سے ان کے آبا و کرام سے منقول ہے کہ رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ میں جو کچھ بیان کرتا ہوں اسے لکھ لو۔ تو آپ نے عرض کی کہ حضور کیا آپ کو میرے بھول جانے کا اندیشہ ہے؟۔ فرمایا نہیں۔ میں نے پروردگار سے تمہارے حافظہ کے لئے دعا کی ہے۔ لیکن اپنے شرکار کے لئے محفوظ کر لو۔

آپ نے عرض کیا کہ یہ شرکار کون ہیں؟ فرمایا یہ تمہاری اولاد کے ائمہ ہیں جن کی برکت سے میری امت پر بارش ہوگی اور ان کی دعائیں مقبول ہوں گی اور خدا ان سے بلاؤں کو رد کرے گا اور ان پر آسمان سے رحمتوں کا نزول ہوگا۔

اس کے بعد حسنؑ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ یہ ان میں کا پہلا ہے اور حسینؑ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ یہ ائمہ اسی کی اولاد میں سے ہوں گے۔ (امالی شیخ ابوجعفر محمد بن الحسن، المتوفیٰ ۴۶۰ھ طبع مطبعۃ النعمان نجف اشرف ۱۳۸۴ھ ۲/۵۶۔ بصائر الدرجات ص ۱۲۷ روایت ابوالطفیل از امام محمد باقرؑ، ینابیع المودۃ شیخ سلیمان الحنفی متوفی ۱۲۹۴ھ ص ۲۰)

اسی نکتہ کی طرف خود امام علیؑ نے مقام مسکن کی گفتگو میں اشارہ کیا ہے جس کی روایت ابوارکہ نے اس طرح کی ہے کہ میں مقام مسکن میں حضرت علیؑ کے ساتھ تھا تو میں نے روایت بیان کی کہ علیؑ کو رسول اکرمؐ سے وراثت میں تلوار ملی ہے اور بعض لوگوں کا بیان ہے کہ سواری ملی ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ تلوار کے قبضہ میں ایک صحیفہ ملا ہے۔ اتنے میں آپ نکل آئے اور فرمایا کہ خدا کی قسم اگر موقع ہوتا اور مجھے اجازت مل جاتی تو میں سال بھر تک بیان کرتا رہتا اور ایک حرف کی تکرار نہ کرتا۔ خدا کی قسم میرے پاس بہت سے صحیفے ہیں اور ان میں ایک صحیفہ کا نام عبیطہ ہے جس سے زیادہ سخت کوئی شے عرب کے لئے نہیں ہے اور اس میں ۶۰ بڑے قبائل کا ذکر ہے جن کا دین خدا میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ (بصائر الدرجات ص ۱۴۹، ۱۵۹ حدیث ۱۵)

اس کے بعد یہ سارے صحیفے اولاد امیرالمومنینؑ میں ایک کے بعد ایک شخصیت کو بطور وراثت ملتے رہے جیسا کہ حسب ذیل روایات میں ذکر کیا ہے۔

۔ بصائر الدرجات میں جابر بن یزید سے روایت ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ میرے پاس ایک صحیفہ ہے جس کے اندر ۱۹ صحیفے ہیں جنھیں رسول اکرمؐ نے عطا فرمایا ہے۔ (بصائر ص ۱۴۴)

۔ فضیل بن یسار کا بیان ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ فضیل! ہمارے پاس کتاب علیؑ ہے جس کا طول ۷۰ ہاتھ ہے اور روئے زمین کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کی لوگوں کو ضرورت پڑے اور اس کا ذکر اس کتاب میں نہ ہو یہاں تک کہ خراش کے تاوان کا بھی ذکر ہے اور یہ کہہ کر انگوٹھے سے ہاتھ پر نشان بنا دیا۔ (بصائر الدرجات ص ۱۴۷)

۔ حمران بن اعین راوی ہیں کہ امام باقرؑ نے ایک بڑے گھر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس گھر میں ایک صحیفہ ہے جس کی لمبائی ستر ہاتھ ہے جسے رسول اکرمؐ نے املا فرمایا ہے اور حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ اگر لوگ ہمیں اپنا حاکم تسلیم کر لیں تو ہم صرف حکم الٰہی سے حکومت کریں گے اور اس صحیفہ سے ہرگز تجاوز نہیں کریں گے۔ (بصائرالدرجات ص ۱۴۳)

دوسری روایت کا فقرہ ہے کہ اگر ہماری حکومت قائم ہو جائے تو ہر مسئلہ میں ہم صرف سنت رسولؐ کو جاری کریں گے۔ (بصائرالدرجات ص ۱۶۴)

۔ عبداللہ بن میمون نے جعفر کے حوالہ سے ان کے والد بزرگوار کا یہ قول نقل کیا ہے کہ۔ کتاب علیؑ میں ہر وہ شے موجود ہے جس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یہانتک کہ خراش اور اس کے تاوان تک کا ذکر موجود ہے۔ (بصائرالدرجات ص ۱۶۴، ۱۶۸)

۔ محمد بن حکیم نے امام ابوالحسنؑ سے نقل کیا ہے کہ تم سے پہلے والے قیاس کی بنا پر ہلاک ہو گئے ہیں حالانکہ پروردگار نے اپنے پیغمبرؐ کو اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھایا ہے جب تک ہر اعتبار سے دین کامل نہیں کر دیا ہے اور حلال و حرام بیان نہیں کر دئے ہیں۔ تمام ضروریات کی وضاحت کر دی ہے تاکہ زندگی میں ان سے مدد لو اور ان کے بعد اہلبیتؑ سے مدد لو۔ یہ ایک صحیفہ ہے جو اہلبیتؑ کے پاس ہے اور اس میں خراش لگانے کا تاوان تک بیان کر دیا گیا ہے۔ ابو حنیفہ کا ظلم یہ تھا کہ وہ کہتا ہے کہ علیؑ نے یہ کہا ہے اور میں یہ کہہ رہا ہوں۔ (بصائر ص ۱۵۰)

نوٹ: ائمہ معصومینؑ نے اس کتاب علیؑ کا نام جسے رسول اکرمؐ نے املاء کیا تھا اور حضرت علیؑ نے لکھا تھا "جامعہ" رکھا ہے۔

ان حضرات نے ہمیشہ رائے اور قیاس سے برائت کا اعلان کیا ہے اور ہر مسئلہ میں اپنے جد بزرگوار کے بیان کا حوالہ دیا ہے جو جبرئیل کے ذریعہ بارگاہ الٰہی سے نازل ہوا ہے۔

کتاب الجفر اور مصحف فاطمہؑ

بعض روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ اہلبیتؑ کے پاس جامعہ کے علاوہ حضرت علیؑ کی وراثت میں دو کتابیں اور تھیں۔ ایک کا نام "الجفر" تھا جس میں کائنات کے حوادث کا ذکر

تھا اور ایک جناب فاطمہؑ کا مصحف تھا، جس میں حوادث کائنات کا ذکر تھا۔ تینوں کتابیں حضرت علیؑ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں جس کا ثبوت درج ذیل روایات سے ملتا ہے:

۔ بصائر الدرجات میں ابو مریم کا یہ بیان ہے کہ مجھ سے امام باقرؑ نے فرمایا کہ ہمارے پاس ایک جامعہ ہے جس کا طول ستر ہاتھ ہے اور اس میں خراش کا تاوان تک لکھا ہوا ہے۔ اسے رسول اکرمؐ نے املاء کیا ہے اور امیر المومنینؑ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ایک کتاب الجفر ہے جو کھال پر لکھی گئی ہے اور اس میں قیامت تک پیش آنے والے واقعات و حوادث کا ذکر ہے۔ (بصائر الدرجات ص ۱۶۰)

۔ بصائر الدرجات میں ایک سے زیادہ اسناد کے ساتھ امام صادقؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ جب آپ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے لئے کیا چھوڑا ہے اور حضرت علیؑ نے حضرت حسنؑ کے لئے کیا چھوڑا ہے تو آپ نے فرمایا کہ رسول اکرمؐ نے ہمارے پاس وہ سب چھوڑا ہے جس کی ضرورت پڑ سکتی ہے یہانتک کہ خراش اور ناخون کا حکم بھی موجود ہے اور جناب فاطمہؑ نے ایک مصحف چھوڑا ہے جو قرآن مجید کے علاوہ ہے۔ (بصائر الدرجات ص ۱۵۶)

۔ بصائر ہی میں ابان بن عثمان کے حوالہ سے علی بن الحسین سے اور ان کے واسطہ سے امام صادقؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ عبداللہ بن الحسن کا خیال ہے کہ ان کے پاس بھی وہی علم ہے جو لوگوں کے پاس ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ ان کے پاس اتنا ہی ہے لیکن ہمارے پاس جامعہ ہے جس میں تمام حلال و حرام کا ذکر ہے اور جفر ہے جس کے بارے میں عبداللہ بن الحسن کو یہ بھی خبر نہیں ہے کہ بکری کی کھال ہے یا بھیڑ کی کھال ہے۔ اور ہمارے پاس مصحفِ فاطمہؑ بھی ہے اور خدا گواہ ہے کہ اس میں اس قرآن کا کوئی ایک حرف نہیں ہے بلکہ وہ رسول اللہ کا املاء ہے جسے حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ عبداللہ کے پاس چاروں طرف سے لوگ سوال کرنے آگئے تو یہ بیچارے کیا کریں گے۔ (بصائر الدرجات ص ۱۵۷۔ ۱۵۸)

ائمہ اہلبیتؑ اور کتابوں کا تسلسل

بصائر الدرجات میں معلیٰ بن خنیس نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ مذکورہ تمام

کتابیں حضرت علیؑ کے پاس تھیں۔ جب آپ عراق جانے لگے تو ام سلمہ کے پاس امانت رکھوادی۔ آپ کی شہادت کے بعد یہ کتابیں امام حسنؑ کو ملیں۔ ان کے بعد امام حسینؑ کے ہاتھ میں آئیں، ان کے بعد حضرت علی بن الحسینؑ کو ملیں اور اس کے بعد میرے والد بزرگوار امام محمد باقرؑ کے پاس رہیں۔ (بصائر الدرجات ص ۱۶۲)

وراثت امام زین العابدینؑ بالخصوص

غیبت شیخ طوسیؒ۔ مناقب، ابن شہر آشوب اور بحار میں فضیل سے روایت ہے کہ مجھ سے امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ جب امام حسینؑ نے عراق کا رخ کیا تو اپنی وصیت اور تمام کتابیں جناب ام سلمہ کے حوالہ کر دیں اور فرمایا کہ جب میرا فرزند اکبر واپس آئے تو اس کے حوالہ کر دیجیے گا۔ آپ کی شہادت کے بعد جب امام علیؑ بن الحسین واپس آئے تو ام سلمہ نے تمام امانتیں ان کے حوالہ کر دیں۔ (غیبۃ طوسیؒ طبع تبریز ۱۳۲۳ھ، مناقب ابن شہر آشوب ۴/۱۷۴، بحار ۴۶/۱۸ حدیث ۳)

۔ کافی۔ اعلام الوریٰ، مناقب ابن شہر آشوب اور بحار میں "بالفاظ کافی" ابو بکر حضرمی کے حوالہ سے امام صادقؑ سے روایت ہے کہ جب امام حسینؑ نے عراق کا سفر کیا تو تمام کتب اور وصیت جناب ام سلمہ کے پاس امانت رکھوادیں اور انھوں نے حضرت علیؑ بن الحسینؑ کی واپسی پر ان کے حوالہ کر دی۔ (اصول کافی ۱/۳۰۴، اعلام الوریٰ ص ۱۵۲، بحار ۴۶/۱۶، مناقب ابن شہر آشوب ۴/۱۷۲)

وراثت امام محمد باقرؑ بالخصوص

۔ کافی۔ اعلام الوریٰ، بصائر الدرجات اور بحار میں یہ روایت "بالفاظ کافی" یوں ہے کہ عیسیٰ بن عبد اللہ نے اپنے والد اور دادا کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؑ بن الحسینؑ نے وقت آخر اپنے فرزند کی طرف نگاہ کی اور پھر محمدؑ بن علیؑ سے فرمایا کہ محمد! اس صندوق کو اپنے گھر لے جاؤ۔ اس میں درہم و دینار نہیں ہیں لیکن یہ علم سے بھرا ہوا ہے۔ (اصول کافی ۱/۳۰۵ حدیث ۲، اعلام الوریٰ ص ۲۶۰، بصائر الدرجات باب ۱۰ ص ۴۴، بحار ۴۶/۲۲۹

حدیث نمبر ۱، وافی ۲/۸۲)

۔۔ بصائر الدرجات اور بحار میں عیسیٰ بن عبداللہ بن عمر کے وسیلہ سے حضرت جعفر بن محمد الصادقؑ سے روایت ہے کہ جب حضرت علیؑ بن الحسینؑ کا وقت آخر آیا تو آپ نے ایک صندوق نکلوایا اور اپنے فرزند محمدؑ بن علیؑ سے فرمایا کہ اسے اپنے گھر لے جاؤ۔ آپ چار افراد کے درمیان اس صندوق کو لے آئے لیکن حضرت کے انتقال کے بعد برادران نے دعویٰ کر دیا کہ ہمیں بھی حصہ ملنا چاہیئے۔ امام باقرؑ نے فرمایا کہ اس میں تمہارا حصہ نہیں ہے ۔۔۔ ورنہ پدر بزرگوار مجھے نہ دیتے۔ اس کے بعد کھولا گیا تو اس میں رسول اکرمؐ کے اسلحہ اور آپ کی کتابیں تھیں اور بس! ۔۔ (اصول کافی ۱/ ۳۰۵ حدیث نمبر ۱، وافی ۲/۸۲، بصائر الدرجات جلد سیوم باب نمبر ۴ ص ۱۶۵، اعلام الوریٰ ص ۲۶۰، بحار ۴۶/ ۳۲۹)

وراثت امام جعفر صادقؑ بالخصوص

۔ بصائر الدرجات میں زرارہ کے حوالہ سے امام صادقؑ کا یہ ارشاد درج ہے کہ امام باقرؑ دنیا سے نہیں گئے جب تک کہ تمام کتابیں میرے حوالہ نہیں کر دیں۔ (بصائر الدرجات ص ۱۵۸، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۶)

۔ اسی کتاب میں ابو بصیر کی روایت ہے کہ میں نے امام صادقؑ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ امام ابو جعفرؑ کا انتقال نہیں ہوا یہاں تک کہ میں نے مصحفِ فاطمہؑ ان سے حاصل کر لیا۔

(بصائر الدرجات ص ۱۵۸)

۔ تیسری روایت عنبسہ بن العابد سے ہے کہ ہم لوگ امام صادقؑ کے ابن عم حسین کے پاس تھے کہ محمد بن عمران نے آکر کتاب ارض کا تقاضا کیا تو انھوں نے کہا کہ میں حضرت جعفر صادقؑ سے اجازت لے لوں؟ ۔ انھوں نے کہا کہ ان سے کیا تعلق ہے؟ فرمایا یہ کتاب پہلے امام حسنؑ کے پاس تھی۔ پھر امام حسینؑ کو ملی پھر حضرت علیؑ بن الحسینؑ کو ملی۔ پھر حضرت محمدؑ بن علیؑ کے پاس رہی۔ پھر حضرت جعفرؑ کے پاس آئی اور میں نے انھیں سے نقل کیا ہے۔

بصائر الدرجات ص ۱۶۵، ۱۶۶)

۔ کافی اور بصائر الدرجات میں حمران کے حوالہ سے امام باقرؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ میں نے حضرت سے اس روایت کے بارے میں دریافت کیا کہ جناب ام سلمہ کو مہر شدہ صحیفہ کونسا دیا گیا تھا؟ ۔ تو آپ نے فرمایا کہ رسول اکرمؐ کے بعد حضرت علیؑ کو وراثت میں علم اور اسلحہ ملا۔ اس کے بعد امام حسنؑ تک پہونچا۔ پھر امام حسینؑ کو ملا اور جب اس کے لٹ جانے کا خطرہ پیدا ہوا تو آپ نے بطور امانت ام سلمہ کے پاس رکھوا دیا اور ان سے حضرت علیؑ بن الحسینؑ کو ملا۔ میں نے عرض کی کہ ان سے آپ کے پدر بزرگوار کو ملا اور پھر آپ تک پہونچا؟ ۔ فرمایا، بے شک!۔ (کافی کتاب الحجۃ ۳/ ۴۸، وافی ۲/ ۱۳۳، بصائر الدرجات ص ۱۷۷، ۱۸۶، ۱۸۸)

وراثت امام موسیٰ بن جعفر بالخصوص

۔ غیبت نعمانی اور بحار میں حماد صائغ کی روایت ہے کہ میں نے مفضل بن عمر کو امام صادقؑ سے سوال کرتے سُنا ہے ۔ یہاں تک کہ ابو الحسن موسی کاظمؑ نکل آئے تو امام صادقؑ نے فرمایا کہ صاحب کتابِ علیؑ کو دیکھنا چاہتے ہو۔ مفضل نے عرض کی کہ اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے؟ فرمایا وہ یہی صاحب کتابِ علیؑ ہے۔ (غیبۃ النعمانی ص ۱۷۷، بحار ۴۸/ ۲۲)

وراثت امام علی بن موسیٰ الرضاؑ بالخصوص

۔ علی بن یقطین سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت ابو الحسن الکاظمؑ نے فرمایا کہ یا علیؑ! یہ میری اولاد کا سب سے بڑا فقیہ ہے اور میں نے اسے تمام کتابیں سپرد کر دی ہیں۔ اور یہ فرماتے ہوئے حضرت رضاؑ کی طرف اشارہ فرمایا۔

دوسری روایت میں ہے کہ میں نے امام کاظمؑ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ میرا فرزند علیؑ میری تمام اولاد کا سرزار ہے اور اسے میں نے تمام کتابیں دے دی ہیں۔ (بصائر الدرجات ص ۱۶۴ حدیث ۷، ۸، ۹ تین اسناد کے ساتھ، ارشاد مفید ص ۲۸۵ میں کتب کے بجائے کنیت کا لفظ ہے، وافی ۲/ ۸۶)

۔ کافی۔ ارشاد مفیدؒ، غیبت شیخ طوسیؒ اور بحار میں نعیم القابوسی کے حوالے سے امام

موسیٰ کاظمؑ سے روایت ہے کہ میرا فرزند علیؑ میرا فرزند اکبر ہے اور سب سے زیادہ نیک کردار اور میری نگاہ میں محبوب ہے۔ وہ میرے ساتھ کتاب الجفر میں نگاہ کرتا ہے جسے نبی اور وصی کے علاوہ کوئی نہیں دیکھ سکتا ہے۔ (اصول کافی ۱/ ۳۱۱ - ۳۱۲ حدیث نمبر ۲، ارشاد مفیدؒ ص ۲۸۵۔ ۲۸۶، غیبۃ الشیخ الطوسیؒ ص ۲۸، وافی ۲/ ۸۳)

۔ رجال کشی اور بحار میں نصر بن قابوس سے روایت ہے کہ میں امام کاظمؑ کے گھر میں تھا جب آپ نے اپنے فرزند امام رضاؑ کو دکھلایا کہ وہ جفر کا مطالعہ کر رہے ہیں اور فرمایا کہ یہ میرا فرزند علیؑ ہے اور یہ جفر کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ (رجال کشی ص ۳۸۲، بحار ۴۹/ ۲۷ حدیث نمبر ۴۶)

اسی طرح ائمہ اہلبیتؑ ان کتابوں کو ایک دوسرے کی وراثت میں حاصل کرتے رہے اور ہر دور میں ان سے علوم و احکام کا استنباط کرتے رہے۔

تبدیلیٔ سنت پر امام علیؑ کی فریاد

افسوس کہ ائمہ اہلبیتؑ ہر دور میں اسقدر بھی امکانات نہیں رکھتے تھے کہ رسول اکرمؐ کے واقعی احکام کا اظہار اور مدرسۂ خلافت کے احکام کی حقیقت کا اعلان کر سکیں۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ فرماتے رہے کہ میرے پدر بزرگوار فتویٰ دیتے ہوئے گھبراتے تھے اور ہم بھی باز اور صقر کے شکار کے بارے میں تنقید کرتے ہوئے خوفزدہ رہتے تھے لیکن اب وہ خوف نہیں رہ گیا ہے لہٰذا صاف اعلان کر رہے ہیں کہ ان کا شکار ذبیحہ کے بغیر حلال نہیں ہو سکتا ہے جیسا کہ کتاب علیؑ میں لکھا ہے کہ جن جوارح کا شکار حلال ہے اس سے مراد کتے ہیں۔ (کافی ۶/ ۲۰۷، تہذیب ۹/ ۳۳، وسائل ۱۶/ ۲۰۷)

واضح سی ہے کہ امام صادقؑ کا یہ ارشاد کہ اب خوف نہیں رہ گیا ہے اور کتاب علیؑ کے احکام بعینہ بیان کیے جا سکتے ہیں۔ اس دور کا قصہ ہے جب بنی امیہ کا اقتدار ختم ہو رہا تھا اور بنی عباس برسر اقتدار نہیں آئے تھے ورنہ اس سے پہلے ائمہ معصومینؑ کے لیے ممکن نہ تھا کہ مدرسۂ خلفاء کے خلاف کوئی حکم بیان کر سکیں۔ صرف امیر المومنینؑ کا مختصر سا دور خلافت تھا جس میں بعض احکام اسلامی کی وضاحت کر دی گئی اور اسی کے نتیجہ میں مدرسۂ امامت اور مدرسۂ خلافت کا اختلاف کھل کر سامنے

آگیا جیسا کہ کافی، احتجاج، وسائل، مستدرک وسائل میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور نہج البلاغہ میں بھی اس کا مختصر اشارہ پایا جاتا ہے۔

کافی کے الفاظ میں سلیم بن قیس کا بیان ہے کہ میں نے امیرالمومنینؑ سے عرض کی کہ میں اکثر سلمان، مقداد اور ابوذر سے وہ تفسیر قرآن اور احادیث رسول اکرمؐ سنتا ہوں جو عام لوگوں کی تفسیر و حدیث سے بالکل مختلف ہوتی ہے اور آپ حضرات کا فرمان ہے کہ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے سب غلط ہے تو کیا آپ کے خیال میں لوگوں نے رسول اکرمؐ پر افترا کیا ہے اور قرآن کی تفسیر بالرائے کی ہے؟

تو آپ نے فرمایا کہ جب تم نے سوال کر لیا ہے تو اب جواب بھی سنو۔ لوگوں کے ہاتھوں میں حق و باطل، صدق و کذب، ناسخ و منسوخ، عام و خاص، محکم و متشابہ اور اصل و نقل سب کچھ ہے اور افترا تو رسول اکرمؐ کی زندگی ہی سے شروع ہو گیا تھا یہاں تک کہ آپ نے منبر پر آکر فرمایا کہ میرے خلاف غلط بیانیاں بہت ہو رہی ہیں لہٰذا یاد رکھو کہ جو میری طرف غلط بات منسوب کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

لیکن آپ کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور یاد رکھو کہ حدیث بیان کرنے والے چار طرح کے افراد ہیں اور ان کی پانچویں کوئی قسم نہیں ہے:

۱۔ وہ شخص منافق جو ایمان کا اظہار کرتا تھا اور اسے جھوٹ بولنے میں کوئی تکلّف نہیں تھا۔ لوگوں کو اس کے نفاق کا علم ہو جاتا تو ہرگز اس کی بات قبول نہ کرتے لیکن وہ تو یہی دیکھتے رہے کہ یہ صحابیٔ رسول ہے اور اس نے حضور کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سُنی ہیں اور انھیں سے اخذ کیا ہے۔ انھیں کیا خبر کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ خود پروردگار نے بھی منافقین کی مکاری کے بارے میں بیان کیا ہے کہ ان کے اجسام اچھے لگتے ہیں اور ان کی باتیں سننے کے لائق ہوتی ہیں۔

ان بے دینوں نے رسول اکرمؐ کے بعد ائمۂ ضلالت سے تقرّب حاصل کیا اور کذب و بہتان کے ذریعہ دنیا کماتے رہے۔ حکّام نے انھیں والی بنایا، لوگوں کی گردنوں پر مسلّط کیا اور دنیا حاصل کرتے رہے اور لوگ تو عام طور سے اپنے حکام اور رؤسار کے ساتھ ہی رہتے ہیں جب تک کہ خدا اس شر سے نہ بچالے۔

دوسری قسم۔ ان لوگوں کی ہے جنھوں نے رسول اکرمؐ سے سنا لیکن صحیح مفہوم نہ سمجھ سکے۔ ان کا مقصد غلط بیانی نہیں تھا لیکن اپنی روایات کو یہ کہہ کر بیان کرتے رہے کہ ہم نے رسول اکرمؐ سے سُنا ہے اور لوگ قبول کرتے رہے حالانکہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ انھوں نے غلط فہمی سے کام لیا ہے تو ہرگز قبول نہ کرتے۔

تیسری قسم۔ ان افراد کی ہے جنھوں نے حدیث کا ایک رُخ سُنا اور دوسرے رُخ سے بے خبر رہے۔ انھوں نے امر کو سُنا اور بعد کی نہی سے بے خبر رہے یا منسوخ کو سُنا اور ناسخ سے باخبر نہ ہو سکے کہ اگر مسلمانوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے تو وہ ہرگز عمل نہ کرتے لیکن وہ بے خبر ہی رہ گئے اور عمل جاری رہا۔

چوتھی قسم۔ ان لوگوں کی ہے جنھوں نے غلط بیانی نہیں کی اور غلط بیانی سے انھیں نفرت رہی۔ ان کے دلوں میں خوفِ خدا اور احترامِ رسولؐ تھا۔ وہ سہو و نسیان کا بھی شکار نہیں ہوئے اور جو کچھ جیسے سُنا ویسے ہی محفوظ رکھا۔ نہ کوئی کمی کی اور نہ زیادتی۔ انھیں ناسخ و منسوخ کا بھی علم تھا اور صرف ناسخ پر عمل کرتے تھے۔ منسوخ پر نہیں۔

یاد رکھو کہ رسول اکرمؐ کے ارشادات بھی مثل قرآن کریم ہیں کہ ان میں ناسخ و منسوخ، عام و خاص اور محکم و متشابہ سب کچھ ہیں۔ آپ کے ارشادات کے دو رُخ ہوتے تھے کبھی عام کبھی خاص اور پروردگار نے حکم دے دیا تھا کہ جو کچھ رسول دیدیں اسے لے لینا اور جس چیز سے روک دیں اس سے رُک جانا۔ لیکن اکثر لوگوں پر یہ نکتہ مشتبہ ہو جاتا تھا کہ یہ کلام خاص ہے یا عام۔ اور لوگوں میں آپ سے دریافت کرنے کا دم بھی نہیں تھا اور اکثر لوگ تو اس انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی اعرابی، صحرائی آکر آپ سے مسئلہ دریافت کرے تو ہم بھی سُن لیں یا سمجھ لیں۔

صرف میں تھا جو روزانہ صبح و شام دو مرتبہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا تھا۔ تمام اصحابِ رسولؐ کو اس حقیقت کا علم ہے کہ آپ نے میرا جیسا برتاؤ کسی کے ساتھ نہیں کیا۔ اکثر آپ میرے گھر بھی تشریف لاتے تھے لیکن جب میں آپ کے گھر حاضر ہوتا تھا تو ازواج کو ہٹا دیتے تھے اور صرف مجھ سے باتیں کرتے تھے اور جب میرے گھر

تشریف لاتے تھے تو نہ فاطمہؑ کو ہٹاتے تھے اور نہ حسنؑ و حسینؑ کو۔ میں کوئی سوال کرتا تھا تو جواب دیتے تھے اور میرے سوالات ختم ہو جاتے تھے تو خود بیان شروع کر دیتے تھے۔ کوئی آیت قرآن ایسی نہیں ہے جسے آپ نے مجھے سنا کر لکھوا نہ دیا ہو اور پھر اس کی تفسیر، تاویل، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ اور خاص و عام سے باخبر نہ کر دیا ہو اور پھر میرے حق میں حافظہ کی دعا بھی فرمائی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں نے کسی آیت یا کسی علم کو فراموش نہیں کیا ہے اور آپ نے بھی مجھے بتانے میں کسی حلال و حرام، امر و نہی، ماضی و مستقبل، کتاب منزل کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور سب بتا کر محفوظ کرا دیا ہے کہ میں نے ایک لفظ بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ آپ نے میرے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دعا کی تھی کہ خدایا اس دل کو علم و فہم اور حکمت و نور سے بھر دے اور میں نے عرض کیا تھا کہ حضور میں نے آجتک تو کوئی حرف فراموش نہیں کیا ہے۔ اب کیا مستقبل میں ایسا خطرہ ہے جو یہ دعا فرما رہے ہیں؟ فرمایا تمھارے بارے میں نہ کسی جہالت کا خوف ہے اور نہ نسیان کا۔ (کافی ۱/۶۲-۶۳، وسائل طبع قدیم ص ۳۹۴ حدیث نمبر ۱، مستدرک ۱/۳۹۳، احتجاج طبرسی ص ۱۳۴، تحف العقول ص ۱۳۱-۱۳۲، وافی ۱/۶۳، مرآۃ العقول ۱/۲۱۵)

نوٹ: اس مضمون کا ایک حصہ نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۲۰۵ میں بھی پایا جاتا ہے۔

امیر المومنینؑ کی اپنے اصحاب کے ساتھ اور دیگر ائمہ اہلبیتؑ کی اپنے ساتھیوں کیساتھ گفتگو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ آپ حضرات کی تفسیر و حدیث عامۃ الناس کی تفسیر و حدیث سے بالکل مختلف تھی اور اس کا تاریخی سبب یہ تھا کہ ابتدا کے تینوں خلفا نے نشر احادیث رسولؐ پر پابندی عائد کر رکھی تھی اور تمیم داری۔ راہب نصرانی۔ کعب الاحبار جیسے لوگوں کو اسرائیلیات کے نشر کرنے کی کھلی چھوٹ مل گئی تھی اور صحابہ کرام نے ان کے بیانات کو عام مسلمانوں میں منتشر کر دیا تھا اور اس طرح مہملات کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔

امام علیؑ اور ان کے مخلصین سلمان، ابوذر، عمار، مقداد جیسے افراد نے بہت کوشش کی کہ احادیث رسولؐ اور سیرت سرکار کو نشر کریں لیکن انھیں مدرسہ خلافت کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور بعض افراد کو تو شدید مصائب اور در بدری سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

پھر خود حضرات خلفا بھی اپنی سیاست کی بنیاد پر بیشمار احادیث اور تعلیماتِ پیغمبرِ اسلامؐ کو مسخ کر چکے تھے جس کا نام بعد میں اجتہاد رکھ دیا گیا اور اس غلاف میں سارا مواد جمع ہو گیا۔

امام علیؑ نے حکومت پانے کے بعد بہت چاہا کہ سنت رسولؐ کا احیار کریں اور سنت خلفاء کا خاتمہ کریں لیکن حالات نے اجازت نہ دی اور خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جس کی تفصیل خود آپ کے الفاظ میں یہ ہے :

"فتنوں کی ابتدا چند خواہشات اور بدعتی احکام سے ہوتی ہے جنھیں لوگ اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے ذریعہ حکم خدا کی مخالفت کی جاتی ہے اور لوگ ایک دوسرے پر مسلط کر دیے جاتے ہیں کہ اگر حق خالص رہ جاتا جب بھی کوئی اختلاف نہ ہوتا اور اگر باطل خالص رہ جاتا تو بھی صاحبانِ عقل پر مخفی نہ رہتا لیکن ستم یہ ہوتا ہے کہ ایک حصہ ادھر سے لیا جاتا ہے اور ایک ادُھر سے پھر دونوں کو مخلوط کر کے مشتبہ بنا دیا جاتا ہے اور شیطان اپنے ساتھیوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور سوائے مخلصین کے کوئی نجات پانے والا نہیں ہوتا ہے۔

میں نے خود رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اس وقت تم لوگوں کا کیا عالم ہوگا جب ایسے فتنے مسلّط ہو جائیں گے جن میں بچّے جوان ہو جائیں گے اور جوان بوڑھے ہو جائیں گے، لوگ انھیں فتنوں پر چلتے رہیں گے اور انھیں کو سنت رسولؐ کا درجہ دے دیں گے کہ اگر کوئی شخص بدلنا بھی چاہے گا تو کہیں گے تم سُنّت کو بدلنا چاہتے ہو اور اس طرح بلائیں سخت ہو جائیں گی اور اور اولاد کو قیدی بنا لیا جائے گا اور لوگ فتنوں کی چکّی میں پیس دیے جائیں گے۔ غیر خدا کے لئے علم دین حاصل کریں گے اور غیر عمل کے لئے عالم بنیں گے۔ آخرت کے اعمال انجام دیں گے اور مقصد حصول دنیا ہوگا۔

اس کے بعد آپ نے اپنے گرد و پیش کے افراد پر نظر ڈالی جن میں گھر والے، خواص اور مخلصین سب تھے اور فرمایا کہ میرے قبل کے حکام نے قصداً رسول اکرمؐ کے احکام کے خلاف عمل کیا ہے اور آپ کے عہد کو توڑ کر آپ کی سنت کو تبدیل کر دیا ہے لیکن اگر میں ان بدعتوں کو ترک کرنے اور قوم کو عہد رسولؐ کی طرف پلٹانے کی کوشش کروں گا تو خود میرا لشکر بھی مجھے چھوڑ دے گا اور میں تنہا رہ جاؤں گا یا میرے ساتھ صرف چند شیعہ رہیں گے جو میرے فضل اور خدا و رسولؐ کی طرف

سے میری اطاعت کے فرض ہونے کا علم رکھتے ہیں۔

سوچو۔! اگر میں مقام ابراہیم[1] کو پلٹا کر اس جگہ لے جاؤں جہاں عہدِ رسولؐ میں تھا۔ اگر میں فدک[2] کو وارثانِ فاطمہؑ کے حوالہ کر دوں۔ اگر میں صاعؑ[3] کا وہی وزن مقرر کر دوں جو دورِ رسولؐ میں تھا۔ اگر میں رسول اکرمؐ کی دی ہوئی جاگیروں[4] کو لوگوں کے حوالہ کر دوں جو محروم کر دیئے گئے ہیں۔ اور جعفر کا مکان[5] ان کے ورثہ کو دے دوں اور مسجد کا وہ حصہ منہدم کر دوں۔ اگر میں ظلم و جور کے ساتھ کئے گئے فیصلوں کو بدل دوں اور عورتوں کو ان کے نئے شوہروں[6] کے پہلو سے اٹھا کر اصلی شوہروں کے حوالہ کر دوں۔ اگر میں بنی تغلب کی ذریت[7] کو غلام و کنیز بنا لوں

---

[1] یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ مقام ابراہیمؑ پہلے دیوار کعبہ سے متصل تھا۔ عمر نے اسے اپنی جگہ سے ہٹا دیا ہے جیسا کہ طبقات ابن سعد طبع بیروت ۲۸۴/۳، تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۱۳۷، فتح الباری باب موافقات عمر ۲۳۶/۹، تاریخ کامل حوادث ۱۸ھ طبع یورپ ۳۹۴/۲ و طبع مصر ۲۱۷/۲ میں مذکور ہے۔

[2] قصۂ فدک کی تفصیل حصہ اول میں بیان کی جا چکی ہے۔

[3] نہایہ ابن اثیر کے مطابق صاع چار مُد ہوتا ہے اور مُد شافعی اور فقہاء حجاز کے نزدیک عراقی رطل کے حساب سے ۱⅓ ہوتا ہے اور ابو حنیفہ کے نزدیک مُد دو رطل ہوتا ہے اور اس طرح صاع کل ۵⅓ رطل ہوگا یا آٹھ رطل ہوگا جب کہ فقہ اہلسنت میں امام باقرؑ کی روایت کی بنا پر مدینہ کے ۶ رطل اور عراق کا ۹ رطل ہوتا ہے جیسا کہ کتاب الخلاف میں زرارہ سے نقل کیا گیا ہے۔

[4] تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۱۳۷ میں ہے کہ عمر نے مسجد رسولؐ میں توسیع پیدا کی تو بہت سے مکانات بھی توڑ کر شامل کر لئے۔

[5] یہ عمر کے ان فیصلوں کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے میراث میں عول اور تعصیب کا قانون جاری کر دیا۔ چور کے ہاتھ کلائی سے کاٹ دئے جب کہ حضور نے منع فرمایا تھا۔ ایک مجلس میں تین طلاق کا قانون ایجاد کر دیا جسے اولیات عمر میں شمار کیا جاتا ہے۔

[6] جن عورتوں کو بغیر گواہ کے طلاق دے دی گئی ہے یا غیر طہارت کی حالت میں طلاق دے دی گئی ہے جو اسلام میں ایک کھلی ہوئی بدعت ہے۔

[7] عمر نے ان لوگوں سے جزیہ کو اٹھا لیا کہ اہل ذمہ نہیں ہیں اور انھیں غلام و کنیز کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور سرزمین خیبر کو اس کی اصلی حالت پر پلٹا دوں ـــــــــ اگر میں عطایا کے دفتر پھاڑ[۱] کر پھینک دوں اور رسول اکرمؐ کی طرح مساویانہ تقسیم شروع کر دوں ـ اگر میں زمینی پیمائش کو نظر انداز[۲] کر کے رسول اکرمؐ کے دور کے مطابق شادیوں[۳] کا نظام رائج کر دوں ـ اگر میں خمس[۴] کے فریضہ کو صحیح انداز سے رائج کر دوں ـ اگر میں مسجد رسولؐ کو اصلی حالت پر پلٹا دوں

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

جیسا کہ علامہ بغوی نے نقل کیا ہے کہ عمر بن الخطاب نے نصاریٰ عرب سے جزیہ لینا چاہا تو انھوں نے کہا کہ ہم عرب ہیں عجم جیسا جزیہ نہیں دے سکتے ہیں۔ ہم سے مسلمانوں جیسی زکوٰۃ لے لی جائے۔ تو عمر نے کہا کہ زکوٰۃ کا قانون مسلمانوں کے لئے ہے ـ ان لوگوں نے کہا کہ کچھ زیادہ لے لیا جائے اور اس طرح سودا طے ہو گیا۔

[۱] عمر کی ایک بدعت یہ بھی تھی کہ انھوں نے زراعت، صنعت اور تجارت والوں پر خراج فرض کر دیا تھا اور اس کا مصرف اہل علم، اصحاب ولایت، اصحاب ریاست اور لشکر کو قرار دے دیا تھا اور اسے زکوٰۃ کی طرح واجب کر دیا تھا اور اس کا ایک رجسٹر بنا کر سب کے نام درج کر دئے تھے اور ایک شخص کو صاحب الدیوان بنا کر معین کر دیا تھا جسے خراج میں سے تنخواہ دی جاتی تھی اور اس خراج کی تقسیم بھی غیر مساویانہ ہوتی تھی جب کہ ان باتوں کا دورِ رسولِ اکرمؐ یا عہدِ ابو بکر میں کوئی ذکر نہ تھا۔

[۲] یہ بھی عمر کی ایک بدعت تھی کہ انھوں نے فرمایا کہ ارباب املاک سے ۱/۱۰ یا ۱/۲۰ کے بدلے درہم لے لئے جائیں چنانچہ اپنے نمائندوں کو بھیج کر زمینوں کی پیمائش کرائی اور فارس کے بادشاہوں کی طرح ہر جریب پر ایک درہم اور ایک قفیز غلہ طے کر دیا۔ مصر کے اطراف میں ایک دینار اور ایک اردب طے کر دیا تو سلاطین اسکندریہ کیا کرتے تھے جب کہ بغوی وغیرہ نے رسول اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے عراق کے درہم و قفیز، شام کے دینار و مُد اور مصر کے دینار و اردب کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اردب مصر میں ساٹھ من کا ہوتا تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد خود پیمائشی نظام ہے جو عمر نے رائج کیا تھا اور سب سے پہلے یہ کام کو فہ میں انجام پایا تھا۔

[۳] یہ اشارہ ہے کہ رسول اکرمؐ ہر معقول آدمی کو قابل شادی قرار دیتے تھے اور اسی لئے آپ نے اپنی چچازاد بہن کا عقد مقداد سے کر دیا تھا لیکن عمر کی نگاہ میں عرب عورت کا عقد عجم مرد سے نہیں ہو سکتا تھا۔

[۴] یہ اشارہ ہے کہ عمر نے خمس میں ذوی القربیٰ کے حق کا یکسر خاتمہ کر دیا تھا۔

اور نئے دروازوں کو بند کر کے[1] پرانے دروازوں کو کھول دوں ۔ اگر میں موزہ پر مسح[2] کو حرام کر دوں ۔ اگر میں نبیذ پینے[3] پر حد جاری کرنا شروع کر دوں ۔ اگر میں حج تمتع اور متعہ[4] کو حلال کر دوں ۔ اگر میں جنازہ کی تکبیریں[5] پانچ کر دوں ۔ اگر میں بسم اللہ[6] کو بلند آواز سے پڑھنے پر جبر کروں ۔ اگر میں مسجد [illegible] سے ان لوگوں کو نکال باہر کر دوں جو رسول اکرمؐ کے دور میں داخل نہ ہو سکتے تھے ۔ اگر میں لوگوں کو حکم قرآن پر آمادہ کر کے طلاق کو مطابق سنت کر دوں ۔ اگر میں صدقات کو اس کے اصناف اور حدود کے مطابق تقسیم کر دوں ۔ اگر میں [illegible][8] [illegible]ور نماز کو ان کے

---

[1] رسول اکرمؐ نے اپنے دور میں سوائے باب علیؑ کے تمام دروازے بند کرا دئے تھے لیکن بعد میں کھول لئے گئے ۔

[2] عمر نے مسافر کو تین دن اور مقیم کو ایک دن کے لئے موزہ پر مسح کرنے کی اجازت دے دی تھی جب کہ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ روز قیامت سب سے برا حشر اس کا ہوگا جو دوسرے کی جلد پر وضو کرے ۔

[3] مسلمانوں نے رسول اکرمؐ کے بعد نبیذ کو حلال بنا لیا تھا جبکہ رسول اکرمؐ کے دور میں حرام تھی ۔

[4] رسول اکرمؐ نے حج تمتع اور متعہ دونوں کو جائز قرار دیا تھا اور عمر نے اپنے دور میں حرام کر دیا تھا ۔

[5] بقول تاریخ الخلفاء سیوطی اور روضۃ المناظر ابن شحنہ رسول اکرمؐ نماز جنازہ میں پانچ تکبیریں کہا کرتے تھے اور عمر نے اسے چار بنا دیا تھا اور اسی کو مشہور کر دیا تھا ۔

[6] یہ غالباً معاویہ کی ایجاد تھی کہ بسم اللہ آہستہ پڑھی جائے جیسا کہ زمخشری نے سورۂ حمد کی تفسیر میں درج کیا ہے ۔

[7] رسول اکرمؐ کے دور میں صرف ۹ چیزوں پر زکوٰۃ واجب تھی ۔ بعد میں اس میں گھوڑے وغیرہ کا بھی اضافہ کر لیا گیا ۔ (تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۳۷)

[8] مسلمانوں کی بدعتوں میں یہ بھی شامل تھا کہ وضو میں کانوں کا مسح کرتے تھے ، پیروں کو دھوتے تھے ۔ عمامہ اور موزہ پر مسح کو جائز سمجھتے تھے ۔ عورت کو ہاتھ لگانے یا شرمگاہ کو چھونے سے وضو ٹوٹ جانے کا فتویٰ لگاتے تھے ۔ غسل جنابت کے ساتھ بھی وضو کرتے تھے ۔ مجامعت میں انزال نہ ہو تو غسل جنابت نہیں کرتے تھے ۔ اذان سے حی علیٰ خیر العمل نکال دیا تھا اور الصلوٰۃ خیر من النوم کو شامل کر دیا تھا ۔ نماز میں تشہد سے پہلے سلام پڑھ دیتے تھے ۔ نماز میں ہاتھ باندھ لیتے تھے ۔ سنتی نمازوں میں جماعت قائم کرتے تھے ۔ لوگوں کو نماز چاشت پر آمادہ کرتے تھے ۔ وغیرہ (کتاب الشافی للسید المرتضیٰؒ)

اوقات، احکام اور موقع و محل کی طرف پلٹا دوں ۔ اگر میں اہل نجران[1] کو ان کے مقامات پر واپس کر دوں ۔ اگر میں فارس کے قیدیوں کو کتاب و سنت کی طرف واپس لے آؤں۔ تو سب مجھے چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

میں نے کتنا سمجھایا کہ ماہ رمضان میں واجبات کے علاوہ جماعت نہ پڑھیں کہ نوافل میں جماعت[2] ایک بدعت ہے لیکن میرے ساتھ کے فوجیوں ہی نے شور مچا دیا کہ مسلمانو! سنتِ عمر بدلی جا رہی ہے اور ہمیں ماہ رمضان میں تراویح سے روکا جا رہا ہے یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ اب لشکر میرے ہی خلاف ہنگامہ کرنے جا رہا ہے۔ میں نے تو اس امت میں سوائے افتراق اور حکام کی اطاعت کے کچھ نہیں دیکھا ہے۔" (روضہ کافی ص ۵۸-۶۳)

حضرت امام علیؑ نے اس خطبہ میں اپنی فریاد کے آخر میں صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ میں امت رسولؐ کو سنتِ رسولؐ کی طرف واپس نہیں لا سکا ہوں اور اس صدمہ سے اب موت کی آرزو کر رہا ہوں۔ آخر تمہارے بدبخت کو کس نے روک رکھا ہے کہ آ کر میری زندگی کا خاتمہ کر دے۔ خدایا گواہ رہنا یہ مجھ سے بددل ہو گئے ہیں اور میں ان سے عاجز آ گیا ہوں۔ اب انھیں مجھ سے آزاد کر دے اور مجھے ان سے راحت عطا فرما دے۔ (بحار ۴۲/۱۹۶)

"آخر وہ بدبخت ترین انسان کب اٹھے گا؟" یہ الفاظ اس لئے استعمال فرماتے تھے کہ رسول اکرمؐ نے آپ سے فرما دیا تھا کہ تمھیں معلوم ہے کہ بدبخت ترین انسان کون ہے؟ وہی ہے جو تمہارے محاسن کو تمہارے سر کے خون سے رنگین کرے گا۔

---

[1] نجران نام کی مختلف بستیاں ہیں۔ ایک یمن سے متعلق مکہ کی طرف ہے جہاں اصحاب اخدود رہا کرتے تھے اور وہیں نجران کا کعبہ بنا تھا جس میں وہ سید اور عاقب جیسے لوگ رہا کرتے تھے جو حضور اکرمؐ سے مباہلہ کرنے کے لئے آئے تھے۔

ایک نجران کوفہ سے دو روز کے فاصلہ پر ہے جیسا کہ حموی نے معجم البلدان طبع یورپ ۴/ ۵۱، ۵۶، ۵۷ - ۵۷ میں بیان کیا ہے۔

[2] نماز تراویح حضرت عمر کی بدعتوں میں ہے جسے تاریخ الخلفاء میں سیوطی نے اولیات عمر میں شمار کیا ہے۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۳۶)

اس کے بعد جب امام علیؑ نے ابن ملجم کی تلوار سے اس دنیا کی مصیبتوں سے راحت حاصل کر لی اور سلطنت پر معاویہ کا قبضہ ہو گیا تو اس نے ان تمام سنتوں کو پھر واپس بلا لیا جن کو امام علیؑ نے ختم کرنے کے لئے جہاد کیا تھا اور اس کے ساتھ مزید جاہلیت کے قبائلی نظام کو بھی رائج کر دیا اور مزید ستم یہ ہوا کہ صحابہ کی ایک جماعت کو حکم دے دیا کہ وہ حکومت کی پالیسیوں کی تائید میں روایتیں تیار کر دے تاکہ اپنی حکومت کو استحکام حاصل ہو اور بنی ہاشم کو مزید حقیر بنا دیا جائے جیسا کہ زبیر بن بکار نے "موفقیات" میں مطرف بن المغیرہ بن شعبہ سے روایت کی ہے کہ میں اپنے باپ مغیرہ کے ساتھ معاویہ کے دربار میں وارد ہوا۔ میرا باپ ہمیشہ معاویہ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا اور واپسی پر مجھے اس کی ذہانت و ذکاوت کی داستانیں سنایا کرتا تھا لیکن اس رات جب واپس آیا تو اسقدر رنجیدہ تھا کہ شام کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا اس کے بعد محسوس کیا کہ شائد کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔

میں نے دریافت کیا کہ آج آپ رنجیدہ کیوں ہیں؟ کہا بیٹا آج میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو انتہائی کافر اور خبیث ہے۔ میں نے کہا خیریت تو ہے؟ کہا میں تنہائی میں معاویہ سے مصروف گفتگو تھا۔ میں نے کہا امیر! اب آپ کا سن کافی ہو گیا ہے اور مرنے کے قریب آگئے ہیں کاش آپ انصاف اور خیر سے کام لے لیتے اور اپنے برادران بنی ہاشم کے ساتھ کچھ صلۂ رحم کر دیتے۔ اب تو ان کے پاس کوئی طاقت بھی نہیں رہ گئی ہے جس سے کوئی خطرہ ہو اور اس طرح آپ کا ذکر خیر بھی باقی رہ جاتا۔

تو معاویہ نے کہا۔ افسوس صد افسوس۔ تو کس ذکر خیر کی بات کر رہا ہے۔ برادر بنی تمیم (ابو بکر) نے انصاف کیا اور کار خیر کیا لیکن مرتے ہی اس کا ذکر ختم ہو گیا اور صرف لفظ ابو بکر رہ گیا ہے۔ یہی حال برادر عدی (عمر) کا ہوا ہے کہ لوگ عمر کہہ رہے ہیں۔ اس کے برخلاف یہ ابن ابی کبشہ (رسول اکرمؐ) اس کے بارے میں روزانہ پانچ مرتبہ آواز بلند ہوتی ہے "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کیا اس کے بعد بھی کوئی عمل باقی رہ جانے والا اور کوئی ذکر خیر دوام پیدا کرنے والا ہے۔ خدا کی قسم میں اس ذکر کو دفن کر کے رہوں گا۔ (الموفقیات زبیر بن بکار ص ۵۷۵، ۵۷۶، شرح نہج البلاغہ ۲/ ۱۷۶)

معاویہ کی اس پالیسی کا اثر یہ ہوا کہ سارے عالم اسلام میں جعلی حدیثیں پھیل گئیں اور مزید قیامت یہ ہوئی کہ مسلمان مقام خلافت کو اولی الامر کا درجہ دیکر قابل اطاعت قرار دینے لگے اور خلافت کے اسقدر شیفتہ ہو گئے کہ خلفاء کی ہر مخالفتِ کتاب وسنت کا نام اجتہاد رکھ دیا اور دھیرے دھیرے مقام خلافت عوام الناس کی نظروں میں اونچا ہوتا چلا گیا اور ان کے اقتدار کو بھی خلافت رسولؐ کے بجائے خلافت الٰہیہ کا نام مل گیا اور مروان بن محمد جو ارمینیہ کا والی تھا اس نے ولید بن یزید بن عبدالملک فاسق کو خلافت کی مبارکباد دیتے ہوئے خط لکھا کہ "مبارک ہو آپ بندوں پر اللہ کے جانشین ہو گئے"۔ (تاریخ ابن کثیر ۱۰/۴)

اور یہ ولید جس کے قتل کی کوشش اس کے بھائی سلیمان نے کی تھی اور اس کا یہ جواز بیان کیا تھا کہ خدا کی قسم یہ شخص پکا شرابی، بدکار اور فاسق ہے اور کعبہ کی چھت پر بیٹھ کر شراب پینے کا متمنی ہے۔

اور جب مہدی کے دربار میں اس کے زندیق ہونے کا ذکر کیا گیا تو اس نے "بہترین" تاویل کی کہ "خدا اپنی خلافت کسی زندیق کے حوالہ نہیں کر سکتا ہے"۔ (تاریخ ابن کثیر ۱۰/۷-۸)

ابو داؤد نے اپنے سنن میں سلیمان اعمش سے روایت کی ہے کہ میں نے حجاج کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی تو اس نے خطبہ میں کہا کہ "لوگو! اللہ کے خلیفہ اور اس کے منتخب بندہ عبدالملک بن مروان کی اطاعت کرو"۔ (سنن ابی داؤد ۴/۲۱۰ حدیث ۴۶۴۵ باب الخلفاء)

ابو داؤد، مسعودی اور ابن عبد ربہ نے یہ روایت بھی نقل کی ہے جس میں ابو داؤد کے الفاظ یہ ہیں "ربیع بن خالد الضبیؔ سے روایت ہے کہ میں نے حجاج کو خطبہ میں یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ بتاؤ کسی شخص کا رسول افضل ہوتا ہے یا اس کا خلیفہ اور جانشین"۔ (سنن ابی داؤد ۴/۲۰۹ حدیث ۴۶۴۲، مسعودی ۳/۱۴۷ اخبار حجاج، العقد الفرید ۵/۵۲)

حجاج ہی نے عبدالملک کو خط لکھا تھا جس میں خلافت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "زمین و آسمان کا قیام خلافت سے ہے اور خلیفہ تمام ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین سے افضل ہوتا ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ خدا نے آدم کو اپنے ہاتھ سے بنایا۔ ملائکہ کو ان کے سامنے جھکایا۔ انھیں جنّت میں رکھا۔ اس کے بعد زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا اور ملائکہ کو ان کے

پاس پیغامبر بنا دیا۔"

عبدالملک کو یہ بات اسقدر پسند آئی کہ اس نے کہا کاش کوئی خارجی میرے پاس آتا تو میں اس کے سامنے یہ دلیل پیش کرتا۔ (العقد الفرید ۵/ ۵۱)

اس کے بعد ایک وقت وہ بھی آیا جب اس نے خلافت کے مرتبہ کو گھٹا کر رسالت کے برابر بنا دیا اور ایک خطبہ میں کہا کہ "عثمان کی مثال اللہ کے نزدیک عیسیٰ بن مریم جیسی ہے اور یہ کہہ کر اس آیت کریمہ کی تلاوت کی کہ "پروردگار نے کہا اے عیسیٰ میں تمھاری مدت قیام پوری کر کے تمھیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور کافروں سے الگ کرنے والا ہوں اور تمھارے اتباع کرنے والوں کو قیامت تک کے لیے کافروں پر فوقیت دینے والا ہوں۔ اور اتباع کرنے والوں سے شام والوں کی طرف اشارہ کیا اور کافروں میں اہل عراق کو شمار کیا۔ (سنن ابی داؤد ۴/ ۲۰۹، العقد الفرید ۵/ ۵۱)

ایک مرتبہ ولید بن عبدالملک نے خالد بن عبداللہ القسری کو مکہ میں کنواں کھودنے کا حکم دیا اور اتفاق سے اس کا پانی میٹھا نکل آیا تو خالد نے مکہ کے اندر برسر منبر اعلان کیا کہ ایہا الناس! بتاؤ کسی شخص کا جانشین بہتر ہوتا ہے یا پیغامبر؟ اللہ تمھیں خلیفہ کے فضل و کرم سے محروم نہ کرے۔ ابراہیم خلیل الرحمٰن تھے لیکن جب پانی کا مطالبہ کیا تو کھارا چشمہ جاری ہوا اور خلیفہ نے پانی مانگا تو میٹھا کنواں جاری ہو گیا۔ اس کے بعد زمزم کے قریب ایک حوض بنوا کر اس میں کنویں کا پانی جمع کیا گیا تاکہ لوگ محسوس کریں کہ خلیفہ کا پانی کیسا ہے اور ابراہیمؑ کا ترکہ کیسا ہے۔

راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد کنواں کہاں غائب ہو گیا۔ نہیں معلوم۔ کہ آجتک اس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ (طبری حوادث ۸۹ھ ۵/ ۶۷، ابن اثیر ۴/ ۲۰۵، ابن کثیر ۹/ ۷۶)

جماعت خلافت نے مقام خلافت اور کردار شیخین کو اونچا کرنے اور امت کے اندر اس احساس کو مستحکم بنانے میں اس حد تک رکاکت سے کام لیا اور خلافت عمر کے آخری دور تک امت اسلامیہ کی اس انداز سے تربیت کی کہ عام مسلمانوں کی طرح اصحاب رسولؐ بھی

سیرتِ شیخین کو سنتِ رسولؐ کی طرح اسلامی معاشرہ کے دستور کا درجہ دے رہے تھے اور عثمان کو اسی بنیاد پر خلیفہ بنایا گیا تھا کہ وہ سنتِ رسولؐ اور سیرتِ شیخین پر عمل کریں گے۔

اور ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں کہ اس سیرت کا تمامتر دار و مدار ذاتی افکار و نظریات پر تھا اور اسی بنیاد پر خمس سے قرابتدارانِ رسولؐ اور بنی ہاشم کا حصہ ختم کر دیا گیا تھا جب کہ خود قرآن مجید میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اس کے بعد ابو بکر نے خالد بن ولید کی حد شرعی کو ختم کر دیا حالانکہ جرم بھی ثابت تھا اور حد بھی قوانین شریعت میں ثابت تھی۔

اس کے بعد عمر نے متعۂ حج اور متعۂ نساء کو حرام کر دیا جب کہ یہ کام بھی نص رسولؐ کے خلاف تھا۔ اور بیت المال کی تقسیم میں ایک طبقاتی نظام رائج کر دیا جس کا اسلام میں دور دور پتہ نہیں تھا۔

عثمان نے اپنے دور میں اسی طریقۂ کار کو جاری رکھا اور جب امام علیؑ کا دور آیا تو آپ بھی صرف فریاد ہی کرتے رہے لیکن قوم کو عہد رسالت کی طرف واپس لانے کا کام انجام نہ دے سکے اور آپ کے بعد معاویہ نے تمام خلفاء کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی احکام گم ہو گئے، مسلمان اس اندھیرے میں چلے گئے، جہاں خلفاء کے بدلے ہوئے اصلی احکام کا واپس لانا ممکن ہو گیا اور امت اسلامیہ مقامِ خلافت کو اسقدر عظیم سمجھنے لگی کہ اس کے آگے رسالت کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال کے مقابلہ میں ائمہ اہلبیتؑ نے کیا کیا؟ اور وہ اسلامی سماج میں اسلامی احکام کو دوبارہ کس طرح واپس لا سکے؟۔ اس کا تذکرہ اس بحث کے اختتام پر کیا جائے گا جہاں ائمہ طاہرینؑ کے اسلامی خدمات پر مکمل روشنی ڈالی جائے گی۔

بحث چہارم

ذاتی اجتہاد اور عمل بالرائے

کے نتیجہ میں

سنت رسول اکرمؐ سے انحراف

کے مقابلہ میں

فرزند رسول الثقلین امام حسینؑ کا انقلاب

سیاسی مصالح کے تحت پیش آنے والے خلفاء اسلام کے اجتہادات کی شہرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں پر اسلام کے واقعی احکام مشتبہ ہو گئے، اور صرف وہ احکام یاد رہ گئے جو خلافتوں کے اجتہادات کا نتیجہ تھے اور انھیں کا نام اسلام رکھ دیا گیا۔

اس سلسلہ میں سارے عالم اسلام حجاز، شام، عراق، ایران، یمن، مصر اور افریقہ کا ایک ہی حال تھا اور ہر جگہ سنت رسولؐ کی جگہ اجتہادات خلفاء نے لے لی تھی اور اگر کسی کو سنت رسولؐ یاد بھی تھی تو اجتہاد خلیفہ سے ٹکراؤ کی صورت میں سنت قابلِ اتباع نہ تھی بلکہ اجتہاد ہی قابلِ اتباع تھا جیسا کہ مرد شامی نے خانۂ کعبہ کو سنگسار کرتے وقت کہا تھا کہ حرمتِ کعبہ اور اطاعتِ خلیفہ میں ٹکراؤ ہو گیا اور اطاعت، حرمت پر غالب آگئی۔

اور یہی نعرہ حجاج نے لگایا تھا کہ شام والو! اطاعت کے مسئلہ میں اللہ کو یاد رکھنا۔ کہ اگر اطاعت کا معاملہ نہ ہوتا تو بہت سے گناہان کبیرہ پیش نہ آتے۔ لیکن مسلمان اطاعت

سے مجبور تھا یہاں تک کہ خانہ کعبہ پر حملہ کرنے والے لشکر کا سردار بھی اسقدر محتاط تھا کہ حرم کا کوئی کبوتر اسکے گھوڑے کی ٹاپوں سے پامال نہ ہونے پائے چاہے اطاعت خلیفہ میں کعبہ کو سنگسار کیوں نہ کرنا پڑے۔

یہی فلسفہ شمر ذی الجوشن کا بھی تھا جیسا کہ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ شمر نماز صبح کے تعقیبات پڑھتا رہتا تھا اور دعا کرتا رہتا تھا کہ خدایا! مجھے معاف کر دینا۔ اور جب یہ کہا گیا کہ خدا تجھے کس طرح معاف کرے گا۔ تو نے فرزند رسولؐ کے قتل میں حصّہ لیا ہے؟ تو اُس نے کہا کہ تیرا بُرا ہو۔ میں کیا کرتا۔ جب ہمارے حکام نے ہمیں ایک حکم دے دیا تو ہم اس کے خلاف نہیں کر سکتے تھے اور اگر ایسا کرتے تو گدھوں سے بدتر ہوتے۔ (تاریخ الاسلام ذہبی ۳/۱۸-۱۹)

لشکر یزید کا ایک اور سپاہی کعب بن جابر اپنی مناجات میں کہا کرتا تھا "خدایا! ہم نے اپنے حاکم سے وفاداری کی ہے لہٰذا ہمارا حشر غداروں جیسا نہ کرنا۔

لشکر یزید کا ایک اور سردار عمر بن حجاج روز عاشور فوجوں کو آواز دے رہا تھا،

"اے اہلِ کوفہ! خبردار اپنی اطاعت اور جماعت کا خیال رکھنا اور دین سے نکل جانے والوں اور اطاعت حاکم سے انکار کر دینے والوں سے جہاد کرنے میں کسی شک میں مبتلا نہ ہونا۔"

حد ہو گئی کہ اطاعت خلیفہ اتنا عظیم عمل بن گئی جس سے بالاتر قرب الٰہی کا کوئی وسیلہ ہی نہیں تھا اور اس راہ میں ہر گناہ صغیرہ و کبیرہ کا ارتکاب جائز تھا جیسا کہ مسلم حالت نزع میں کہہ رہا تھا "خدایا! میں نے شہادت توحید و رسالت کے بعد کوئی ایسا عمل انجام نہیں دیا جو قتل اہل مدینہ سے زیادہ محبوب ہو اور جس سے آخرت بنانے کی امید کی جاسکتی ہو۔ اب اس کے بعد بھی اگر میں واصل جہنم ہو گیا تو واقعی بدبخت شمار کیا جاؤں گا"

دیکھا آپ نے اس دیانتداری کا فلسفہ اور یہ بہترین کار خیر۔ جہاں مسلمانوں کو قتل کیا جاتا ہے اور اس کے عوض جنت حاصل کی جاتی ہے۔ اور یہ سب نتیجہ ہے اطاعتِ خلیفہ کا اور اس صورت حال کا کہ اسلامی اقدار یکسر تبدیل ہو گئے اور اطاعتِ خلیفہ کا جنون اس منزل پر آگیا کہ امام حسینؑ کو قتل کرنے والے بھی اپنی نماز میں محمدؐ و آلِ محمدؐ پر صلوات پڑھ رہے تھے اور کعبہ کو سنگسار کرنے والے بھی اپنی نمازوں میں کعبہ ہی کا رُخ

کر رہے تھے۔

گویا کہ قابلِ اطاعت خلیفہ تھا۔ خدا نہیں تھا۔ جب کہ خانہ کعبہ کو سنگسار کا حکم دینے والا خلیفہ فرعون سے زیادہ بدتر اور سرکش تھا کہ فرعون نے عبادت خانہ کو منہدم کرنے کا حکم نہیں دیا تھا اور یزید و عبدالملک نے یہ کام بھی کر دیا تھا اور اس طرح مدرسۂ خلافت نے اسلام کو اس قدر مسخ کر دیا تھا کہ مسلمان اس کے تصور سے بھی محروم ہو گئے تھے۔

مسلمان کیسے بیدار ہوئے؟

سید المرسلین کی شریعت اجتہادات خلفار کے نتیجہ میں انھیں حالات سے دوچار ہو گئی جن حالات سے گذشتہ انبیار کی شریعتیں دوچار ہوئی تھیں اور معاشرہ میں اس اطاعت خلفار کے ہوتے ہوئے ان احکام کا دوبارہ زندہ کرنا ممکن نہیں تھا۔

اب اسلام حقیقی کے رائج کرنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے خلافت کا یہ بُت نکال کر پھینک دیا جائے اور اس کے ذریعہ اجتہاداتی اسلام سے نجات حاصل کر کے حقیقی اسلام کو رواج دیا جائے جو سرکار دو عالمؐ لے کر آئے تھے۔

پروردگار عالم نے امام حسینؑ کو اسی کارنمایاں کے لئے مہیا کیا تھا اور انھوں نے اسی عظیم کارنمایاں کو انجام دیا ہے۔

امام حسینؑ ذخیرۂ انقلاب

پروردگار عالم نے امام حسینؑ کو مذکورہ "مقام خلافت کے تقدس" کو پامال کرنے کا کام اُس وقت سپرد کیا جب پہلے ان کے لئے مسلمانوں کے دل و دماغ میں ایک جگہ تیار کر دی اور مختلف آیات کے ذریعہ ان کی شخصیت کا تعارف کرا دیا۔ کبھی تمام اہلبیتؑ کے ساتھ اور کبھی تنہا ان کی ذات کا تذکرہ کر کے۔!

جب آیت مبارکہ "قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ" نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے اس کی تفسیر کی کہ ان قرابتداروں سے مراد علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ ہیں۔

(تفسیر طبری، زمخشری، سیوطی، مستدرک صحیحین ۱۷۲/۲، ذخائر العقبیٰ طبری ص۱۳۸، اسد الغابہ ۳۶۷/۵، حلیۃ الاولیا ۲۰۱/۳، مجمع الزوائد ۱۰۳/۷-۱۴۶/۹)

جب آیت تطہیر کے نزول کا وقت آیا تو رسول اکرمؐ نے علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ کو جمع کر کے چادر کے اندر لے لیا اور پروردگار نے اعلان کیا کہ اے اہلبیت! اللہ کا ارادہ ہے کہ تم سے ہر رجس کو دور رکھے اور تمھیں اس طرح پاکیزہ رکھے جو حق طہارت ہے" اور اس کے بعد آپ تاحیات اہلبیتؑ کے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دیتے رہے — سلام ہو تم پر اے اہلبیتؑ — اللہ کا ارادہ ہے کہ تم سے ہر رجس کو دور رکھے —!

جب آیت مباہلہ "فمن حاجك فيه من بعد ما جائك من العلم فقل تعالوا ندع ابنائنا وابنائكم ونسائنا ونسائكم وانفسنا وانفسكم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكاذبين" نازل ہوئی اور حضور نے مباہلہ کا ارادہ کیا تو اپنے ساتھ صرف علیؑ و فاطمہؑ اور حسن و حسینؑ کو لیا اور قوم کو ان کی عظمت سے باخبر کیا۔

اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اپنی نماز میں مجھ پر اور میرے اہلبیتؑ پر صلوات نہ پڑھے اس کی نماز قبول نہیں ہے۔ (سنن بیہقی ۳۷۹/۲، سنن دار قطنی ص۱۳۶)

اور جب دریافت کیا گیا کہ صلوات کا طریقہ کیا ہے تو فرمایا "خدایا! محمدؐ و آل محمدؐ پر رحمت نازل فرما جس طرح آل ابراہیمؑ پر رحمت نازل کی ہے کہ تو حمید بھی ہے اور مجید بھی ہے اور محمدؐ و آل محمدؐ کو برکت عنایت فرما جس طرح آل ابراہیمؑ کو عنایت فرمائی ہے کہ تو حمید بھی ہے اور مجید بھی ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الدعوات باب الصلوٰۃ علی النبی، کتاب التفسیر باب تفسیر "ان الله وملٰئكته يصلون" — صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی بعد التشہد، مسند احمد ۴۷/۲-۳۵۳/۵، الادب المفرد بخاری ص۹۳، سنن نسائی، ابن ماجہ، ترمذی — بیہقی ۱۴۷/۲-۳۷۹، دار قطنی ص۱۳۵، مسند الشافعی ص۲۳، مستدرک صحیحین ۲۶۹/۱، تفسیر طبری)

اس کے علاوہ حضورؐ نے علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ سے خطاب کر کے فرمایا کہ جس سے تمھاری جنگ ہے اس سے میری جنگ ہے اور جس سے تمھاری صلح ہے اس سے میری

صلح ہے۔ یا۔ جو تم سے جنگ کرے اس نے مجھ سے جنگ کی اور جس نے تم سے صلح کی اس نے مجھ سے صلح کی۔ (سنن ترمذی کتاب المناقب، مقدمہ ابن ماجہ، مستدرک ۱/۱۴۹، مسند احمد ۲/۴۴۲، اسد الغابہ ۳/ ۱۱۔ ۵/۵۲۳، مجمع الزوائد ۹/ ۱۶۹، تاریخ بغداد ۸/۱۳۶، الریاض النضرہ ۲/۱۹۹، ذخائر العقبیٰ صفہ ۲۳)

۔ کبھی حسنؑ و حسینؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ جس نے مجھ سے، اِن سے اور ان کے والدین سے محبّت کی وہ روزِ قیامت میرے ساتھ میرے درجہ میں ہوگا۔ (مسند احمد ۱/ ۷، سنن ترمذی کتاب المناقب، تاریخ بغداد ۳/۲۸۷، تہذیب التہذیب ۱/ ۴۳۰، کنز العمال)

۔ کبھی فرماتے تھے کہ "حسنؑ و حسینؑ دنیا میں میرے دو پھول ہیں"۔ (بخاری کتاب بدء الخلق باب مناقب الحسنؑ والحسینؑ۔ روایت ابن عمر، باب رحمۃ الولد و تقبیلہ، الادب المفرد صفہ ۱۴، سنن ترمذی، مسند احمد ۲/۸۵، ۹۳، ۱۱۴، ۱۵۳، مسند طیالسی ۸/۱۶۰، خصائص نسائی صفہ ۳۷، مستدرک حاکم ۳/۱۶۵، الریاض النضرہ ۲/ ۲۳۲، حلیۃ الاولیاء ابو نعیم ۳/ ۲۰۱۔ ۵/ ۷۰، فتح الباری ۸/ ۱۰۰، مجمع الزوائد ۹/ ۱۸۱)

۔ کبھی فرماتے تھے کہ جد و جدّہ، عم و عمہ، خال و خالہ اور پدر و مادر کے اعتبار سے تمام عالم انسانیت سے بہتر کون ہے؟ اور پھر فرماتے تھے حسنؑ اور حسینؑ۔ (مجمع الزوائد ہیثمی ۹/ ۱۸۴، ذخائر العقبیٰ صفہ ۱۳۰، کنز العمال ۱۳/ ۱۰۲۔ ۱۱۴ طبع دوم)

۔ کبھی فرماتے تھے "یہ دونوں میرے اور میری بیٹی کے فرزند ہیں۔ خدایا میں ان سے محبّت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبّت فرما اور جو ان سے محبّت کرنے والے ہیں ان سب سے محبّت فرما"۔ (ترمذی کتاب المناقب، خصائص نسائی صفہ ۲۲، کنز العمال ۱۳/ ۹۹ طبع دوم)

۔ کبھی فرماتے تھے جس نے حسنؑ و حسینؑ سے محبّت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے دشمنی کی۔ (سنن ابن ماجہ فضائل الحسنؑ والحسینؑ، مسند احمد ۴/ ۲۸۸، ۴۴۰، ۵۳۱۔ ۵/ ۳۶۹، تاریخ بغداد ۱/ ۱۴۱، کنوز الحقائق طبع اسلامبول صفہ ۱۳۴، مسند الطیالسی ۱۰/ ۳۲۷، ۳۳۲، مجمع الزوائد ۹/ ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۵، سنن بیہقی ۲/۲۶۳، ۴/ ۲۸، حلیۃ الاولیاء ۸/ ۳۰۵، مستدرک حاکم ۳/ ۱۶۶، ۱۷۱)

ـ کبھی فرماتے تھے کہ تمام اولاد آدمؑ اپنے باپ کی طرف نسبت رکھتی ہے لیکن اولاد فاطمہؑ کا باپ میں ہوں اور میں ان کا بزرگ خاندان ہوں۔ (مستدرک حاکم ۳/۱۶۴، ۱۶۵، ۶۲۶، تاریخ بغداد ۱۱/۲۸۵، مجمع الزوائد ۹/۱۷۲، ذخائر العقبیٰ صـ۱۲۱، کنز العمال ۶/۲۲۰، ۲۲۶)

ـ کبھی مسجد میں مشغول نماز ہوتے اور حسنؑ و حسینؑ پشت پر آکر بیٹھ جاتے تو جب سر اٹھاتے تو آہستہ سے بٹھا دیتے اور جب دوبارہ سجدہ میں جاتے تو بچے پھر دوبارہ پشت پر بیٹھ جاتے۔ (مستدرک ۳/۱۶۳، ۱۶۵، ۶۲۶، مسند احمد ۲/۵۱۳-۳/۴۹۳-۵/۵۱، سنن بیہقی ۲/۲۶۳، مجمع الزوائد ۹/۱۸۱، ۱۸۲، ۲۷۵، ذخائر العقبیٰ صـ۱۳۲، اسد الغابہ ۲/۳۸۹، الریاض النضرہ صـ۱۳۲)

ـ آپ مسجد میں خطبہ ارشاد فرمارہے تھے کہ حسنؑ و حسینؑ آگئے اور پھسل کر گر پڑے تو آپ منبر سے اتر پڑے اور اپنے پاس لے جاکر بٹھالیا۔ (مسند احمد ۴/۳۸۹-۵/۳۵۴، مستدرک ۱/۲۸۷-۴/۸۹، سنن بیہقی ۳/۲۱۸-۶/۱۶۵، سنن ابن ماجہ باب لبس الاحمر للرجال، سنن نسائی باب صلوٰۃ الجمعہ والعیدین، سنن ترمذی کتاب المناقب)

مذکورہ بالا تمام ارشادات سے خدا اور رسولؐ نے امت اسلامیہ کو آگاہ کیا تھا کہ تمام اہلبیتؑ کو عظمت و احترام و اجلال و اعزاز کی نگاہ سے دیکھا کریں جس کی طرف پروردگار نے آیت خمس، سورۂ ھل اتیٰ، آیت ذی القربیٰ وغیرہ میں اشارہ کیا ہے اور رسول اکرمؐ نے مذکورہ احادیث کے علاوہ دیگر احادیث میں اشارہ فرمایا تھا۔

اس کے بعد تمام اہلبیتؑ کے درمیان بالخصوص امام حسینؑ کا تذکرہ فرمایا جب روز ولادت اور اس کے بعد مسلسل ان کی شہادت کا تذکرہ فرماتے رہے اور یہی کام رسول اکرمؐ کے بعد امیر المومنینؑ نے کیا کہ جنگ صفین سے واپسی پر ایک مقام پر رک کر رسول اکرمؐ کے حوالہ سے حسینؑ کی شہادت کی خبر سنائی اور خود صفین کے میدان میں فرمایا کہ میں حسنؑ و حسینؑ کو موت کے حوالہ نہیں کر سکتا کہ اس سے نسل رسولؐ کے منقطع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۵)

ـ اس کے علاوہ امت کے پاس اور دوسرے ارشادات رسولؐ بھی تھے جن کے

ذریعہ امت کو متوجہ کیا گیا تھا کہ ائمہ اثنا عشر ہی اسلام کے حامل اور محافظ ہیں اور امام حسینؑ انھیں میں سے تیسرے امام ہیں۔

اور اس طرح امام حسینؑ وہ فرد فرید تھے جس کی محبت امت اسلامیہ کو رسول اکرمؐ کی وراثت میں ملی تھی اور آپ کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا محبوب خدا و رسول نہیں تھا اور اسی لیے امت کی خواہش تھی کہ معاویہ کے بعد آپ کی بیعت کر لے تاکہ آپ اسلام کے قانونی خلیفہ ہو جائیں اور حق کے ساتھ تخت خلافت پر جلوہ فرما ہوں حالانکہ یہ طے شدہ بات ہے کہ اگر ایسا ہو گیا ہوتا اور آپ خلیفۃ المسلمین بن جاتے تو بھی سرکار رسالت کے دور کے احکام کو دوبارہ رائج نہیں کر سکتے تھے جس طرح کہ اس راہ میں امیر المومنینؑ کی کوششیں کارگر نہ ہو سکیں اور امت اپنی گمراہی پر اڑی رہی بلکہ امام حسینؑ کو اس بات پر بھی مجبور کیا جاتا کہ جس طرح معاویہ کے دور سے منبروں سے امیر المومنینؑ کو گالیاں دی جا رہی ہیں اس سلسلہ کو بھی باقی رکھا جائے اور سنت خلفاء میں کسی طرح کی تبدیلی نہ کی جائے۔

امت کی طرف سے امام حسینؑ کی بیعت نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام حسینؑ کی حیثیت بالکل حرمین شریفین کی ہو گئی کہ ان کا احترام بھی کرنا ہے اور اطاعت خلیفہ میں انھیں سنگسار بھی کرنا ہے جیسا کہ فرزدق نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔"

اور ان حالات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کی سب سے بڑی مصیبت کیا تھی اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا راستہ اختیار کیا جا سکتا تھا۔

دَورِ امام حسینؑ میں مسلمانوں کی حالتِ زار

امت اسلامیہ چاہے اسلام کے مراکز مکہ و مدینہ میں رہی ہو یا خلافت کے مراکز کوفہ و شام میں رہی ہو سب کا مشترک عالم یہ تھا کہ سارا دین اطاعت خلیفہ میں سمٹ کر آ گیا تھا چاہے خلیفہ اہل ہو یا نا اہل، عادل ہو یا فاسق۔

خلیفہ کے خلاف قیام مسلمانوں میں تفرقہ اندازی اور دین سے بغاوت کے مرادف تھا اور اس امت میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے رسول اکرمؐ کا دَور دیکھا تھا اور آپ کے ارشادات بھی سُنے تھے اور ان کے ساتھ تابعین اور بزرگانِ اسلام کی بھی ایک جماعت تھی۔

ظاہر ہے کہ جب مراکز کا یہ حال رہا ہو تو افریقہ، ایران اور جزیرہ عربیہ کے ان علاقوں کا کیا حال رہا ہوگا جنھوں نے نہ حضور کو دیکھا تھا اور نہ اہلبیتؑ کی صحبت کا شرف حاصل کیا تھا۔ ان کے پاس تو وہی اسلام تھا جو دارالخلافہ سے نکلا تھا اور جسے قصر حکومت میں ڈھالا گیا تھا۔ اسلام خلیفہ اور اس کی سیرت کا نام تھا اور خلیفہ ایک بے لگام انسان کا نام تھا جسے اپنے مقاصد کی تکمیل سے نہ کوئی دین روک سکے اور نہ مذہب۔ اس کے لئے شراب حلال، ترک نماز جائز، ناچ گانے کی محفلیں بہترین مشغلہ اور کتوں کے کھیل کے ساتھ ہجڑوں کی مصاحبت بہترین عمل خیر۔

سوتیلی ماں، بہن، بیٹی سے عقد جائز؛ اور قتل فرزند رسولؐ کا حکم دیکر ان کے گھر والوں کو قیدی بنا لینا اور حرم رسولؐ کی تاراجی کے بعد کعبہ کو منجنیق سے سنگسار کر دینا بہترین عبادت ہو۔ اور نعرہ یہ ہو کہ سارا اسلام بنی ہاشم کا کھیل تماشہ ہے نہ کوئی وحی نازل ہوئی ہے اور نہ خبر۔

خلیفہ کا نام خلیفۂ رسول کے بجائے خلیفۃ اللہ ہو گیا تھا۔ (مروج الذہب ۳/۲۸۶)

اور مسلمانوں کو یہ تربیت دی جارہی تھی کہ دینداری صرف اطاعت خلیفہ کا نام ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس دور کا مسئلہ غلط حاکم کا تسلّط نہیں تھا کہ اسے ہٹا کر دوسرے کو حاکم بنا دیا جائے۔ اس دور کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ اسلامی اقدار فنا ہو گئے تھے اور خلافت کا تصور یکسر تبدیل ہوگیا تھا اور خلیفہ کی اطاعت مطلقہ کا نام اسلام ہوگیا تھا۔

ایسی حالت میں مسئلہ کا علاج صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے افکار کو بدلا جائے اور انھیں محسوس کرایا جائے کہ اسلام خلافت کا حاکم ہے محکوم نہیں ہے اور یہ کام امام حسینؑ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا تھا کہ آپ رسول اکرمؐ سے ایک خاص تعلق رکھتے تھے اور امت نے آیات واحادیث کے ذریعہ آپ کی منزلت کو پہچان لیا تھا۔

امام حسینؑ کے سامنے بھی ان حالات میں دو ہی راستے تھے:

۱۔ یزید کی بیعت کر کے دار دنیا میں عیش کریں اور مسلمانوں کے درمیان محبوب اور محترم بنے رہیں۔ جس کے دو نتیجے بہرحال ہوں گے:

ا۔ یزید کا ہر فسق و فجور اور اس کا کفر صحیح قرار پا جائے گا۔

ب۔ مسلمانوں کا یہ نظریہ صحیح ہو جائے گا کہ جو بھی تخت خلافت پر قدم رکھ دے وہ اسلام کا واقعی نمائندہ ہوتا ہے اور اس کی اطاعت ہر حال میں اور ہر مسئلہ میں واجب ہوتی ہے۔

اور ان دونوں باتوں کا مطلب یہ تھا کہ سید المرسلین کی شریعت فنا کے گھاٹ اُتر جائے اور اس کا وہی انجام ہو جو شریعتِ موسیٰ وعیسیٰ اور قوانین مرسلین کا ہو چکا ہے اور فرزند رسولؐ ان تمام نتائج کا ذمہ دار ہو جو اس وقت سامنے آیا یا جو تباہ کاریاں قیامت تک سامنے آنے والی ہیں کہ اب ان کے علاوہ کوئی دوسرا محافظ اسلام باقی نہیں رہ گیا تھا اور نہ کسی اور کے لئے وہ زمین ہموار کی گئی تھی جو رسول اکرمؐ نے آپ کے لئے ہموار کی تھی۔

لہٰذا اب سارے مسئلہ کا دارومدار صرف امام حسینؑ پر تھا چاہے بیعتِ یزید کر کے یزیدیت کو اسلام بنا دیں، یا

۲۔ یزید کے اعمال پر تنقید کریں اور امت اسلامیہ کو اندھی اطاعت سے روکیں اور صورت حال کو تبدیل کر کے اسلام کے مُردہ احکام کو پھر دوبارہ زندہ کریں۔

یہی وہ دوسری صورت تھی جسے امام حسین علیہ السلام نے اختیار کیا اور اپنی زندگی کا مقصد اصلی قرار دے لیا اور اسی راستہ پر چل پڑے جو اس عظیم مقصد تک پہونچا دے جیسا کہ آئندہ تفصیلات سے واضح ہوگا۔

امام حسینؑ

مقصد، شعار، راستہ

امام حسینؑ نے سب سے پہلے یہ نعرہ بلند کیا کہ خلافت کا یہ نظام غیر اسلامی ہے اور اس سے اسلام کو شدید خطرہ لاحق ہے۔

"اسلام پر آخری سلام کہ امت اسلامیہ یزید جیسے حاکم کے ساتھ مبتلا ہو گئی ہے"۔

اور یہ اس شخص کے جواب میں فرمایا جس نے مشورہ دیا کہ :

"امیر المومنینؑ یزید کی بیعت کر لیں کہ اسی میں خیرِ دنیا بھی ہے اور خیرِ آخرت بھی"۔

اور ان حالات میں فرمایا جب یہ کہا جا رہا تھا کہ :

"حسینؑ تمھیں خوفِ خدا نہیں ہے کہ مسلمانوں کی جماعت سے باہر نکل گئے ہو اور امت میں تفرقہ پیدا کرنا چاہتے ہو"۔

اور ابن عمر جیسا خلیفہ زادہ کہہ رہا تھا کہ :

"خدا سے ڈرو اور جماعت مسلمین میں تفرقہ نہ پیدا کرو"۔ (طبری ۶/۱۹۱)

ایسے حالات میں امام حسینؑ کا نعرہ یہ تھا کہ اگر دنیا میں کوئی ٹھکانہ اور پناہ گاہ نہ رہ جائے تو بھی میں یزید کی بیعت نہیں کر سکتا ہوں۔

اور ان تمام اعلانات کا مقصد یہ تھا کہ یہ نظام خلافت غلط ہے اور اصل اسلام نظام امامت سے وابستہ ہے جس کی مزید وضاحت اپنے بھائی محمد حنفیہ کی وصیت میں

کر دی تھی :

"میں صرف اس لئے نکلا ہوں کہ میں اپنے جد کی امت کی اصلاح چاہتا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ نیکیوں کا حکم دوں۔ بُرائیوں سے روکوں اور اپنے جد اور اپنے پدر بزرگوار علیؑ بن ابی طالب کی سیرت پر عمل کروں۔ اسکے بعد کوئی حق کو قبول کرلے تو اللہ حق کا زیادہ حقدار ہے اور اگر رد کردے تو میں حالات پر صبر کرتا رہوں گا یہاں تک کہ پروردگار میرے اور قوم کے درمیان فیصلہ کردے کہ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔

اس وصیت میں امام حسینؑ نے ابوبکر، عمر، عثمان اور معاویہ کی سیرت کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے اور صرف اپنے جد اور پدر بزرگوار کی سیرت کو قابلِ عمل قرار دیا ہے اور دونوں کا فرق یہ ہے کہ سیرت خلفاء میں انسان بیعت کے ذریعہ حاکم بن سکتا ہے چاہے جیسی بھی بیعت ہو اور اس کے بعد اسلامی احکام میں جس طرح چاہے اجتہاد کے نام پر تبدیلی کر سکتا ہے۔

اور سیرت جد و پدر میں لوگوں کو اسلام حقیقی پر آمادہ کرنا اور اسی پر عمل کرنے کی دعوت دینا ہے۔ جو ان دونوں بزرگوں کا ہر حال میں طریقۂ کار رہا ہے چاہے وہ مدینہ میں رسول اکرمؐ اور کوفہ میں حضرت علیؑ کا حاکمانہ دور رہا ہو یا اس سے قبل کے حالات رہے ہوں۔ رسول اکرمؐ مکہ کی زندگی میں حکومت قائم کرنے سے پہلے اور امیر المومنینؑ قتل عثمان سے قبل ایک ہی کام کر رہے تھے کہ امت کو اسلام پر آمادہ کیا جائے اور اسی کے احکام پر عمل کرنے کی دعوت دی جائے۔ فرق صرف یہ تھا کہ رسول اکرمؐ خدا کی طرف سے احکام پہونچا رہے تھے اور امیر المومنینؑ رسول اکرمؐ کے لائے ہوئے احکام کی تبلیغ کر رہے تھے۔

مقصد صرف یہ تھا کہ اسلام کی دعوت دی جائے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو رائج کر دیا جائے۔ امام حسینؑ اسی سیرت اور طریقۂ کار پر چلنا چاہتے تھے اور اسی راہ میں ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار تھے۔

بغیر قتل اگر دینِ حق نہ ہو محکم　　　ہر ایک تیغ ستم کے لئے ہیں حاضر ہم

اسی لئے آپ نے بنی ہاشم کے نام خط میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ "جو ہمارے ساتھ چلے گا وہ شہید ہوگا اور جو ہم سے الگ رہے گا اسے بھی فتح نصیب نہ ہوگی" گویا آپ کی نظر میں دونوں باتیں واضح تھیں۔

"اس قیام کا انجام شہادت ہے" ـــــ اور

"شہادت کے بغیر فتح کا کوئی امکان نہیں ہے"۔

اس طرح آپ نے بار بار اپنے مقصد، اپنے شعار اور اپنے راستہ کی وضاحت کردی تھی تاکہ جو شخص بھی آئے وہ شہادت کے لئے تیار ہو کر آئے اور کوئی شخص طمع حکومت اور حرص دولت میں ساتھ نہ آئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب آپ نے زہیر بن القین کو مدعو کیا اور وہ آپ کی خدمت میں بادل ناخواستہ آئے تو واپسی پر مسکراتے ہوئے دکھائی دئے اور آتے ہی اپنے خیمہ کے اکھاڑنے کا حکم دے دیا اور زوجہ کو یہ کہہ کر طلاق دے دی کہ تو اپنے گھر والوں میں چلی جا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے، اور پھر اپنے اصحاب سے فرمایا کہ جو شہادت کا طلبگار ہو وہ اٹھ کھڑا ہو ـــــ ورنہ یہ آخری ملاقات ہے۔

واضح رہے کہ زہیر نے اپنی شہادت کی خبر اس وقت سنا دی تھی جب مسلم وہانی کی شہادت اور کوفہ کے پلٹ جانے کی کوئی اطلاع امامؑ کے قافلہ تک نہیں پہونچی تھی اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس شہادت کا شہادتِ مسلم کے انتقام سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ زہیر نے اپنے اصحاب کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ جنگ بلنجر میں صحابیٔ رسول سلمان باہلی نے بتایا تھا کہ مجھے اس دن کی سعادت نصیب ہونے والی ہے۔ (طبری ۶/۲۲۴ـ۲۲۵)

امام حسینؑ اسی طرح کے اصحاب وانصار کو تلاش کر رہے تھے اور اسی جذبہ سے محروم افراد کو برابر اپنے سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ آپ نے اس انجام اور اس راستہ کی خبر ابن عمر کے جواب میں اسے بھی دے دی تھی۔

"عبداللہ! کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ دنیا کی ذلت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یحییٰ بن زکریا کا سر بنی اسرائیل کی ایک بدکردار شخصیت کو بطور ہدیہ پیش کیا جائے ـــ لیکن اللہ

نے اس وقت بھی جلدی نہیں کی اور بعد میں انھیں اپنی قدرت کاملہ کی گرفت میں لے لیا۔"
ابو عبدالرحمن! اللہ سے ڈرو اور میری نصرت کو نظر انداز نہ کرو۔ (الفتوح ابن اعثم ۵/۴۲-۴۳، مقتل ۱/۱۹۲)

گویا امام حسینؑ اس نکتہ کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ میری حیثیت یحییٰ بن زکریا جیسی ہے لہذا میری نصرت ضروری ہے۔

۔ عراق کا رُخ کرتے ہوئے آپ نے اپنے خطبہ میں مزید وضاحت کر دی تھی کہ "موت بنی آدم کی گردن کا ہار ہے جس طرح کہ عورت کی گردن میں زیور ہوتا ہے۔ میں اپنے بزرگوں کا اسی طرح مشتاق ہوں جس طرح یعقوب کو یوسف کا اشتیاق تھا، میں عنقریب اپنے مقتل سے ملنے والا ہوں اور مجھے وہ منظر نظر آ رہا ہے جہاں بنی امیہ کے درندے میرے جوڑ بند کو جُدا کر رہے ہوں گے اور نواویس و کربلا کے درمیان اپنی عداوت کا پیٹ بھر رہے ہوں گے۔ بہرحال جو دن لکھ دیا گیا ہے اس سے نجات نہیں ہے اور ہم اہلبیتؑ کی وہی مرضی ہے جو ہمارے پروردگار کی مرضی ہے۔ ہم اس کے امتحان پر صبر کر رہے ہیں اور وہ ہمیں صابرین کا مکمل اجر دینے والا ہے۔ رسول اللہ کے اجزا ان سے الگ ہونے والے نہیں ہیں اور سب عنقریب ایک منزل قدس میں جمع ہو جائیں گے۔ جہاں ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہو گی اور خدا اپنے وعدہ کو پورا کر دے گا۔ اب جو ہمارے ساتھ جان دے سکتا ہے اور اللہ کی ملاقات کے لئے اپنے نفس کو آمادہ کر چکا ہے وہ ہمارے ساتھ نکل پڑے۔"

اس کے بعد امام عالیمقامؑ ہر مرحلہ پر مسلسل جناب یحییٰ بن زکریا کا ذکر کرتے رہے اور اپنے مصائب کو ان کے مصائب سے تشبیہ دیتے رہے۔ (ارشاد مفید ص ۲۳۶، اعلام الوریٰ ص ۲۱۸)

اہل کوفہ کی آواز پر لبیک

امام حسین علیہ السلام اپنے علم ذاتی اور حالات کی رفتار دونوں سے اس امر کا

یقین رکھتے تھے کہ اس سفر کا انجام شہادت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ رسول اکرمؐ آپ کو شہادت کی خبر دے چکے تھے اور آپ کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ بیعتِ یزید کر لیں یا جان دے دیں۔

اور آپ دربار ولید ہی سے اعلان کر چکے تھے کہ مجھے بیعت کا راستہ اختیار نہیں کرنا ہے اور انجام کار شہید ہو جانا ہے جس کی طرف مروان نے بھی اشارہ کر دیا تھا۔ لیکن آپ نے حفاظت خود اختیاری کے طور پر مکہ کا رُخ کر کے حرم خدا میں پناہ لے لی۔

(طبری ۶/۱۹۰)

اس کے بعد مکہ میں بھی یہ واضح ہو گیا تھا کہ یزید کے سپاہی خانۂ کعبہ کے گرد حالتِ طواف میں قتل کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ آپ نے اپنے بھائی محمد حنفیہ کو بھی بتا دیا تھا اور ابن زبیر کے جواب میں بھی فرما دیا تھا کہ "خدا کی قسم میں کسی جانور کے سوراخ میں بھی چلا جاؤں تو یہ مجھے نکال کر اپنی عداوت کی پیاس بجھائیں گے اور مجھ پر ویسا ہی ظلم کریں گے جیسے یہودیوں نے یوم السبت کے بارے میں کیا تھا۔ میں حرم سے ایک بالشت باہر قتل ہو جاؤں تو یہ حدود حرم میں قتل ہونے سے بہر حال بہتر ہے۔ اس کے بعد ابن عباس سے فرمایا کہ "میں ایسے ایسے مقام پر قتل ہو جاؤں تو وہ بھی اس سے بہتر ہے کہ مکہ میں مارا جاؤں اور حرمت حرم کو حلال بنا لیا جائے۔"

گویا کہ امامؑ اس امر کی وضاحت کر رہے تھے کہ میرا انجام بہر حال قتل ہے اور میں آخر دم تک بیعتِ یزید سے انکار کرتا رہوں گا اور اس کے نتیجہ میں قتل کر دیا جاؤں گا۔ اہلِ کوفہ کے مطالبہ کا مسئلہ اس صورت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے۔

سفر کوفہ

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اہلِ کوفہ نے مسلسل خطوط بھیجے اور یہ لکھا کہ ہمارے پاس امام نہیں ہے۔ آپ تشریف لے آئیں تا کہ آپ کے ذریعہ لوگ حق پر جمع ہو جائیں۔ نعمان بن بشیر دار الامارہ میں ضرور ہے لیکن ہم لوگ اس کے ساتھ جمعہ یا عید میں شرکت نہیں

کرتے ہیں اور اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ تشریف لا رہے ہیں تو ہم اسے نکال باہر کردیں گے اور شام کی طرف روانہ کردیں گے۔

مکمل مضمونِ خط یہ تھا کہ یہ خط حضرت حسینؑ بن علیؑ کے نام ہے ان کے مسلم و مومن شیعوں کی طرف سے! آپ فوراً تشریف لے آئیں۔ لوگ آپ کے منتظر ہیں اور ان کی نظر میں آپ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ العجل العجل۔

اس کے بعد روسار کوفہ نے لکھا کہ آپ تشریف لے آئیں۔ آپ کا لشکر تیار ہے۔ پھر لکھا گیا کہ آپ کے ساتھ ایک لاکھ تلواریں ہیں۔ (طبری ۶/۲۲۱، مثیر الاحزان صفہ ۱۶)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے انفرادی اور اجتماعی خطوط کے بعد اگر امام حسینؑ اہلِ کوفہ کی آواز پر لبیک نہ کہتے اور یزید کی بیعت کا اقرار یا انکار کرنے کے بعد شہید ہو جاتے جو ایک طے شدہ مسئلہ تھا تو آپ پر اہلِ کوفہ کی حجت تمام ہو جاتی اور آپ ان کے حق میں مقصر شمار کئے جاتے اور ہر دور میں یہ بات دُہرائی جاتی کہ آپ نے اعوان وانصار سے منھ موڑ کر اپنے کو موت کے منھ میں ڈال دیا۔

لہٰذا امام حسینؑ کا اہلِ کوفہ کے ساتھ مثبت برتاؤ ان پر اتمامِ حجت کی بنیاد پر تھا اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ورنہ اگر آپ اہلِ کوفہ کے خطوط کے دھوکہ میں آکر کوفہ کا رُخ کرتے تو جیسے ہی مسلم وہانی کی شہادت کی خبر ملی تھی فوراً واپس ہو جاتے اور حُر بن یزید کے رسالہ سے ملاقات کی نوبت ہی نہ آتی۔

مگر اتمامِ حجت ایک فریضہ تھا لہٰذا آپ نے اس وقت تک سفر جاری رکھا جب تک حُر کے رسالہ نے راستہ روک کر دوسرے راستہ پر چلنے پر مجبور نہیں کر دیا اور یہیں سے اس امر کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ آپ کے سفر میں شہادت مسلم وہانی کا بھی کوئی دخل نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنی عقیل نے شہادت مسلم کی خبر سننے کے بعد یہ کہہ دیا کہ ہم اپنی جگہ سے نہ ہٹیں گے جب تک مسلم کے خون کا بدلہ نہ لے لیں یا خود بھی قتل نہ ہو جائیں۔ اور امام حسینؑ اسی بنیاد پر اپنے سفر کو جاری رکھے رہے۔

جب کہ یہ بات ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ اس کلام کا اصل موقف سے کوئی تعلق

نہیں ہے اور اصل موضوع یہ ہے کہ امام حسینؑ کو یہ معلوم تھا کہ اس سفر کا انجام بہر حال شہادت ہے اور آپ کو یزید کی بیعت کسی قیمت پر نہیں کرنا ہے۔ اب اس کے بعد صرف اہلِ عراق پر اتمام حجت کا مرحلہ باقی تھا لہٰذا آپ نے اس فرض کو بھی ادا کر دیا اور حر کے لشکر سے لیکر روز عاشور تک مسلسل اس بات کو دُہراتے رہے کہ میں تمہارے بُلانے پر آیا ہوں ـــ اور اس کا انتقام مسلم وہانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

امام حسینؑ کا یہ اتمام حجت اسقدر کامیاب ہوا کہ اس کی آواز سارے عالم میں پھیل گئی اور صبح قیامت تک اس کی گونج باقی رہے گی۔ آپ نے صرف بیعتِ یزید سے انکار کر کے خانہ نشینی نہیں اختیار کی کہ گھر میں قتل ہو جاتے اور خون ناحق بالکل بیکار ہو کر رہ جاتا اور سرکاری ایجنسیاں اس کے آثار تک مٹا دیتیں ـــ بلکہ آپ نے اس خبر کے نشر ہونے کے سارے انتظامات بھی کئے۔ حقیقت امر کی مکمل وضاحت کی خلافت کے موقف کو بے نقاب کیا اور اس کے بعد جان۔ جہان آفرین کے حوالہ کر دی۔

امام حسینؑ کی حکمتِ عملی

سب سے پہلے آپ نے مدینہ میں "خلافت گروپ" پر یہ اعتراض کیا کہ اس نے جس بیعت کے ذریعہ خلافت یزید کو شرعی بنا دیا ہے۔ وہ بیعت مہمل اور بے معنی ہے اور اس انداز سے اعتراض کیا کہ اس کی خبر تمام علاقہ میں پھیل گئی۔

اس کے بعد مکہ کا رُخ کیا تو ابن زبیر کی طرح خفیہ راستہ سے نہیں گئے بلکہ شاہراہ اعظم سے گئے تاکہ لوگوں کو اس اقدام کی اطلاع رہے۔ مکہ میں حرم خدا کی پناہ میں رہے تاکہ عمرہ کے لئے آنے والوں سے ملاقات ہوتی رہے اور انھیں اپنے جد بزرگوار کی سیرت اور یزید کے انحرافات سے باخبر کرتے رہیں۔

اس کے بعد اپنی دعوت کا اعلان عام کیا تو لوگوں کو خطوط لکھ دئے اور خلافت کے مقابلہ میں مسلح قیام کا ارادہ ظاہر کر دیا تاکہ صورت حال کو بدلا جا سکے۔ مقصد شریعتِ اسلام کا احیاء رہے۔ مقصد حکومت کا قیام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے کسی پر احسان نہیں رکھا اور نہ کسی خطاب یا خط میں اس طرح کا کوئی اشارہ دیا کہ حکومت قائم کرنے کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ بلکہ برابر جناب یحییٰ بن زکریا کا ذکر کرتے رہے اور اپنے قیام کو ان کے حالات سے تشبیہ دیتے رہے کہ انھوں نے بھی وقت کے طاغیہ کے خلاف قیام کیا تھا اور آخر میں ان کا سر قلم کر لیا گیا تھا اور میں بھی ایسے ہی ظالم کے خلاف قیام کر رہا ہوں۔ لہٰذا مجھے بھی اپنا انجام معلوم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یحییٰ بن زکریا تنہا اٹھے تھے اور میں اپنے اعوان و انصار اور اہلِ حرم کے ساتھ قیام کر رہا ہوں۔

یہ طریقۂ کار کسی ایسے آدمی کا نہیں ہوتا ہے جو حکومت کا امیدوار ہوتا ہے اور

قیامِ حکومت کے لئے آواز اٹھاتا ہے۔ حکومت سازی کرنے والا قوم کو انجام سے بے خبر رکھتا ہے اور امام حسینؑ برابر انجام سے باخبر کر رہے تھے۔

مکہ معظمہ میں چار مہینہ تک آپ نے پہلے عمرہ کرنے والوں سے ملاقات کی۔ اس کے بعد اطراف عالم سے حج کے قافلے آنے لگے اور انھیں صورت حال سے آگاہ کرنے لگے کہ اچانک ۸ ذی الحجہ کو جب سب احرام باندھ رہے تھے۔ آپ نے عمرہ کا احرام ختم کر کے باہر نکلنے کا ارادہ کرلیا اور یہ اعلان کر دیا کہ مجھے "خلافت گروپ" سے عین حالتِ طواف میں قتل کا خطرہ ہے اور میں سرزمینِ حرم کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔

"میں حرم سے ایک بالشت باہر قتل کیا جاؤں یہ گوارا ہے۔ لیکن حرم کے اندر قتل ہونا گوارا نہیں ہے۔"

یہ اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ آپ کا ارادہ مقابلہ کر کے جان دینے کا ہے۔ حکومت سازی کا نہیں ہے اور نہ اس کے امکانات ہیں۔

حاجیوں کے قافلے واپس ہونا شروع ہوئے اور امام حسینؑ کے اقدام کی خبر سارے عالم اسلام میں پھیل گئی کہ آپ نے موجودہ خلافت کے خلاف مسلح قیام کا ارادہ کرلیا ہے اور آپ کی نظر میں یہ خلافت اسلام کے لیے ایک کھلا ہوا خطرہ ہے لہٰذا اس سے مقابلہ ضروری ہے چاہے انجام کچھ بھی ہو۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے عالم اسلام میں یہ شوق پیدا ہو گیا کہ اس طرح کے اقدام کا انجام معلوم کریں اور صورت حال سے مکمل طور سے آگاہ رہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں برابر یہ خبر پہونچ رہی تھی کہ امام حسینؑ کے ارادہ کو نہ عبد اللہ بن عمر کا یہ قول بدل سکا ہے کہ "میں ایک مقتول کو رخصت کر رہا ہوں۔"

نہ فرزدق کی یہ خبر بدل سکی ہے کہ "لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ لیکن تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔"

اور نہ عمرہ کی عائشہ کے حوالہ سے روایت روک سکی ہے کہ حسینؑ ارضِ بابل پر قتل کیے جائیں گے۔

بلکہ آپ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں اور بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہیں تاکہ جو لوگ حج سے واپسی پر ساتھ آنا چاہیں۔ وہ بھی آجائیں۔

اس کے بعد آپ نے اشتہار کا ایک اور راستہ اختیار کیا کہ بادشاہ کے بھیجے ہوئے تحائف کو روک دیا کہ یزید مسلمانوں کا خلیفہ نہیں ہے لہٰذا ان تحائف کا حقدار نہیں ہے اور اس طرح مسلمانوں پر اتمام حجت کا ایک اور طریقہ سامنے آگیا۔

اس کے بعد آپ نے حُر کے پیاسے لشکر کو سارا پانی پلا دیا تاکہ اس عجیب و غریب اقدام کی خبر بھی پھیل جائے اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ فرزند رسولؐ نے پیاسے لشکر پر حملہ کرنے کے بجائے اسے پانی پلایا ہے اور اس کے بعد اس طرح اتمامِ حجت کیا ہے کہ "میں خدا اور تمھارے سامنے یہ عذر پیش کر رہا ہوں کہ میں تمھارے خطوط کے نتیجہ میں بلانے پر آیا ہوں اور از خود نہیں آیا ہوں۔ تم نے لکھا تھا کہ ہمارے پاس کوئی امام نہیں ہے۔ آپ آجائیں تو لوگ ہدایت پر جمع ہو جائیں گے۔ تو اگر تم لوگ اپنے عہد پر قائم ہو تو میں آگیا ہوں۔ اب اطمینان بخش برتاؤ کرو تاکہ تمھارے شہر میں قدم رکھوں ورنہ چھوڑ دو۔ میں واپس چلا جاؤں۔

اس کے بعد دوسرا خطبہ ارشاد فرمایا۔ " اگر تم لوگ خدا سے ڈرو اور حق کو پہچان لو تو اسی میں رضائے خدا ہے۔ ہم اہلبیتؑ ان تمام دعویدارانِ خلافت سے زیادہ خلافت کے حقدار ہیں اور ہمارا ساتھ دینا ضروری ہے۔"

اس کے بعد اپنے اصحاب پر حجت تمام کی اور فرمایا " کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور باطل سے پرہیز نہیں ہو رہا ہے۔ ان حالات میں تو مومن لقائے الٰہی میں حق بجانب ہے۔ میری نگاہ میں اب موت ایک سعادت ہے اور ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا ایک مصیبت اور ذلّت ہے۔"

جس کے بعد اصحاب نے عرض کیا کہ اگر یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی ہو اور ہمارے ہمیشہ رہنے کا امکان ہو اور اس سے جُدائی آپ کی نصرت اور مواسات میں ہو تو ہم دنیا سے نکل جانے ہی کو ترجیح دیں گے۔

اس کے بعد جب طرماح نے مشورہ دیا کہ آپ طے کی پہاڑیوں کی طرف چلے جائیں وہاں بیس ہزار جاں نثار مل جائیں گے تو فرمایا کہ ہمارے اور قوم کے درمیان ایک بات طے ہو چکی ہے اور اس سے انحراف ممکن نہیں ہے۔ تاکہ اتمام حجت میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔

امام حسینؑ نے اس پانچ مہینہ کے اندر سارے عالم اسلام کے اطراف و جوانب پر حجت تمام کر دی اور مکہ و مدینہ سے لے کر کوفہ و بصرہ تک بلکہ شام تک اپنی آواز پہونچا دی اور خطب و کتب و رسائل کے ذریعہ یہ واضح کر دیا کہ میں اس حکومت کو برداشت نہیں کر سکتا ہوں جو اسلام کے لئے ایک مجسم اور مکمل خطرہ ہے۔

آپ نے لوگوں سے بیعت لے کر مسلح قیام کا بھی اعلان کر دیا اور سب کو ساتھ آنے کا موقع بھی فراہم کر دیا کہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ فرزند رسولؐ اچانک قتل ہو گئے اور ہمیں ان کی نصرت کا موقع نہیں مل سکا۔

اس کے بعد روز قیامت اس خون ناحق کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر رہے گی۔ یہ اور بات ہے کہ مہمان بُلا کر مارنے کا عار صرف اہل کوفہ کے ذمہ رہے گا۔

امام حسینؑ نے پہلے مذکورہ بالا اسالیب اور وسائل سے تمام مسلمانوں پر حجت تمام کی اور اس کے بعد کربلا پہونچ کر پرستارانِ خلافت پر مسلسل اقوال و اعمال سے اتمام حجت کرتے رہے۔

پہلے یہ پیشکش کی کہ آپ کو آزاد چھوڑ دیا جائے تاکہ اسلحہ رکھ کر اپنی منزل کی طرف یا کسی سرحدی علاقہ کی طرف چلے جائیں جہاں یزید کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہ ہو جس طرح کہ سعد بن ابی وقاص۔ عبداللہ بن عمر اور اسامہ بن زید نے امیرالمومنینؑ سے طے کیا تھا کہ بیعت نہیں کریں گے اور کسی علاقہ میں پناہ لے لیں گے۔ اور جب یہ دیکھا کہ لشکرِ خلافت بیعت یزید اور تسلیم ابن زیاد سے کم پر راضی نہیں ہے تو لقائے الٰہی کے لئے تیار ہو گئے لیکن آخری اتمامِ حجت کے طور پر ۹ محرم کی شام کو ایک رات کی مہلت طلب کر لی تاکہ یہ رات

عبادت الٰہی میں گذر جائے اور اس میں بھی اپنے اصحاب کو جمع کر کے فرمایا کہ "میرے خیال میں اب کل دشمنوں کا سامنا ہونے والا ہے لہٰذا میں تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ سب آزاد ہو کر چلے جاؤ اور کسی پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ رات کا پردہ حائل ہے اسے غنیمت جانو اور ہر شخص میرے گھر والوں میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ لیتا جائے۔ خدا تم سب کو جزائے خیر دے۔ سب چلے جاؤ۔ یہ قوم صرف میری طلبگار ہے اور جب میں مل جاؤں گا تو باقی سب سے غافل ہو جائیں گے۔

جسے سُن کر بنی ہاشم کے جوانوں کو جوش آگیا اور کہنے لگے کہ کیا یہ سب زندہ رہنے کے لئے ہوگا۔ خدا وہ دن نہ دکھلائے۔

پھر بنی عقیل سے فرمایا کہ تمھارے لئے مسلم کا قتل کافی ہے۔ اب تم چلے جاؤ۔ میں اجازت دے رہا ہوں۔ تو انھوں نے عرض کی کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ہے ہم اپنی جان۔ مال۔ اولاد سب قربان کر دیں گے اور آپ کے ساتھ رہیں گے۔ خدا بُرا کرے اس زندگی کا جو آپ کے بعد باقی رہے۔

اس کے بعد انصار کی تقریر شروع ہوئی اور سب سے پہلے مسلم بن عوسجہ نے عرض کی۔ کیا ہم آپ کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں؟ روزِ قیامت پروردگار کو کیا جواب دیں گے؟ خدا کی قسم اُس وقت تک جُدا ہونے کا امکان نہیں ہے جب تک ان کے سینوں میں ہمارے نیزے اور ان کی گردنوں میں ہماری تلواریں در نہ آجائیں اور اگر کوئی اسلحہ باقی نہ رہ گیا تو ہم پتھر سے مقابلہ کریں گے یہاں تک کہ آپ کے ساتھ قربان ہو جائیں۔

اور پھر سعید بن عبداللہ الحنفی نے کہا کہ "خدا کی قسم ہم آپ سے الگ نہیں ہو سکتے جب تک یہ ثابت نہ کر دیں کہ ہم نے رسول اکرمؐ کی قرابت کا تحفظ کیا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ہم قتل کے بعد پھر زندہ کیے جائیں گے اور ہماری لاش کو جلا دیا جائے گا اور ہماری خاک کو ہوا میں اُڑا دیا جائے گا اور اسی طرح ستّر مرتبہ ہوتا رہے گا تب بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ یہ تو صرف ایک مرتبہ کا مرنا ہے۔ اس کے بعد دائمی کرامت و عزّت ہے۔

اس کے بعد تمام اصحاب نے ایک ایک کر کے اپنے جذبہ کا اظہار کیا اور پھر تمام رات عبادتِ الٰہی میں بسر ہو گئی۔

راوی کا بیان ہے کہ "جب امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کی شام ہوئی تو ساری رات نماز، دعا اور استغفار و تضرع میں گذار دی"۔

اس کے بعد سب دشمن کے مقابلہ اور اتمام حجت کے لئے تیار ہو گئے، امام عالیمقام نے حکم دیا کہ خیموں کے پیچھے خندق کھود کر اس میں لکڑیاں بھر دی جائیں۔ اصحاب نے یہ کام بھی انجام دیدیا اور اس کے بعد جب صبح کو مقابلہ شروع ہوا تو خیموں کو اپنی پشت پر رکھا۔ سامنے سے جہاد شروع کیا اور خندق میں آگ روشن کر دی تاکہ پس پشت سے حملہ نہ ہونے پائے اور دشمن پر ہر طرح سے حجت تمام ہو جائے۔

اس کے بعد امام عالیمقام اور اصحاب و انصار برابر اپنے خطبوں کے ذریعہ اتمام حجت کرتے رہے اور جب مقابلہ کا وقت آگیا تو امام حسینؑ ایک ناقہ پر سوار ہو کر قوم کے سامنے آئے اور انھیں خاموش کر کے اس طرح خطبہ ارشاد فرمایا:

"ایہا الناس! میری بات سنو اور جلدی نہ کرو تاکہ میں تمھیں نصیحت کر سکوں۔ تم نے رسول اکرمؐ پر ایمان اختیار کیا اور پھر ان کی ذریت اور عترت پر حملہ کر کے انھیں قتل کرنا چاہتے ہو۔ سوچو! میں کون ہوں۔ اپنے نفس کو ملامت کرو اور سوچو کہ کیا میرا قتل اور میری بے حرمتی جائز ہے۔

کیا میں تمھارے نبی کی بیٹی کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا تم نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں یہ ارشاد پیغمبرؐ نہیں سنا ہے کہ "یہ دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہیں" اگر تمھیں اس قول میں شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں نبیؐ کا نواسہ ہوں۔ خدا کی قسم شرق و غرب عالم میں میرے علاوہ کوئی تمھارے نبی کا نواسہ نہیں ہے۔

افسوس ہے تمھارے حال پر۔ تم مجھ سے کسی مقتول کے خون کا بدلہ چاہتے ہو۔ یا کسی مال کا انتقام لینا چاہتے ہو یا کسی زخم کا قصاص طلب کر رہے ہو۔

اے شبث بن ربعی۔ اے حجار بن ابجر۔ اے قیس بن الاشعث۔ اے زید بن الحارث!

کیا تم لوگوں نے نہیں لکھا تھا کہ آئیے۔ خرمے پک گئے ہیں۔ علاقہ سبزہ زار ہو گیا ہے اور لشکر بالکل تیار اور آمادہ ہے۔

اگر تم لوگ میرے آنے کو بُرا سمجھتے ہو تو میں واپس چلا جا رہا ہوں۔"

جس پر قیس بن الاشعث نے کہا کہ کیا تم یزید کی بیعت نہیں کرو گے؟

اور آپ نے فرمایا کہ اس حرام زادہ کے فرزند حرام زادہ نے مجھے دوراہہ پر کھڑا کر دیا ہے کہ تلوار کھینچ لوں یا ذلّت برداشت کر لوں اور میں ذلّت برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔

خدا کی قسم میرے بعد تم بہت کم باقی رہ سکو گے اور زمانہ کی چکی تمھیں پیس ڈالے گی۔ یہ میں نے اپنے جد بزرگوار رسول اکرمؐ سے سُنا ہے۔ پھر آسمان کا رُخ کیا۔ خدایا ان سے آسمان کی بارش کو روک لے اور ان پر اُس بنی ثقیف کے جوان کو مسلط کر دے جو انھیں موت کے تلخ جام پلا دے۔ (لہوف ص۵۶، مقتل خوارزمی ۲/۷)

اب وہ وقت آگیا ہے کہ لشکر خلافت فرزند رسولؐ سے جنگ کر رہا ہے اور تقاضا یہ ہے کہ یزید کی بیعت کر لیں اور ابن زیاد کے حکم کو تسلیم کر لیں۔ لشکر خلافت کا مقصد یہ ہے کہ فرزند رسولؐ کو قتل کر کے خلیفۂ وقت کی رضا حاصل کر لیں اور مال دنیا سے جیب بھر لیں۔ اور لشکرِ امامت کا تصور یہ ہے کہ جان دے کر دین خدا کو بچا لیں اور روزِ قیامت مرضیٔ پروردگار اور ثواب الٰہی کے حقدار ہو جائیں۔

لشکرِ خلافت کی ترجمانی ابن سعد کر رہا تھا جب اس نے پہلا تیر خیام حسینی کی طرف یہ کہہ کر رہا کیا کہ لشکر والو! امیر کے سامنے گواہی دینا کہ سب سے پہلا تیر میں نے پھینکا ہے۔

اور لشکرِ امامت کی ترجمانی امام حسینؑ کی اس دعا سے ہو رہی تھی "خدایا جو ہر کرب و رنج میں میرا اعتماد اور ہر شدّت و مصیبت میں میری امیدوں کا مرکز ہے۔"

دونوں لشکر اپنے اپنے اقوال و افعال سے اپنے نفوس کے اسرار کا انکشاف کر رہے ہیں اور تاریخ دونوں کے بیانات محفوظ کر رہی ہے تاکہ آئندہ نسلوں پر بھی حجّت تمام ہو جائے اور کوئی دَور اندھیرے میں نہ رہ جائے۔!

مقتل آلِ رسولؐ

پہلا شہید

طبری کا بیان ہے کہ کربلا میں اولادِ ابوطالب میں پہلے شہید علی اکبرؑ بن حسینؑ بن علیؑ تھے جن کی ماں کا نام لیلیٰ بنت ابو مرہ بن عروہ بن مسعود الثقفی تھا اور ان کی ماں میمونہ بنت ابی سفیان بن حرب تھیں اور اسی اعتبار سے انھیں امان کی پیشکش کی گئی تھی اور مصعب زبیری کے مطابق ان سے کہا گیا تھا کہ "تم کو امیرالمومنین یزید بن معاویہ سے قرابت حاصل ہے جسکی رعایت ضروری ہے لہٰذا تم چاہو تو تمھیں امان دی جاسکتی ہے"۔ جس کے جواب میں علی اکبرؑ نے کہا تھا کہ "رسول اللہ کی قرابت زیادہ قابلِ احترام ہے" اور یہ کہہ کر حملہ کر دیا تھا۔ (مقاتل الطالبین ص۸۰، طبری طبع یورپ ۲/۳۵۶-۳۵۷، نسب قریش مصعب ص۵۷)

خوارزمی کا بیان ہے کہ علی اکبرؑ کو دیکھ کر امام حسینؑ نے سر آسمان کی طرف اٹھایا اور کہا "خدایا تو اس قوم پر گواہ رہنا کہ اس کی طرف وہ نوجوان جا رہا ہے جو صورت میں، سیرت میں اور لہجہ میں سب سے زیادہ تیرے پیغمبرؐ سے مشابہ ہے کہ میں جب تیرے رسول کا مشتاق ہوتا تھا تو اس جوان کے چہرہ کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ خدایا اس قوم کو زمین کے برکات سے محروم کر دینا اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ انھیں مختلف راستوں میں تقسیم کر دینا اور ان سے کبھی حکام راضی نہ رہنے پائیں۔ انھوں نے ہمیں وعدۂ نصرت کے ساتھ بلایا اور پھر ہم سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گئے"۔

اس کے بعد آپ نے عمر سعد کو پکار کر کہا۔ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اللہ تیری نسل کو قطع کر دے اور تجھے کسی کام میں برکت نہ دے اور تیرے اوپر ایسے شخص کو مسلط کر دے

جو تجھے بستر ہی پر ذبح کر دے جیسے تو نے میری قرابت کا خیال نہیں کیا ہے اور میری نسل کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

اس کے بعد آپ نے باآواز بلند آیت کریمہ کی تلاوت کی "ان اللہ اصطفیٰ آدم ونوحا وآل ابراھیم وآل عمران علی العٰلمین۔ ذریۃ بعضھا من بعض واللہ سمیع علیم"۔

اس کے بعد علیؑ بن حسینؑ نے یہ رجز پڑھ کر حملہ کیا:

"میں علیؑ بن الحسینؑ بن علیؑ ہوں۔ خانۂ کعبہ کی قسم ہم نبی سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ ہمارے درمیان زنا زادہ حکومت نہیں کر سکتا ہے اور میں تم سے برابر نیزہ بازی کرتا رہوں گا اور تلواروں سے جنگ کروں گا جب تک تلواریں ٹیڑھی نہ ہو جائیں کہ میری ضربت ایک جوان ہاشمی علوی کی ضربت ہے"۔

اور یہ جہاد اس وقت تک جاری رہا کہ اہل کوفہ فریاد کرنے لگے اور آپ پلٹ کر باپ کے پاس آئے۔ بابا۔ پیاس مارے ڈال رہی ہے اور گرانی اسلحہ تھکائے ڈال رہی ہے۔ کیا ایک گھونٹ پانی کی سبیل ہے کہ میں جنگ کی قوت حاصل کر لوں۔

امام حسینؑ رو دئے اور فرمایا کہ بیٹا۔ حضرت محمدؐ۔ حضرت علیؑ اور تیرے باپ کے لئے یہ بڑا سخت مرحلہ ہے کہ تو آواز دے اور ہم لبیک نہ کہہ سکیں۔ تو فریاد کرے اور ہم کام نہ آسکیں۔ اور یہ کہہ کر ایک انگوٹھی دے دی اور فرمایا کہ اسے اپنے منہ میں رکھ لو اور جا کر جہاد کرو۔ عنقریب تمہارے دادا تمہیں جام کوثر سے اس طرح سیراب کر دیں گے کہ پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔

یہ سن کر علی اکبرؑ میدان میں واپس آئے اور رجز شروع کیا:

"جنگ کے حقائق واضح ہو چکے ہیں اور اس کے موارد بالکل نمایاں ہیں۔ صاحب عرش کی قسم میں ہرگز تم کو نہ چھوڑوں گا اور نہ تلوار کو نیام میں رکھوں گا"۔

طبری کا بیان ہے کہ آپ بار بار حملہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مرہ بن منقذ بن نعمان عبدی لیثی کی نظر پڑ گئی اور اس نے کہا کہ میں عرب کے تمام جرائم کا ذمہ دار ہوں اگر یہ اس طرح

میرے سامنے سے گذر جائیں اور میں ان کے باپ کو ان کا صدمہ نہ دوں۔

چنانچہ آپ حملہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ مرہ بن منقذ نے ایک نیزہ مار دیا اور آپ گھوڑے سے گر پڑے۔ ظالموں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ روح جسم سے نکل رہی تھی کہ آواز دی۔ بابا! یہ میرے جد بزرگوار موجود ہیں اور انھوں نے مجھے جام کوثر سے سیراب کر دیا ہے۔ اب میں کبھی پیاسا نہ ہوں گا۔ یہ آپ سے بھی فرما رہے ہیں کہ جلدی آیئے۔ ایک جام آپ کے لئے بھی موجود ہے۔

(مقتل خوارزمی ۲/۳۱)

طبری نے حمید بن مسلم ازدی سے روایت کی ہے کہ میں نے حسینؑ کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ فرزند! اللہ اس قوم کو قتل کر دے جس نے تجھے قتل کیا ہے۔ اس نے پروردگار اور حرمتِ رسولؐ پر حملہ کیا ہے۔ اب تیرے بعد زندگانی دُنیا پر خاک۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک خاتون تیزی سے خیمہ سے برآمد ہوئیں جس طرح آفتاب طلوع کرتا ہے اور آواز دی۔ بھیا۔ میرے ماںجائے۔ میں آگئی۔! میں نے ان کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ زینبؑ بنت فاطمہؑ بنت رسولؐ اللہ ہیں۔ انھوں نے آکر اپنے کو لاش پر گرا دیا۔ اتنے میں حسینؑ آگئے اور ہاتھ پکڑ کر خیمہ میں واپس کر دیا اور پھر آکر جوانوں کو بُلایا اور فرمایا کہ اپنے بھائی کی لاش اٹھاؤ۔

سب نے مل کر لاش کو اٹھایا اور خیمہ کے سامنے لیجا کر رکھ دیا جہاں مجاہدین مصروفِ جہاد تھے۔

مقتل اولاد ابوطالبؑ

عبداللہ بن مسلم بن عقیل

علی اکبرؑ کے بعد عبداللہؑ بن مسلم بن عقیل بن ابی طالب برآمد ہوئے (طبری طبع یورپ ۲/۳۵۷)، جن کی ماں کا نام رقیہ کبریٰ بنت الامام علیؑ تھا (نسب قریش ص۴۰۵) انھوں نے میدان میں آکر اس طرح رجز پڑھا:

"آج میں اپنے بابا مسلمؑ سے ملاقات کروں گا اور ان جوانوں سے ملوں گا جو دینِ نبی پر قربان ہو گئے۔" (مناقب ابن شہر آشوب ۲/۲۲۰، مقتل خوارزمی ۲/۲۶)

طبری کا بیان ہے کہ عمرو بن صبیح الصدائی نے عبداللہ بن مسلم کو ایک تیر کا نشانہ بنایا تو انھوں نے اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ لیا جس کے نتیجہ میں ہاتھ پیشانی میں چپک کر رہ گیا اور کوشش بسیار کے بعد بھی الگ نہ ہو سکا اور ظالم نے دوسرا تیر دل پر مار دیا اور پھر ظالموں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ (ارشاد مفید ص۲۲۳)

جعفر بن عقیل

خوارزمی اور ابن شہر آشوب کا بیان ہے کہ اس کے بعد جعفرؑ بن عقیل بن ابی طالب میدان میں آئے اور اس طرح رجز پڑھا:

میں بطحا کا رہنے والا ابوطالب کا لال ہوں ۔۔۔ اور بنی ہاشم میں بنی غالب کا فرزند ہوں

ہم تمام قبائل کے سردار ہیں ۔۔۔ اور ہمارا آقا حسینؑ تمام پاکیزہ لوگوں سے زیادہ طاہر ہے

اس کے بعد جہاد کیا اور آخر میں بشر بن سوط الہمدانی نے آپ کا کام تمام کر دیا۔

طبری کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عزرہ الخثعمی نے ایک تیر مار کر جعفر بن عقیل بن ابی طالب کا کام تمام کر دیا۔

واضح رہے کہ طبری نے عام طور پر شہداء کربلا کے رجز کا ذکر نہیں کیا ہے اور ہم نے اس حصہ کو خوارزمی اور ابن شہر آشوب سے اخذ کیا ہے کہ موضوعِ اتمام حجت میں جنگ سے زیادہ رجز کا دخل ہوتا ہے۔

عبدالرحمٰنؑ بن عقیل

اس کے بعد جعفر کے بھائی عبدالرحمٰن میدان میں آئے اور اس طرح رجز پڑھا:

"میرا باپ عقیل ہے لہٰذا میری منزلت اور بنی ہاشم میں میرے مرتبہ کو پہچانو۔ ہمارے بزرگ صداقت کے بزرگ اور ہمسنوں کے سردار ہیں اور یہ آقا حسینؑ بلند منزلت اور جوانانِ جنت کا سردار ہے۔"

اس کے بعد جہاد کیا اور آخر میں عثمان بن خالد الجہنی نے آپ کو شہید کر دیا۔

طبری کے بیان کے مطابق عثمان بن خلاد الجہنی اور بشر بن سوط الہمدانی نے مل کر حملہ کیا اور آخر میں عبدالرحمٰن کو شہید کر دیا۔

محمدؑ بن عبداللہ بن جعفر

خوارزمی اور ابن شہر آشوب کے مطابق اس کے بعد محمد بن عبداللہ بن جعفر میدان میں آئے اور اس طرح رجز پڑھا:

"میں خدا کی بارگاہ میں اس اندھی قوم کے بدترین برتاؤ کی فریاد کر رہا ہوں جس نے قرآن کے احکام و آثار اور تعلیمات کو تبدیل کر ڈالا ہے ۔ اور ظلم و سرکشی کا مسلسل اظہار کر رہی ہے۔"

اور شدید جنگ کرنے کے بعد عامل بن نہشل التیمی کے ہاتھوں درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔

عونؑ بن عبداللہ بن جعفرؑ

اس کے بعد ان کے بھائی عون نے اس طرح رجز پڑھ کر حملہ کیا :

"اگر مجھے نہیں پہچانتے ہو تو میں جعفرؑ کا فرزند ہوں جو شہید راہ خدا ہیں اور جنّت میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں، انھیں پروردگار نے پر پرواز عنایت کئے ہیں اور روز قیامت یہی ہمارے شرف کے لئے کافی ہے۔

اور داد شجاعت دینے کے بعد عبداللہ بن قطبہ الطائی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔
(مناقب ابن شہر آشوب ۲/ ۲۲۰، مقتل خوارزمی ۲/ ۲۷)

فرزندان سبط اکبر امام حسنؑ

اس کے بعد عبداللہ بن الحسنؑ بن علیؑ میدان میں آئے اور اس طرح رجز پڑھا :

"اگر مجھے نہیں پہچانتے ہو تو میں حسنؑ کا لال ہوں جو رسول امین کے نواسہ تھے۔ دیکھو یہ حسینؑ مصائب میں گرفتار ہیں اللہ ان کے دشمنوں کو بارش سے سیراب نہ کرے"۔

اور پھر جہاد کر کے ہانی بن شبیب الحضرمی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ (مناقب ۲/ ۲۲۰، مقتل خوارزمی ۲/ ۲۷)

اس کے بعد ان کے بھائی قاسمؑ میدان میں آئے جو ابھی جوان نابالغ تھے اور امام حسینؑ نے انھیں دیکھ کر گلے سے لگا لیا اور دونوں نے بیحد گریہ کیا۔ اس کے بعد قاسمؑ نے اذن جہاد طلب کیا اور امام حسینؑ نے انکار کر دیا تو بچہ نے چچا کے ہاتھوں اور پیروں کا بوسہ دینا شروع کر دیا یہاں تک کہ امام حسینؑ نے اجازت دے دی اور قاسمؑ اس طرح خیمہ سے برآمد ہوئے کہ رخساروں پر ڈھلکتے ہوئے آنسو بھی دیکھے گئے، جسم پر فقط ایک لباس اور پیروں میں نعلین اور چہرہ چاند کا ٹکڑا، میدان میں آکر رجز پڑھا :

"میں اولاد علیؑ میں قاسم ہوں، خانۂ خدا گواہ ہے کہ ہم نبی کے قریب ترین قرابتدار

ہیں اور ہمارا مقابلہ نہ شمر سے ہو سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے حرام زادہ سے"۔

طبری نے حُمید بن مسلم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ " ایک جوان اس طرح برآمد ہوا جیسے چاند کا ٹکڑا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی اور جسم پر صرف پیراہن۔ پیروں میں نعلین تھیں جس کا ایک کا تسمہ ٹوٹ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر عمرو بن سعد بن نفیل ازدی نے مجھ سے کہا کہ میں ابھی اس کا کام تمام کئے دیتا ہوں۔ تو میں نے کہا کہ سبحان اللہ! اس کا مقصد کیا ہے جب کہ تو دیکھ رہا ہے کہ یہ مسلسل دشمنوں کا خاتمہ کر رہا ہے۔ اس نے کہا بہرحال میں حملہ کرنے جا رہا ہوں اور یہ کہہ کر حملہ کر دیا اور سر پر ایسی تلوار لگائی کہ نوجوان گھوڑے پر سنبھل نہ سکا۔ آواز دی چچا جلدی آیئے۔ حسینؑ شیر غضبناک کی طرح بڑھے اور باز کی طرح جھپٹ کر دشمنوں کو ہٹایا۔ ایک وار کر کے عمرو کے ہاتھ کاٹ دیئے اور اس نے فریاد بلند کر دی۔ جس کے نتیجہ میں کوفہ کے لشکر بڑھے تاکہ عمرو کو حسینؑ کی گرفت سے بچائیں لیکن گھوڑوں کی دوڑ میں ظالم ٹاپوں کی زد میں آکر پامال ہو گیا اور جب غبارِ جنگ ہٹا تو میں نے دیکھا کہ حسینؑ قاسم کے سرھانے بیٹھے ہیں اور بچہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ حسینؑ مرثیہ پڑھ رہے ہیں:

> "خدا اس قوم کا بُرا کرے جس نے تجھے قتل کیا ہے اور اس کا سامنا روزِ قیامت تیرے جد کا ہو گا۔ بیٹا تمھارے چچا کے لئے یہ بہت سخت مرحلہ ہے کہ تم نے بلایا اور میں لبیک نہ کہہ سکا یا پہونچا تو تمھارے کام نہ آسکا۔ اب تو میرے انصار اور کم ہوتے جا رہے ہیں"۔

یہ کہہ کر بچہ کو لے کر چلے اس طرح کہ پیر زمین پر خط دیتے جا رہے تھے اور حسینؑ قاسم کے سینے کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ میں سوچتا رہا کہ حسینؑ کرنا کیا چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دیکھا کہ بھتیجہ کو فرزند کے پہلو میں لٹا دیا اور خاندان کے سارے شہید ایک مقام پر جمع کر دئے میں نے یہ سارا منظر دیکھ کر کسی سے پوچھا کہ آخر یہ نوجوان کون ہے؟ تو بتایا گیا کہ قاسم بن الحسنؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں۔!

شہادت برادران امام حسینؑ

ابوبکرؑ بن علیؑ

اس کے بعد برادران امام حسینؑ نے میدان کا رُخ کیا کہ آپ کے سامنے ہی راہِ خدا میں قربان ہو جائیں۔ سب سے پہلے ابوبکر بن علیؑ جن کا اصلی نام عبداللہ تھا اور ان کی والدہ لیلیٰ بنت مسعود بن خالد بن ربعی بن مسلم بن جندل بن نہشل بن دارم التمیمی تھیں۔ ابوبکر کے رجز کا انداز یہ تھا:

"میرا باپ علیؑ ہے صاحب مناقب و مفاخر۔ بنی ہاشم میں کریم اور صاحب فضل و شرف یہ حسینؑ رسول اکرمؐ کا فرزند ہے۔ اور میں چمکتی ہوئی تلوار کے ذریعہ اس سے دفاع کروں گا میری جان اس برادر معظم پر قربان ہے۔ پروردگار مجھے اس قربانی کا اجر جزیل عنایت فرما

یہ سُن کر زحر بن قیس النخعی نے حملہ کیا اور آپ کو شہید کر دیا۔

عمرؑ بن علیؑ

اس کے بعد دوسرا بھائی میدان میں آیا اور اس نے اپنے بھائی کے قاتل کو مخاطب کر کے رجز پڑھا:

"میں تم سب کا خاتمہ کر دوں گا مگر افسوس کہ میں اس کا فرزحر کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ نکل اے زحر سامنے آ۔ عمر سعد سے انعام چاہتا ہے۔ تجھے آج ہی جہنم واصل ہونا ہے جو بد ترین جگہ شعلوں کے درمیان ہے کہ تو نے حق کا انکار کیا ہے اور تو بد ترین بشر ہے"۔

اور پھر اس پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیا اور مسلسل تلوار چلاتے رہے اور کہتے رہے:

"میرے سامنے سے ہٹ جاؤ کہ میں ایک شیر غضبناک کے مانند ہوں۔
میں تمھیں اپنی تلوار سے کاٹ ڈالوں گا اور میں نہ بھاگنے والا ہوں اور نہ کہیں
چھپنے والا ہوں۔"
لیکن آخر میں درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔

عثمانؑ بن علیؑ

اس کے عثمان میدان میں آئے جن کی والدہ جناب ام البنین بنت حزام بن خالد تھیں اور بنی کلاب سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ نے اس انداز سے رجز پڑھا:

"میں صاحب مفاخر عثمان ہوں ۔ اور میرا باپ پاکیزہ کردار علیؑ ہے
جو اس رسولؐ کا بھائی ہے جس کی ہدایت کا سلسلہ تمام حاضر و غائب تک پھیلا
ہوا ہے۔
اور پھر جہاد کر کے راہ خدا میں شہید ہو گئے۔

عبداللہؑ بن علیؑ

اس کے بعد عبد اللہ میدان میں آئے۔ ان کی والدہ بھی جناب ام البنین تھیں اور انھوں نے یہ رجز پڑھ کر حملہ کیا:

"میں صاحب شرف و فضل اور صاحب کردار علیؑ کا بیٹا ہوں ۔۔۔
جو رسول اکرمؐ کی تلوار اور ان سے ہر مصیبت کا دفع کرنے والا تھا"۔
اور پھر دادِ شجاعت دے کر شہید ہو گئے۔ (مقتل خوارزمی ۲/ ۲۸۔۲۹)

طبری حُمید بن مسلم کی زبانی نقل کرتا ہے کہ میں نے اس دن حسینؑ کو یہ کہتے سُنا ہے کہ "خدایا! اس قوم سے بارش کو روک دے اور اسے زمین کی برکتوں سے محروم کر دے۔ خدایا! اگر انھیں چند دن آرام بھی دے تو ان میں جدائی ڈال دے اور انھیں مختلف حصّوں میں تقسیم کر دے۔ ان کے حکّام کبھی ان سے راضی نہ ہوں کہ انھوں نے مدد کا

وعدہ کر کے ہمیں بلایا اور اب ہمیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے پیادوں پر حملہ کیا اور سب کو بھگا دیا۔ اس کے بعد جب صرف تین چار افراد رہ گئے تو ایک اچھا خاصا لباس طلب کر کے اسے پارہ کیا اور پہن لیا تاکہ بعد میں ظالم لوٹنے نہ پائیں اور کسی لباس ذلت کو گوارا نہ کیا لیکن شہادت کے بعد بحر بن کعب نے اسے بھی لوٹ لیا۔

ابومخنف کا بیان ہے کہ مجھ سے عمرو بن شبیب نے محمد بن عبدالرحمٰن کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ بحر بن کعب کے دونوں ہاتھ ایسے ہو گئے تھے کہ سردیوں میں ان سے پانی ٹپکتا تھا اور گرمیوں میں لکڑی کی طرح خشک ہو جاتے تھے۔

شہادت عباسؑ بن امیرالمومنینؑ

مقاتل الطالبیین کے مطابق آپ انتہائی وجیہ وجمیل انسان تھے اور قد و قامت کی کیفیت یہ تھی کہ اسپ دورکابہ پر سوار ہوتے تھے تو پیر زمین پر خط دیتے جاتے تھے۔ آپ کا لقب قمر بنی ہاشم تھا اور روز عاشور آپ امام حسینؑ کے علمدار لشکر تھے۔ اولاد ام البنین میں سب سے بڑے تھے اور سب سے آخر میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

مقتل خوارزمی کی روایت ہے کہ عباسؑ سقائے حرم تھے۔ جب خیمہ سے برآمد ہوئے تو اس طرح رجز پڑھ رہے تھے:

"خدائے عزیز وعظیم کی قسم اور مکہ و زمزم کی قسم۔ حطیم اور صحنِ کعبہ کی قسم کہ میں آج اپنے خون میں نہانے کے لئے آیا ہوں۔ صاحب مناقب و مفاخر حسینؑ کی خدمت میں، جو تمام اہل فضل و کرم کے امام ہیں۔"

(مقتل خوارزمی ۲/۲۹-۳۰)

ارشاد مفید صـ۲۴۰، اعلام الوریٰ صـ۲۴۴، مثیر الاحزان صـ۵۳، لہوف صـ۶۵ کے مطابق جب امام حسینؑ پر پیاس کا غلبہ ہوا تو آپ نے فرات کا رخ کیا اور عباسؑ آپ کے

آگے آگے چل رہے تھے۔ جس کے بعد لشکر ابن سعد نے راستہ روکا۔

اور مناقب ابن شہر آشوب کے مطابق تنہا حضرت عباسؑ پانی کے لئے فرات کی طرف گئے اور دشمنوں نے حملہ کر دیا۔ جس کے جوابی حملہ میں آپ کا رجز یہ تھا:

"میں ہرگز ہرگز موت سے نہیں ڈرتا ہوں جب تک تلواروں کے درمیان چھپ نہ جاؤں۔ میرا نفس حسینؑ کے نفس مطہر کی سپر ہے۔ میں عباسؑ ہوں مجھے سقائی کا کام انجام دینا ہے اور مجھے روز جنگ کسی مصیبت کا کوئی خوف نہیں ہے۔"

آپ نے دشمنوں کو فرات سے ہٹا دیا لیکن زید بن الورقا الجہنی نے ایک درخت خرما کے پیچھے سے حملہ کیا اور حکیم بن الطفیل النبسی نے اس کا ساتھ دیا اور اس طرح آپ کا داہنا ہاتھ قلم ہو گیا اور آپ نے بائیں ہاتھ کے سہارے حملہ شروع کیا۔ اب آپ کا رجز یہ تھا:

"خدا کی قسم اگر تم نے میرا داہنا ہاتھ قلم کر دیا ہے تو بھی میں اپنے دین کی حمایت کرتا رہوں گا اور اپنے صادق الیقین امام سے دفاع کرتا رہوں گا جو رسول طاہر امین کا فرزند ہے۔"

اس کے بعد حکیم بن الطفیل الطائی نے دوسرا شانہ بھی قلم کر دیا اور آپ نے اس طرح رجز پڑھا:

"اے نفس خبردار کفار سے خوفزدہ نہ ہونا اور رحمت پروردگار پر خوش رہنا۔ تجھے نبیؐ مختار کے ساتھ رہنا ہے۔ ان لوگوں نے ظلم کر کے میرا بایاں شانہ قلم کر دیا ہے۔ تو پروردگار تو انھیں واصل جہنم کر دینا۔"

اس کے بعد ایک ملعون نے گرز آہنی سے حملہ کیا اور آپ درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔ (مناقب ابن شہر آشوب ۲/ ۲۲۱-۲۲۲)

مقتل خوارزمی کا فقرہ ہے کہ اس حادثہ پر امام حسینؑ نے اس طرح مرثیہ پڑھا:

"اب میری کمر ٹوٹ گئی اور راہ چارہ و تدبیر مسدود ہو گئی۔"

(مقتل خوارزمی ۲/ ۳۰)

مقتل اطفال آل رسولؐ

طفل شیر خوار

مقتل خوارزمی وغیرہ کا بیان ہے کہ حسینؑ در خیمہ پر آئے اور آکر آواز دی لاؤ میرے علیؑ کو لے آؤ تاکہ میں اسے رخصت کر دوں۔ خواتین نے بچہ کو امامؑ کے حوالہ کیا اور آپ نے اسے بوسہ دینا شروع کیا۔ فرمایا، ویل ہے اس قوم کے لئے کہ اس کا مقابلہ روز قیامت تیرے جد سے ہوگا۔

ابھی بچہ کو گود میں لئے ہوئے تھے کہ حرملہ بن کاہل اسدی نے بچہ کو نشانہ بنا کر تیر مارا اور امامؑ کی گود میں اسے ذبح کر دیا۔ امام حسینؑ نے خون کو چلو میں لیا اور آسمان کی طرف پھینک دیا۔ خدایا! اگر آج ہماری نصرت کی مصلحت نہیں ہے تو اس قربانی کو ہمارے مستقبل کا ذخیرہ بنا دینا اور اس ظالم قوم سے انتقام ضرور لینا۔

یہ کہہ کر گھوڑے سے اترے اور تلوار سے ایک قبر بنا کر نماز ادا کر کے بچہ کو خون میں ڈوبا سپرد خاک کر دیا۔ (مقتل خوارزمی ۲/۳۲، تاریخ طبری طبع یورپ ۲/۳۶۰، ابن کثیر ۸/۱۸۸)

نوٹ: واضح رہے کہ واقعہ کا یہ انداز صرف ایک خلاصہ ہے ورنہ اگر در خیمہ ہی پر پیار کر رہے تھے تو گھوڑے سے اترنے کے کیا معنی ہیں۔ کیا پیار کرنے اور رخصت کرنے کے لئے بھی سوار ہونے کی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ قدیم مورخین نے واقعات کربلا کو بطور خلاصہ بیان کرنے ہی کو تاریخی ضرورت قرار دیا ہے۔

(جوادی)

ایک اور فرزندِ حسینؑ

طبری کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عقبہ غنوی نے ابوبکر بن الحسینؑ بن علیؑ کو ایک تیر مار قتل کر دیا جس کے بارے میں ابن ابی عقب شاعر کہتا ہے :

"بنی غنی کے پاس ہمارے خون کا ایک قطرہ ہے اور بنی اسد کے پاس دوسرا، جس کا ذکر یوں ہی ہوتا رہے گا۔"

راہِ فرات کا معرکہ

طبری نے بعض حاضرینِ معرکۂ کربلا کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب حسینؑ پر پیاس کا غلبہ ہوا تو گھوڑے پر سوار ہو کر فرات کا رُخ کیا۔ بنی ابان بن دارم کے ایک شخص نے فوجوں سے پکار کر کہا کہ حسینؑ اور پانی کے درمیان حائل ہو جاؤ اور ان کے ساتھی فرات کی طرف نہ جانے پائیں۔ یہ کہہ کر خود گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھا اور پیچھے پیچھے لشکر بڑھا اور سب نے مل کر فرات کا راستہ روک دیا۔

حسینؑ نے اس شخص کے حق میں بد دعا کی کہ خدایا یہ پیاسا ہی مرے۔ لیکن اس کے بعد حصین بن تمیم نے آپ کی گردن پر ایک تیر مار دیا جسے آپ نے کھینچ کر نکال تو لیا لیکن چلو خون سے بھر گیا۔ جسے آسمان کی طرف پھینک کر فریاد کی کہ خدایا تو ہی دیکھنا کہ تیرے نبیؐ کے نواسہ کے ساتھ کیا برتاؤ ہو رہا ہے۔ خدایا! انھیں ایک ایک کر کے دیکھ لے اور پھر سب کا خاتمہ کر دینا اور ان میں سے روئے زمین پر کوئی ایک نہ رہنے پائے۔

طبری کی روایت یہ بھی ہے کہ حسینؑ نے تیر نکال لیا اور ہاتھ پھیلا دیا جو خون سے بھر گیا اور بارگاہِ احدیت میں فریاد کی کہ پروردگار تیرے نبی کے نواسہ کے ساتھ یہ برتاؤ ہو رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص پر اس بد دعا کے زیر اثر پیاس کا ایسا غلبہ ہوا کہ کبھی سیراب نہ ہو سکا۔

قاسم بن الاصبغ کا بیان ہے کہ اسے بار بار ٹھنڈا پانی شکر، دودھ وغیرہ ملا کر

دیا جاتا تھا اور وہ یہی فریاد کرتا تھا کہ پیاس مارے ڈال رہی ہے اور جب بھی سیراب کیا جاتا تھا دو لمحہ کے بعد یہی فریاد شروع کر دیتا تھا۔ یہانتک کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور واصل جہنم ہو گیا۔

نوٹ: واضح رہے کہ طبری کے روایات کے بارے میں خود مولف نے تفصیلی بحث کتاب "عبداللہ بن سبا" میں درج کر دی ہے لیکن بطور اعتراف اس قدر مختصر واقعات کا نقل کرنا بھی ضروری تھا۔ (جوادی)

مقتل طفل مدہوش

طبری نے ہانی بن ثبیت الحضرمی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ میں کربلا میں موجود تھا اور میرے ساتھ دس افراد شہسوار تھے اور گھوڑے میدان میں دوڑ رہے تھے کہ خیام حسینی سے ایک بچہ قمیص پیجامہ پہنے، ہاتھ میں عمود خیمہ لئے باہر نکلا۔ دہشت کے عالم میں داہنے بائیں دیکھ رہا تھا اور اس کے کانوں میں دو گوشوارے بھی تھے۔ جب ایک شخص کو تیزی سے آتے دیکھا تو اپنے کو چھپا لیا لیکن اس ظالم نے حملہ کر کے بچہ کا خاتمہ کر دیا۔

ہانی بن ثبیت کا بیان ہے کہ وہ ظالم خود ہی تھا لیکن مذمت کے خوف سے اپنے نام کا ذکر نہیں کرتا تھا۔

فرزند امام حسنؑ

طبری کہتا ہے کہ شمر نے پیادوں کے ایک لشکر کے ساتھ حسینؑ کا رخ کیا تو آپ نے ایک حملہ کر کے سب کو بھگا دیا۔ لیکن ظالموں نے پھر دوبارہ گھیر لیا اور ایسے وقت میں خیمہ گاہ سے ایک نابالغ بچہ عبداللہ بن الحسنؑ برآمد ہوا اور تیزی سے دوڑ کر حسینؑ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ اس وقت بحر بن کعب بن عبیداللہ حسینؑ پر تلوار سے حملہ کرنا چاہتا تھا، بچہ نے آواز دی۔ اے زن خبیثہ کے بچے! میرے چچا کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے تلوار چلا دی۔ بچہ نے گھبرا کر ہاتھ بڑھا دیا اور ظالم کی تلوار نے بچہ کے ہاتھ کاٹ دئے۔ ہاتھ

لٹک رہے تھے اور بچہ فریاد کر رہا تھا کہ حسینؑ نے اسے سینہ سے لگا لیا اور کہا۔ جان برادر! صبر کرو۔ اس کا انجام بہتر ہوگا اور پروردگار تم کو تمہارے آباء صالحین رسول اللہؐ، علیؑ بن ابی طالب، حمزہؓ، جعفرؓ اور حسنؑ بن علیؑ سے ملا دے گا۔

مقتل الحسینؑ

طبری کا بیان ہے کہ اسی حالت میں حسینؑ خاک پر رہے اور جب بھی کوئی شخص آگے بڑھتا تھا واپس ہو جاتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ قتل حسینؑ کا عذاب اپنی گردن پر لے یہانتک کہ بنی بدّار کا ایک شخص مالک بن النصیر نامی آگے بڑھا اور اس نے سر پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ آپ کا بُرنس قطع ہو گیا اور سر پر ایسی تلوار لگی کہ بُرنس خون سے مملو ہو گیا۔

حسینؑ نے اسے بددعا دی کہ خدا تیرا حشر ظالمین کے ساتھ کرے اور یہ کہہ کر برنس کو پھینک دیا جسے ایک کندی نے لے لیا اور جب اسے لے کر اپنی زوجہ حسین بن الحر کی بہن ام عبد اللہ کے پاس آیا اور دھونا شروع کیا تو زوجہ نے کہا کہ کیا یہ فرزند رسولؐ کا لوٹ کا سامان میرے گھر میں لے آیا ہے، اسے نکال باہر کر۔

اس ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ظالم فقر و فاقہ ہی میں دنیا سے گذر گیا۔ (طبری ۴۴۸/۵ طبع دار المعارف مصر تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم ۳۵۹/۲ - ۳۶۰ طبع یورپ)

خیام ذرّیتِ رسولؐ پر حملہ

ابو مخنف کا بیان ہے کہ شمر بن ذی الجوشن ایک پیادہ فوج لے کر خیام حسینی کی طرف بڑھا تو حسینؑ نے پکار کر کہا۔ ظالمو! اگر تمہارے پاس دین اور خوفِ آخرت نہیں ہے تو کم از کم دنیا ہی میں شریف بن جاؤ اور اپنے بدسرشتوں کو میرے خیام کی طرف سے روک لو۔

شمر نے اس وقت تو اس بات کو قبول کر لیا لیکن اس کے بعد ابو الجنوب عبد الرحمٰن الجعفی، قشعم بن عمرو بن یزید الجعفی، صالح بن وہب الیزنی، سنان بن انس نخعی، خولی

بن یزید الاصبحی وغیرہ کو تحریک کی کہ کوئی حسینؑ کا سر قلم کر لے۔ ابوالجنوب نے کہا کہ خود کیوں نہیں بڑھتا ہے۔ دوسرے کو کیوں تحریک کرتا ہے۔ شمر نے اسے برا بھلا کہا اور طرفین سے گالیوں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ ابوالجنوب نے چاہا کہ شمر کی آنکھ میں نیزہ چبھو دے کہ شمر سامنے سے بھاگ گیا اور اس نے کہا کہ جب بھی ممکن ہو گا میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔! (طبری ۲/۳۶۲-۳۶۳ طبع یورپ)

آخر قتال حسینؑ

طبری نے ابو مخنف کے حوالہ سے حجاج بن عبداللہ بن عمار بن عبدیغوث البارقی سے نقل کیا ہے کہ اس نے عبداللہ بن عمار کی ملامت کی کہ اس نے قتل حسینؑ میں شرکت کی ہے تو عبداللہ نے کہا کہ میرا بنی ہاشم پر ایک احسان ہے۔

میں نے پوچھا وہ کیا؟ اس نے کہا کہ میں نے حسینؑ پر نیزہ سے حملہ کیا اور قریب پہونچ کر نیزہ مارنے کے بجائے پیچھے ہٹ آیا جب کہ میں مار سکتا تھا۔ صرف میں نے یہ سوچا کہ یہ کام میں کیوں کروں۔ دوسرے لوگ موجود ہیں۔ لیکن اس کے داہنے بائیں سے لوگوں نے حملہ کر دیا۔ حسینؑ نے دونوں طرف سے دفاع کیا جب کہ ان کے جسم پر صرف ایک پیراہن اور سر پر عمامہ تھا۔ اور خدا کی قسم میں نے کوئی ایسا زخمی نہیں دیکھا ہے جس کی اولاد اور اس کے اصحاب و اہلبیتؑ سب قتل کر دئے جائیں اور اسقدر مطمئن ہو اور اس طرح حملے کرے جس طرح حسینؑ کر رہے تھے کہ لشکر ان کے سامنے سے بکریوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔

فریاد زینبؑ

ابھی یہی صورت حال برقرار تھی کہ ایک مرتبہ زینبؑ بنت فاطمہؑ خیمہ سے برآمد ہوئیں اور فریاد کی کہ کاش یہ آسمان زمین پر گر پڑتا۔ اس وقت عمر بن سعد حسینؑ کے قریب کھڑا تھا۔ زینبؑ نے پکار کر کہا او عمر سعد! میرا بھائی ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔

میں نے دیکھا کہ عمر سعد کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے ہیں اور اس نے اپنا منھ پھیر لیا ہے۔ (طبری ۲/۳۶۴-۳۶۵) طبع یورپ)

نوٹ: عمر سعد سے اس طرح کی رقّتِ قلب کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ لیکن مصیبتِ کربلا پتھروں کی آنکھوں سے بھی آنسو نچوڑ سکتی ہے۔ (جوادی)

مقتل سبط نبی اکرمؐ

ابو مخنف کا بیان ہے کہ مجھ سے صقعب بن الزبیر نے حُمید بن مسلم کے حوالہ سے روایت کی ہے کہ حسینؑ کے بدن پر ایک خز کا جُبّہ تھا اور سر پر عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ قتل سے پہلے وہ پیادہ جنگ کر رہے تھے اور ہر طرف کے حملہ سے اپنا تحفظ کر رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے۔ ظالمو! تم میرے قتل پر لوگوں کو اُبھار رہے ہو؟ خدا کی قسم! میرے بعد کسی بھی ایسے بندۂ خدا کو قتل نہیں کرو گے جس پر خدا آج سے زیادہ ناراض ہو۔ میں خدا سے یہ امید رکھتا ہوں کہ تمھیں ذلیل کرے گا اور مجھے عزّت دے گا اور تم سے میرا انتقام اس طرح لے گا کہ تمھیں شعور بھی نہیں ہوگا۔ خدا کی قسم اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو خدا اپنا عذاب نازل کر دے گا اور تمھارا خون بھی بہا دے گا اور تمھیں عذاب الیم سے دوچار کئے بغیر نہ رہے گا۔

راوی کہتا ہے کہ تھوڑی دیر حسینؑ اسی عالم میں رہے کہ اگر کوئی بھی شخص قتل کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا لیکن سب ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی اس کام کو انجام دیدے کہ شمر نے لوگوں سے پکار کر کہا۔ افسوس آخر تم لوگ کیا دیکھ رہے ہو۔ خدا تمھاری ماؤں کو تمھارے غم میں رُلائے۔ جلدی ان کا کام تمام کرو۔

یہ سُننا تھا کہ چاروں طرف سے حملہ شروع ہوگیا اور بائیں ہاتھ پر شریک تمیمی نے تلوار لگائی اور اسے کاندھے سے جُدا کر دیا اور پھر لوگ دور چلے گئے اور حسینؑ نے اُٹھنے کا ارادہ کیا کہ سنان بن انس بن عمرو النخعی نے نیزہ کا وار کر دیا اور خولی سے کہا کہ اب سر قلم کرلے۔ اس نے ارادہ کیا لیکن کانپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ تو سنان نے پھر پکار کر کہا۔ خدا تیرے ہاتھ قلم کر دے

اور یہ کہہ کر خود آگے بڑھا اور سر کاٹ کر خولی بن یزید کے حوالہ کر دیا۔ جب کہ اس سے پہلے تلواروں سے بہت سے حملے ہو چکے تھے۔

ابو مخنف نے جعفر بن محمد بن علی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ امام حسینؑ کے جسم پر وقت شہادت ۳۳ نیزوں کے زخم تھے اور ۳۴ تلواروں کے۔ اور سنان بن انس کی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ جو بھی حسینؑ کے قریب جاتا اسے مار کر ہٹا دیتا کہ کہیں سر قلم کرنے کا کام وہ نہ انجام دیدے۔ یہانتک کہ خود سر قلم کیا اور خولی کے حوالہ کر دیا۔

(طبری ۲/۳۶۵-۳۸۵ طبع یورپ)

نوٹ: مذکورہ بیانات میں اوّلاً تو شمر کے کردار کی وضاحت نہیں ہے۔ اور پھر سرِ امام حسینؑ جُدا کرنے کی نسبت سنان کی طرف دی گئی ہے اور زخموں کی تعداد بھی اتنی مختصر نقل کی گئی جو ایسے حالات میں نا قابل قبول بلکہ نا قابلِ تصور ہے۔ (جوادی)

غارتگری خیام ذریت رسولؐ

ابو مخنف ہی کا بیان ہے کہ اس کے بعد امام حسینؑ کا سامان لوٹ لیا گیا۔ پیراہن بحر بن کعب نے لیا۔ چادر قیس بن الاشعث نے لی جس کے نام پر اس کا نام قیس قطیفہ ہو گیا۔ نعلین بنی اود کا ایک شخص اسود نامی لے گیا اور تلوار بنی نہشل بن دارم کا ایک شخص لے گیا جو بعد میں حبیب بن بدیل کے اہل تک پہونچ گئی۔

اس کے بعد ظالموں نے خیموں کا رُخ کیا اور سارا سامان لوٹ لیا یہانتک کہ سروں کی چادریں بھی محفوظ نہ رہ سکیں اور انتہائی کوشش کے باوجود خواتین اپنی چادروں کو نہ بچا سکیں۔

آخری شہید

زہیر بن عبد الرحمٰن الخثعمی کا بیان ہے کہ سوید بن عمرو بن ابی المطاع زخموں سے چور میدان میں پڑے تھے۔ جب انھوں نے سُنا کہ امام حسینؑ شہید ہو گئے ہیں تو ہمت کر کے

ایک چھری لے کر اُٹھے اور کچھ دیر اسی سے جہاد کرتے رہے۔ یہانتک کہ عروہ بن بطار تغلبی اور زید بن رقاد الجنبی نے مل کر ان کا کام بھی تمام کر دیا اور وہ آخری شہید قرار پائے۔

اس کے بعد حُمید بن مسلم کا بیان ہے کہ میں علیؑ بن الحسین الاصغر کے پاس پہونچا تو دیکھا کہ وہ بیمار بستر پر پڑے ہیں اور شمر اپنے سپاہیوں سے کہہ رہا ہے کہ اس بیمار کا کام کیوں نہ تمام کر دیا جائے۔ میں نے کہا سبحان اللہ! اب بچے بھی نہ چھوڑے جائیں گے اور اس طرح میں اس بیمار سے مسلسل دفاع کرتا رہا یہانتک کہ عمر سعد آگیا اور اس نے کہا کہ خبردار اب کوئی خیمہ میں داخل نہ ہو اور اس بیمار کو نہ چھیڑے۔ بلکہ اگر کچھ سامان لے لیا ہے تو اسے واپس کر دے۔

مگر کسی نے کچھ واپس نہیں کیا اور علیؑ بن الحسینؑ نے مجھ سے کہا کہ خدا تجھے جزائے خیر دے کہ تیرے کلام نے ایک بہت بڑے شر کو دفع کر دیا۔ (طبری ۲/۳۶۷ طبع یورپ)

نوٹ: اس روایت میں امام زین العابدینؑ کو علی اصغر کہنا بھی غلط ہے اور آپ بچہ بھی نہیں تھے بلکہ صاحب اولاد تھے اور امام محمد باقرؑ کربلا میں موجود تھے۔ اور عمر سعد کا سامان کی واپسی کا حکم بھی قرین عقل نہیں ہے۔ (جوادی)

طلب انعام

راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد لوگوں نے سنان بن انس سے کہا کہ تو نے حسینؑ ابن علیؑ و فاطمہؑ کو مارا ہے جو عرب میں یزید کی حکومت کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھے لہٰذا تجھے امرار حکومت سے انعام طلب کرنا چاہیے اور وہ لوگ سارا بیت المال بھی دے دیں تو کم ہے۔

اور سنان یہ سُن کر گھوڑے پر سوار ہو کر عمر سعد کے خیمہ کے دروازہ پر پہونچا اور آواز دی۔ میرے سامان کو سونے چاندی سے بھر دے کہ میں نے ایک شریف اور باعظمت بادشاہ کو مارا ہے۔ میں نے اسے مارا ہے جس کے ماں باپ سے بہتر کسی کے ماں باپ نہیں ہیں۔

عمر سعد نے یہ سن کر کہا کہ تو واقعاً دیوانہ ہے اور تجھے ہوش نہیں ہے اور یہ کہہ کر حکم دیا کہ اسے سامنے حاضر کیا جائے۔ جب لوگ سنان کو لے کر آئے تو ابن سعد نے ایک چھڑی ماری اور کہا دیوانے! یہ کیا بک رہا ہے۔ اگر ابن زیاد سن لیتا تو اب تک گردن اڑ چکا ہوتا۔

زندگی عقبہ بن سمعان

طبری کا بیان ہے کہ عقبہ بن سمعان سکینہ بنت الحسینؑ کی والدہ رباب بنت امرؤالقیس الکلبی کا غلام تھا اور ابن سعد کی گرفت میں آگیا تو اس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟

اس نے کہا کہ میں ایک غلام ہوں۔

ابن سعد نے یہ سُن کر چھوڑ دیا اور واقعۂ کربلا کا یہ تنہا سپاہی ہے جو زندہ باقی رہ گیا۔ (طبری ٦/ ٣٦٨ طبع یورپ)

پامالی لاش حسینؑ

اس کے بعد عمر سعد نے اپنے اصحاب کو پکار کر کہا کہ کون ہے جو حسینؑ کے سر و سینہ کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کر دے اور لشکر سے دس افراد نکل آئے جن میں امام حسینؑ کے پیراہن کا لوٹنے والا اسحاق بن حیاۃ الحضرمی اور احبش بن مرثد بن علقمہ بن سلامہ الحضرمی بھی تھا اور ان لوگوں نے لاش کو پامال کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسحاق برص میں مبتلا ہو گیا اور احبش کو ایک تیر آکر لگا جس نے دل کو پارہ پارہ کر دیا اور وہ موت کے گھاٹ اُتر گیا۔ (طبری ٦/ ٣٦٨ طبع یورپ)

اے کاش میں یہ سمجھ سکتا کہ کیا لشکر خلافت نے طفل شیر خوار کو اس لیے ذبح کر دیا تھا کہ اس نے خلیفہ کی بیعت نہیں کی تھی؟

کیا دخترانِ پیغمبرؐ کو قیدی بنا کر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لیجا کر دربارِ خلافت میں اس لئے پیش کیا گیا تھا کہ ان سے یزید کی بیعت طلب کرنا تھی؟

آخر یہ سارا ظلم کیوں ہوا ہے؟
لشکر خلافت نے خیام آل رسولؐ میں آگ کیوں لگائی ہے؟
لشکر خلافت نے فرزند رسولؐ کے سر و سینہ کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے کیوں پامال کیا ہے؟
لشکر خلافت نے اولاد رسولؐ کی لاشوں کو بے گور و کفن کیوں چھوڑ دیا تھا؟
لشکر خلافت نے اہلبیت رسولؐ کے سروں کو قلم کر کے نوک نیزہ پر دیار بہ دیار کیوں پھرایا تھا؟

کیا یہ سب صرف اس لئے ہوا تھا کہ ابن زیاد تک یہ خبر پہونچ جائے کہ لشکر اطاعت گذار ہے جیسا کہ اس کے رجز میں اشارہ کیا گیا تھا:

"عبید اللہ تک خبر پہونچا دینا کہ میں خلیفہ کا مکمل اطاعت گذار ہوں۔"

یعنی سارا کاروبار ابن زیاد اور خلیفہ یزید کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہو رہا تھا جیسا کہ سپاہی نے حاکم سے کہا تھا۔ (تاریخ ابن عساکر حدیث ۷۷۵، تہذیب تاریخ ۴/۳۴۴)

اور ابن زیاد کے قصر کے سامنے آواز لگائی جا رہی تھی "ہم نے حسینؑ کے سینہ و پشت کو پیس ڈالا ہے۔"

اور خولی نے اپنی زوجہ کو سرِ امام حسینؑ دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ساری دنیا کی دولت ہے جو تیرے حوالہ کر رہا ہوں۔

—اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیش امامت کا سارا جہاد رضائے خدا و رسولؐ —اور دار آخرت کے لئے تھا اور لشکر خلافت کا سارا ظلم۔ یزید و ابن زیاد کے لئے تھا یا اس سے سونے چاندی کا مطالبہ مقصود تھا۔

یقیناً خلیفہ نے لشکر کی آنکھوں کو ٹھنڈا کر دیا جب عبید اللہ بن زیاد کو دس لاکھ درہم دیدئے اور اہل کوفہ کو ایک اطاعت گذار فوج جیسا انعام دیدیا اور ان کے عطیات میں سو سو کا اضافہ کر دیا۔

اس کے بعد سوال یہ ہے کہ یزید نے خود یہ مظالم کیوں کئے۔ امام حسینؑ کے دندان مبارک پر چھڑی کیوں لگائی۔ ان کے سر کو دمشق میں تین دن معلق کیوں رکھا ہے اور اسے دیار بہ دیار

کیوں پھرایا؟

خود اپنے افعال کے بارے میں یہ بیان کیوں دیا کہ "میں قبیلۂ خندف سے نہیں ہوں اگر اولاد احمدؐ سے ان کے افعال کا بدلہ نہ لے لوں۔ میں نے ان کے بزرگوں کو قتل کر کے بدر کا حساب برابر کر لیا ہے۔

گویا یہ بدری کینے تھے جو کربلا میں ظاہر ہو رہے تھے۔

اور اسی لئے اس کی دادی ہند نے احد میں جناب حمزہؑ کا شکم چاک کر کے ان کا جگر چبایا تھا اور اس کے جد ابو سفیان نے نیزہ کی انی سے ان کے دہن کو پارہ پارہ کر دیا تھا جس کو دیکھ کر سید الاحابیش نے کہا تھا:

"بنی کنانہ! یہ سردار قریش ہے جو اپنے ابن عم کے ساتھ یہ برتاؤ کر رہا ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔"

اور کیا اس یزید کے دادا ابو سفیان نے عثمان کی خلافت کے موقع پر ان کے سامنے یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ اے بنی امیہ! اس خلافت کو گیند کی طرح نچاؤ اور قسم اس کی جس کی ابو سفیان قسم کھاتا ہے کہ میں ہمیشہ تمھارے لئے اس کا امیدوار تھا اور اب اسے تمھارے بچوں کو میراث میں ملنا چاہئے۔

اور کیا اس نے ایک دن قبر حمزہؑ سے گذرتے ہوئے لات مار کر یہ نہیں کہا تھا کہ ابو عمارہ! جس امر پر کل تم نے ہم سے جنگ کی تھی آج وہ ہمارے بچوں کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اسے کھیل رہے ہیں۔

اور کیا اس کے باپ معاویہ نے یہ نہیں کہا تھا کہ بنی ہاشم کے برادر "رسول اکرمؐ" کا نام روزانہ پانچ مرتبہ بلند آواز سے لیا جاتا ہے۔ خدا کی قسم میں اسے دفنائے بغیر چین نہیں لے سکتا ہوں؟

اور کیا اس کے باپ کے لشکر نے بسر بن ارطاۃ کی قیادت میں تیس ہزار مسلمانوں کو قتل کر کے ان کے گھروں کو آگ نہیں لگائی تھی اور کیا عبید اللہ بن عباس کے دو بچوں کو اپنے ہاتھ سے چھری سے ذبح نہیں کر دیا تھا؟

اور اگر یہ سب صحیح ہے تو خلیفۃ المسلمین نے وہی سب کچھ کیا ہے جو اس کے باپ ادا کر چکے تھے۔ اور گروہ خلافت یزید۔ مروان اور سعید نے رسول اکرمؐ سے ان کے اسلامی کردار کا بدلہ لے لیا ہے۔

نوٹ: گذشتہ واقعات کی تفصیلات کے لئے مولف کی کتاب "احادیث ام المومنین عائشہ" کے صفحہ ۲۱۳۔۲۵۰ کا مطالعہ کیا جائے۔

شہادتِ حسینؑ کے بعد مدرسۂ خلافت کا کردار

۱۔ عطایا وانعامات

ابن اعثم کا بیان ہے کہ شہادت حسینؑ کے بعد عبید اللہ بن زیاد کے لئے عراق کی ساری سرزمین ہموار ہو گئی اور اسے یزید نے دس لاکھ درہم انعام بھی دیا۔ اس نے اس رقم سے بصرہ میں دو سرخ وسفید قصر تیار کرائے اور ان پر بے تحاشہ پیسہ خرچ کیا۔ سرخ قصر میں سردیاں گذارتا تھا اور سفید قصر میں گرمی۔

اس نے بھی کافی شہرت پیدا کرلی اور خوب خوب مال لٹایا اور افراد بنائے یہانتک کہ شعرا نے قصائد بھی لکھے۔ (الفتوح ابن اعثم ۵/۲۵۲)

مسعودی کا بیان ہے کہ ایک دن یزید محفل شراب میں تھا اور اس کے داہنی طرف ابن زیاد تھا۔ اس نے ساقی سے خطاب کر کے کہا کہ پہلے مجھے سیراب کر اور اس کے بعد ابن زیاد کے جام کو بھر دے کہ یہ میرا راز دار اور امانت دار ہے اور اس نے جہاد اور غنیمت کی راہ ہموار کی ہے۔ اس کے بعد لوگوں کو حکم دے دیا اور انھوں نے گانا شروع کر دیا۔ (مروج الذہب مسعودی ۳/۶۷)

مولف: واضح رہے کہ اس بیان میں یزید کا مقصد عبید اللہ بن زیاد ہے۔ اس کا بھائی مسلم نہیں ہے جیسا کہ ابن اعثم نے خیال کیا ہے کہ یزید نے اس سے کہا کہ اولاد زیاد کی محبت اولاد ابوسفیان پر فرض ہے اور اس کے بعد غلام سے کھانا طلب کیا۔ اس نے دستر خوان لگا دیا تو دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور اس کے بعد یزید نے شراب طلب کی اور جب دور چلنے لگا تو یزید نے ساقی کو ... [illegible]

۔یزید کا یہ انداز عبید اللہ بن زیاد سے مناسبت رکھتا ہے مسلم سے نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے دونوں بھائیوں کے ساتھ محفل شراب میں ان ابیات کو دھرایا ہو جس کی تائید تذکرہ ابن الجوزی کے بیان سے ہوتی ہے کہ یزید نے ابن زیاد کو بلا کر بے تحاشہ مال اور تحفے دیئے اور اسے اپنا ہمنشین بنا لیا یہانتک کہ اسے عورتوں میں بھی داخلہ مل گیا اور جب دونوں نشہ میں تھے تو یزید نے مغنی کو حکم دیتے ہوئے یہ اشعار فی البدیہہ زبان پر جاری کئے۔ (تذکرہ خواص الامہ ص ۱۶۴)

ظاہر ہے کہ اس طرح کا برتاؤ عبید اللہ کے ساتھ ہو سکتا ہے مسلم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مولف: یہ تمام انعامات و جوائز "قائد لشکر ابن زیاد" کے لئے تھے۔ اس کے بعد عام افراد اور سپاہیوں کے بارے میں بلاذری کا بیان ہے کہ یزید نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ اہل کوفہ اہل سمع و طاعۃ ہیں۔ لہذا ان کے عطیات میں سو سو کا اضافہ کر دے۔

اس انداز سے قاتلان امام حسینؑ نے راحت و آرام اور سکون و عیش کی زندگی شروع کی یہانتک کہ جب ان کے اعمال کے نتائج سامنے آنے لگے تو سب کو شرمندگی کا منھ دیکھنا پڑا۔

ب۔ گروہ خلافت کی ندامت

ابن کثیر وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ جب ابن زیاد نے حسینؑ اور ان کے اصحاب کو قتل کرا کے سب کے سر یزید کے پاس بھیجدیئے تو ابتدا میں تو یزید بیحد خوش ہوا اور ابن زیاد کی قدر و منزلت میں اضافہ بھی ہو گیا لیکن تھوڑا ہی وقت گذرا تھا کہ وہ شرمندہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ ابن زیاد نے قتلِ حسینؑ سے مجھے مسلمانوں میں قابلِ نفرت بنا دیا ہے اور ان کے دلوں میں میری دشمنی کا بیج بو دیا ہے کہ اب نیک و بد مجھ سے نفرت کر رہا ہے۔ (ابن کثیر ۸/۲۳۲، تاریخ الاسلام ذہبی ۲/۳۵۱)

یہی حال ابن زیاد، عمر بن سعد اور تمام قاتلانِ حسینؑ کا ہوا جس کی تفصیل کو اختصار کے پیش نظر ترک کیا جا رہا ہے اور اس ندامت و شرمندگی کا سبب شرافت نفس نہیں تھی بلکہ تمام مسلمانوں کی عمومی ناراضگی تھی اور اس کے نتیجہ میں اٹھنے والی صدائے انقلاب تھی جو ہر سمت سے اٹھ رہی تھی۔

شہادت امام حسین

کے بعد

اہلِ حرمین وغیرہم کے انقلابات

اہلِ حرمین کے انقلابات

امام حسینؑ کی شہادت کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ مدرسۂ خلافت کے خلاف مسلمانوں کے انقلابات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ان میں سب سے آگے آگے اہل مکہ و مدینہ کا انقلاب تھا۔ جس کے بارے میں مسعودی کا بیان ہے کہ جب یزید اور اس کے کارندوں کا ظلم و جور تمام مسلمانوں پر عام ہوگیا اور یزید کے فسق و فجور کو تمام عالم اسلام نے پہچان لیا کہ یہ ایک شرابی اور بدکار انسان ہے جس نے نواسۂ رسولؐ کو قتل کیا ہے اور اس کا کردار فرعون سے بدتر ہے کہ اس نے بھی اپنی رعایا پر اسقدر ظلم نہیں کیا تھا۔ (مروج الذہب ۳/۶۸، تاریخ ابن کثیر ۸/۶۱۹)

تو ابن زبیر نے اسے بدمست شرابی قرار دے کر اس کی بیعت سے انکار کر دیا اور اہل مدینہ کو اس کے فسق و فجور پر مشتمل خط بھیج دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ (التنبیہ والاشراف ص۲۶۳)

طبری کے الفاظ میں شہادت حسینؑ کے بعد ابن زبیر نے مکہ میں قیام کیا اور پہلے لوگوں کو عظمت شہادت حسینؑ سے باخبر کیا اور تمام اہل عراق اور بالخصوص اہلِ کوفہ کی شدید مذمت کی۔ یہاں تک کہ اپنے بیان میں حمد و ثنا و صلوات کے بعد کہا کہ اہلِ عراق چند ایک کے علاوہ

سب غدّار اور مکار ہیں اور اہلِ کوفہ ان تمام اہل عراق سے بدتر ہیں جنھوں نے حسینؑ کو نصرت اور حکومت کے وعدہ سے بُلایا اور پھر جب وہ آگئے تو انھیں پر حملہ کر دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ یا تو آپ تیار ہو جائیں کہ ہم آپ کو ابن زیاد کے حوالہ کر دیں اور وہ آپ کے بارے میں فیصلہ کرے یا پھر جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔

ان کے ساتھ افراد بہت کم تھے اور پروردگار کسی کو یہ علم غیب نہیں دیتا ہے کہ وہ قتل ہونے والا ہے لیکن انھوں نے عزّت کی موت کو ذلّت کی حیات پر ترجیح دی اور شہادت کے لئے تیار ہو گئے۔ اللہ ان پر رحمت نازل کرے اور ان کے قاتل کو رسوا کرے۔ میری جان کی قسم لوگوں کی مخالفت اور نافرمانی ہی میں نصیحت کا سامان موجود تھا لیکن جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا اور امر الٰہی کو ٹالا نہیں جا سکتا ہے۔ البتہ ہم ان کے کسی قول و قرار اور عہد و پیمان کا اعتبار نہیں کر سکتے ہیں اور نہ انھیں اس بات کا اہل سمجھتے ہیں۔

خدا کی قسم ان لوگوں نے اس شخص کو مارا ہے جو راتوں میں نمازیں پڑھا کرتا تھا اور دنوں میں روزے رکھا کرتا تھا اور اس امر کا ان سے زیادہ حقدار تھا اور دین و فضل میں ان سے اولیٰ اور افضل تھا۔ نہ اس نے قرآن کو غنا سے بدلا اور نہ خوفِ خدا میں گریہ کو ترنم سے تبدیل کیا۔ نہ صیام کے بدلے شراب نوشی کی اور نہ حلقۂ ذکر و فکر کے بدلے سیر و شکار کا رُخ اختیار کیا۔ عنقریب ان ظالموں کو اپنی گمراہی کا خود سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ سُننا تھا کہ لوگوں نے ہجوم کر لیا اور کہا کہ آپ اپنی بیعت کا اعلان کر دیں کہ اب حسینؑ کے بعد کوئی معارض نہیں رہ گیا ہے۔ یوں بھی لوگ پہلے ابن زبیر کی بیعت کر رہے تھے اور وہ اپنے کو ایک پناہ گیر حرم کی شکل میں پیش کر رہے تھے۔

یہ اصرار دیکھ کر انھوں نے کہا کہ ابھی جلدی نہ کرو۔ اس زمانہ میں مکہ میں یزید کا عامل عمرو بن سعید بن العاص تھا جسے ابن زبیر کسی قیمت پر برداشت نہیں تھے لیکن اس کے باوجود وہ بظاہر مصالحانہ روش اختیار کئے ہوئے تھا۔ اس کے بعد جب یزید کو ابن زبیر کے حرکات کا علم ہوا تو اس نے عہد کیا کہ انھیں زنجیر میں بندھوا کر طلب کرے گا۔ چنانچہ ایک چاندی کی زنجیر بھیج دی اور قاصد اسے لے کر مدینہ میں مروان بن الحکم کے پاس سے گذرا اور اُسے

بھی صورت حال سے آگاہ کیا۔ تو مروان نے کہا کہ ایسے کمزور آدمی کے لئے ایسی زنجیر کی ضرورت نہیں ہے۔ قاصد وہاں سے چل کر ابن زبیر کے پاس آیا اور انھیں مروان کے بیان سے باخبر کیا تو انھوں نے کہا کہ واللہ ایسا نہیں ہے اور میں کمزور نہیں ہوں اور یہ کہہ کر آہستہ سے قاصد کو واپس کر دیا اور مکہ میں ان کی حکومت کا کام چل پڑا اور اہل مدینہ نے بھی خط و کتابت شروع کر دی اور کہا کہ حسینؑ کی شہادت کے بعد اب ابن زبیر کا کوئی معارض نہیں رہ گیا ہے۔

(طبری طبع یورپ ۲/ ۳۹۶ - ۳۹۷، طبع مصر ۵/ ۲۷۳ - ۲۷۵)

یزید کے نمائندے اور ابن زبیر

اس بات کو ابن اعثم اور دینوری وغیرہ نے ابن اعثم کے الفاظ میں اس طرح نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن زبیر حرکت میں آگئے اور لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینا شروع کر دی۔ (الاخبار الطوال دینوری ص ۲۶۲، فتوح ابن اعثم ۵/ ۲۶۲ - ۲۹۰ طبع حیدرآباد سنہ ۱۳۹۲ھ ۵/ ۲۷۹ - ۲۸۱)

جب یزید بن معاویہ کو خبر ملی کہ عبد اللہ بن زبیر نے قیام کر دیا ہے اور لوگ اس کی بیعت کر رہے ہیں تو اس نے اپنے دس مخصوص اصحاب کو جمع کیا جن میں نعمان بن بشیر انصاری اور عبد اللہ بن عضاۃ الاشعری بھی شامل تھا اور کہا کہ عبد اللہ ابن زبیر نے حجاز میں حرکت شروع کر دی ہے اور لوگوں کو میری اطاعت سے نکال کر مجھے اور میرے باپ کو گالیاں دلوا رہا ہے اور کچھ لوگ اس کا ساتھ بھی دے رہے ہیں۔

لہٰذا تم لوگ فوراً جاؤ اور پہلے اس کے اور اس کے باپ کے حق کا اعتراف کرنا اور کہنا کہ جماعت کے ساتھ رہو اور تفرقہ نہ پیدا کرو۔ اگر وہ یہ بات مان لے تو اس سے بیعت لے لینا ورنہ اسے ڈرانا کہ تیرا انجام بھی حسینؑ بن علیؑ جیسا ہونے والا ہے اس لئے کہ نہ زبیر کا مرتبہ علیؑ سے افضل ہے اور نہ عبد اللہ حسینؑ سے بہتر ہے۔ اور دیکھو وہاں زیادہ دیر قیام نہ کرنا کہ مجھے تمھاری خبر کا انتظار رہے گا۔

وہ لوگ یہ سن کر مکہ کے لئے روانہ ہو گئے اور حسب ہدایت ابن زبیر سے مل کر

یزید کا پیغام سنایا۔ انھوں نے کہا کہ یزید مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ میں تو ایک اللہ والا انسان ہوں جو یزید اور غیر یزید کے شر سے دور خانۂ خدا کی پناہ میں زندگی گذار رہا ہوں۔ اگر یزید رہنے دے گا تو رہوں گا ورنہ کہیں اور چلا جاؤں گا اور باقی زندگی گذار کے مر جاؤں گا۔

پھر ان لوگوں کے قیام کا انتظام کیا اور انھوں نے دو دن وہیں گذارے۔ دوسرے دن ابن زبیر نے اصحاب کے ساتھ نماز صبح ادا کی اور حجر کے پاس اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھ گیا اور یزید کے نمائندوں نے اپنا مقصد بیان کیا اور امید ظاہر کی کہ ابن زبیر بیعت کرلے گا اور نعمان بن بشیر نے بتایا کہ یزید کو یہ خبر دی گئی ہے کہ تم منبر پر بیٹھ کر اس کا اور اس کے باپ معاویہ کا برائی کے ساتھ ذکر کرتے ہو جب کہ تمھیں معلوم ہے کہ وہ امام ہے اور لوگوں نے اس کی بیعت کرلی ہے۔ ہم نہیں چاہتے ہیں کہ تم جماعت سے باہر رہو اور لوگوں میں تفرقہ پیدا کرو اور غیبت میں کوئی بھلائی بھی نہیں ہے۔

عبداللہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ابن بشیر! فاسق کی غیبت میں کوئی حرج نہیں ہے اور میں نے وہی سب کچھ کہا ہے جو لوگوں کو پہلے سے معلوم ہے۔ اگر یزید بھی ائمہ اخیار جیسا ہوتا تو ہم اس کی اطاعت کرلیتے اور اس کا ذکر خیر ہی کرتے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔

خیر اب تو میں کبوترانِ حرم جیسی زندگی گذار رہا ہوں۔ کیا تمھارے لئے کبوتر حرم کو اذیت دینا جائز ہے؟

عبداللہ بن عضاۃ الاشعری غضبناک ہو گیا اور کہنے لگا کہ بیشک۔ ہم کبوتر حرم کو اذیت بھی دیں گے اور قتل بھی کر دیں گے۔ بھلا ابن زبیر کا حرمت حرم سے کیا تعلق ہے جو منبر پر بیٹھ کر "امیر المومنین" یزید کو برا بھلا کہتا ہے اور اپنے کو کبوتر حرم سے تشبیہ دیتا ہے۔

یہ کہہ کر غلام سے کہا کہ ذرا تیر کمان تو لے آؤ۔ غلام نے فوراً حاضر کر دیا اور تیر چلہ کمان میں جوڑ کر کبوتر حرم کی طرف رُخ کر دیا اور کہا کہ اب بتاؤ کیا امیر المومنین شرابی اور فاجر ہے؟ اگر "ہاں" تو یہ نشانہ خطا نہیں کرے گا۔

اور یہ بتاؤ کیا امیر المومنین بندر اور چیتے نچاتا ہے اور دین میں فسق کرتا ہے؟۔ اگر ہاں ۔ تو میرا نشانہ خطا نہیں کرتا ہے۔ کبوتر حرم! کیا ارادہ ہے؟ بات کو قبول کرتا ہے یا اطاعت چھوڑ کر تفرقہ پیدا کرتا ہے اور حرم میں گنہگاروں کی زندگی گذارتا ہے۔ پھر دوبارہ خطاب کر کے کہا یہ کبوتر حرم تو کچھ بولتا ہی نہیں ہے۔ صرف منبر سے بولتا ہے۔ خدا کی قسم اے ابن زبیر! مجھے تیری زندگی خطرہ میں دکھائی دے رہی ہے اور میں بحلف کہتا ہوں کہ یا یزید کی بیعت کرے گا چاہے بخوشی و رغبت نہ ہو۔ یا پھر مجھے پہچانتا ہے کہ میرے ہاتھ میں اشعریین کا پرچم ہے۔

(اغانی ۱/۳۳)

ابن اعثم نے اس موقع پر ابن زبیر اور عمرو بن سعید کے مقابلوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں غلبہ ابن زبیر کے ہاتھوں میں رہا۔

اور طبری کا بیان ہے کہ یزید نے عمرو بن سعید کو معزول کر کے ولید بن عتبہ کو عامل بنا دیا اور اسی نے سنہ ۶۱ھ میں حج کی قیادت کی۔ (طبری ۶/۲۷۳-۲۷۵)

ولید مسلسل ابن زبیر کی تلاش میں رہا اور وہ احتیاط کے ساتھ دور بھاگتا رہا یہانتک کہ جب ولید عرفات سے نکل گیا تب ابن زبیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ نکلا اور ابن زبیر ولید کے معاملہ میں تدبیریں کرتا رہا یہانتک کہ یزید کو خط لکھ دیا کہ تو نے ایک ایسے احمق کو بھیجدیا ہے جو کسی سیدھے راستہ کو جانتا ہی نہیں ہے اور نہ کسی صاحب حکمت کی نصیحت قبول کرتا ہے۔ اگر اس کے بدلے کسی نرم دل کو بھیجا ہوتا تو شائد تمام مشکلات آسان ہو جاتے اور تمام متفرقات جمع ہو جاتے۔

چنانچہ یہ دیکھ کر یزید نے ولید کو معزول کر دیا اور عثمان بن محمد بن ابو سفیان کو مکہ کا عامل بنا دیا۔

یزید کے پاس اہلِ مدینہ کا وفد

طبری کے الفاظ میں عثمان ایک ناتجربہ کار اور سادہ شخص تھا اس نے یزید کے پاس اہل مدینہ کا ایک وفد روانہ کر دیا جس میں خنظلہ غسیل ملائکہ کے فرزند عبداللہ اور عبداللہ بن

ابی عمرو المخزومی، منذر بن الزبیر جیسے اشراف مدینہ شامل تھے۔ یہ لوگ شام وارد ہوئے تو یزید نے اکرام و احترام کیا اور تحفہ و تحائف بھی پیش کئے۔ چنانچہ عبداللہ بن حنظلہ کو ایک لاکھ درہم دئے اور ان کے آٹھ فرزندوں میں ہر ایک کو ساز و سامان کے علاوہ دس دس ہزار درہم نقد دئے۔

یہ وفد مدینہ واپس آیا تو اس نے یزید کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ ہم ایک ایسے شخص کے پاس سے آئے ہیں جس کا کوئی دین نہیں ہے اور وہ شراب پیتا ہے، باجے بجاتا ہے، کتوں سے کھیلتا ہے اور بدکرداروں کے ساتھ راتیں گذارتا ہے۔ تم لوگ گواہ رہنا کہ ہم نے اسے معزول کر دیا ہے۔

عبداللہ بن حنظلہ نے کہا کہ ہم ایک ایسے شخص کے پاس سے آئے ہیں کہ اگر ہمارے پاس صرف یہ آٹھ بیٹے رہیں گے تو بھی ہم اس سے جہاد کریں گے۔

لوگوں نے کہا کہ ہم نے سُنا ہے کہ یزید نے آپ کو انعام اور تحائف دئے ہیں؟ کہا بے شک! لیکن ہم نے یہ مال اس کے خلاف صرف کرنے کے لئے لے لیا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے عبداللہ کی بیعت کر لی۔

ادھر منذر بن الزبیر جسے یزید نے ایک لاکھ درہم دئے تھے۔ اس نے بھی کہا کہ یزید نے مجھے ایک لاکھ درہم دئے ہیں لیکن میں حق بیانی سے رُک نہیں سکتا ہوں۔ یزید شرابی ہے اور نشہ میں نماز تک چھوڑ دیتا ہے ــــ اور یہ کہہ کر بہت سی دوسری بُرائیاں بھی بیان کیں۔

(طبری ۷/۲۔۳، ۴، ابن اثیر ۴/ ۴۰۔ ۴۱، ابن کثیر ۸/ ۲۱۶، العقد الفرید ۴/ ۳۸۸)

انقلاب صحابہ و تابعین

انقلاب اہلِ مدینہ اور بیعتِ عبداللہ

ذہبی نے تاریخ اسلام میں نقل کیا ہے کہ لوگوں نے عبداللہ بن حنظلہ پر اجتماع کر لیا اور موت پر ان کی بیعت کر لی۔ انھوں نے کہا کہ لوگو! اللہ سے ڈرو۔ ہم نے یزید کے خلاف اس وقت تک قیام نہیں کیا جب تک یہ خوف نہیں ہو گیا کہ اب آسمان سے پتھر برسنے والے ہیں۔ یہ شخص سوتیلی ماؤں، بیٹیوں اور بہنوں سے زنا کرتا ہے۔ شراب پیتا ہے اور نماز ترک کر دیتا ہے۔

(تاریخ الاسلام ۲/۳۵۶)

یعقوبی کا بیان ہے کہ معاویہ کے مخصوص معاملات کا عامل ابن میناعثمان بن محمد والی مدینہ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ یزید حسب دستور قدیم گندم اور خرما کا مطالبہ کر رہا ہے لیکن اہل مدینہ نے دینے سے انکار کر دیا ہے۔

عثمان نے یہ سُن کر ایک شخص کو ان لوگوں کے پاس بھیجا۔ اس نے سخت لہجہ میں گفتگو کی تو لوگوں نے اس پر حملہ کر دیا اور تمام ہوا خواہان بنی امیہ کو مدینہ سے نکال باہر کر دیا اور ان پر پتھراؤ کر دیا۔ (یعقوبی ۲/۲۵۰)

اغانی کا بیان ہے کہ ادھر ابن زبیر نے بھی یزید کے برخاست کرنے کا اعلان کر دیا اور اس کے پاس عبداللہ بن مطیع، عبداللہ بن حنظلہ اور دیگر اہل مدینہ مسجد میں وارد ہوئے اور منبر پر جا کر یزید کے برخاست کرنے کا اعلان کر دیا اور عبداللہ بن ابی عمرو بن حفص بن المغیرہ المخزومی نے سر سے عمامہ اتار کر کہا کہ ہم نے یزید کو اس طرح تخت سے

اتار دیا ہے۔ اور میں یہ بات کہہ رہا ہوں حالانکہ اس نے مجھے انعام بھی دیا ہے لیکن کیا کروں دشمن خدا شرابی اور نشہ باز ہے۔

دوسرے شخص نے کہا کہ میں نے اس طرح اتار دیا ہے جیسے میری جوتیاں۔ تیسرے نے کہا جیسے میرے پرانے کپڑے۔ چوتھے نے کہا جیسے میرا موزہ۔ اور اس طرح عماموں، چپلوں اور موزوں کا ڈھیر لگ گیا اور سب نے اپنی بیزاری کا اعلان کر دیا اور اس پر اتفاق کر لیا۔ صرف عبداللہ بن عمر اور محمد بن علیؑ بن ابی طالب نے اختلاف کیا اور محمد اور ابن زبیر کے اصحاب کے درمیان سخت لہجہ میں گفتگو ہوئی یہانتک کہ لوگوں نے انھیں مجبور کرنا چاہا اور وہ مکّہ فرار کر گئے۔

جس کے بعد محمد اور ابن زبیر میں ٹھن گئی اور اہلِ مدینہ نے طے کر لیا کہ تمام بنی امیہ کو نکال باہر کریں گے اور اس بات پر عہد و پیمان بھی ہو گیا کہ لشکرِ خلافت کی امداد نہیں کریں گے اور اسے واپس کر دیں گے۔ اور واپس نہ بھی کر سکے تو اس کے ساتھ مدینہ واپس نہ ہوں گے۔

امام سجادؑ اور زنانِ بنی امیہ

اغانی ہی کا بیان ہے کہ مروان نے عبداللہ بن عمر سے کہا کہ ابو عبدالرحمٰن! اب قوم ہماری مخالف ہو گئی ہے لہٰذا آپ ہمارے بچّوں کو پناہ دے دیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے تو مروان نے کہا کہ یہ بدترین معاملہ اور بدترین دین ہے۔

اور یہ کہہ کر حضرت علی بن الحسینؑ کے پاس آیا اور آپ سے پناہ طلب کی۔ آپ نے قبول کر لیا اور اس کی زوجہ ام ابان بنت عثمان اور دونوں بچّوں کو طائف بھجوا دیا۔

طبری اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ جب اہل مدینہ نے یزید کے عامل اور تمام بنی امیہ کو مدینہ سے نکال دیا تو مروان نے ابن عمر سے درخواست کی کہ اس کے بچّوں کو پناہ دیدیں لیکن انھوں نے انکار کر دیا تو اس نے علی ابن الحسینؑ سے درخواست کی اور آپ نے قبول کر کے اس کے بچّوں کو اپنے گھر والوں کے ساتھ "ینبع" بھیج دیا۔ (طبری ۷/۷، ابن اثیر ۴/۴۵)

ابن اثیر کے الفاظ یہ ہیں کہ مروان نے اپنی زوجہ عائشہ بنت عثمان بن عفان اور دیگر گھر والوں کو علی بن الحسینؑ کے پاس بھیجدیا اور آپ نے اپنے اور مروان کے حرم کو ینبع بھجوادیا۔

اغانی کا بیان یہ بھی ہے کہ لوگوں نے بنی امیہ کو نکال باہر کیا اور جب مروان نے نماز پڑھانا چاہی تو اسے بھی روک دیا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ نماز نہیں پڑھا سکتا ہے البتہ اپنے گھر والوں کو پڑھانا چاہے تو ہم کو کوئی اعتراض نہیں ہے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور پڑھ کر چلا گیا۔

بنی امیہ کی یزید سے فریاد

طبری وغیرہ کا بیان ہے کہ اس کے بعد تمام بنی امیہ مروان کے گھر میں جمع ہو گئے اور لوگوں نے سب کا محاصرہ کر لیا لیکن بنی امیہ نے یزید کے پاس فریادی خط بھیجدیا اور اس نے خط دیکھ کر قاصد سے پوچھا کیا بنی امیہ اور ان کے موالی سب ملا کر ایک ہزار بھی نہیں ہیں؟ اس نے کہا کہ اس سے زیادہ ہیں؟ کہا پھر کیا اہل مدینہ سے ایک ساعت بھی جنگ کرنے کے قابل نہیں ہیں اور یہ کہہ کر عمرو بن سعید کو طلب کیا اور اسے خط دکھلا کر تمام حالات سے باخبر کیا۔ اس نے مدینہ پر چڑھائی کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد عبید اللہ بن زیاد کو حکم دیا کہ مدینہ جا کر ابن زبیر کا محاصرہ کر لے۔ اس نے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ یہ ناممکن ہے کہ میں فرزند رسولؐ کو بھی قتل کروں اور خانہ خدا پر بھی حملہ کروں۔ میں سارے مظالم کی ذمہ داری نہیں لے سکتا ہوں اور اس کا راز یہ تھا کہ اس کی ماں مرجانہ نے قتل حسینؑ پر اس کی سخت مذمت کی تھی اور اسے بدترین مجرم قرار دیا تھا۔
(امالی الشجری ص۱۶۴)

آخر میں اس نے مسلم بن عقبہ المری کے پاس پیغام بھیجا جس کے بارے میں معاویہ کی وصیت تھی کہ ایک دن تیرا مقابلہ مدینہ والوں سے ہوگا تو مسلم بن عقبہ سے مدد لینا کہ میں اس کے اخلاص کو جانتا ہوں۔ مسلم بوڑھا، کمزور اور بیمار تھا لیکن اطاعتِ خلیفہ پر تیار ہو گیا۔
(طبری ۷/۵-۱۳، ابن اثیر ۴/۴۴-۴۵، ابن کثیر ۸/۲۱۹، اغانی ۱/۳۵-۳۶)۔

صاحب اغانی کا کہنا ہے کہ مسلم نے یزید سے کہا کہ آپ کسی کو بھی بھیجیں گے۔ وہ کوتاہی سے کام لے گا۔ یہ کام میرے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ہے اور میں نے خواب دیکھا ہے کہ مدینہ کا ایک درخت فریاد کر رہا ہے اور جب میں قریب گیا تو میں نے ایک آواز سنی کہ آپ اپنا انتقام لیجیے کہ اہلِ مدینہ قاتل عثمان ہیں۔

اوامر خلیفہ

طبری۔ یزید نے مسلم کو ہدایت دی کہ اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو اپنی جگہ پر حصین بن نمیر سکونی کو سردار لشکر بنا دینا اور دیکھو تم تین مرتبہ لوگوں کو اطاعت کی دعوت دینا۔ اس کے بعد بھی قبول نہ کریں تو جنگ چھیڑ دینا اور فتح پانے کے بعد تین دن کے لئے مدینہ کو مباح کر دینا اور جو کچھ بھی مال، سکہ، اسلحہ اور غذا ہو سب لشکر کے لئے حلال ہے۔ تین دن کے بعد ہاتھ روک لینا اور دیکھو علی بن الحسینؑ کو مت چھیڑنا کہ انھوں نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا ہے۔

اس کے بعد منادی کرا دی کہ جو حجاز جانا چاہتا ہے اسے مکمل عطیات ملیں گے اور سو دینار بھی نقد دئے جائیں گے۔ چنانچہ اس آواز پر بارہ ہزار افراد جمع ہو گئے۔

اور التنبیہ والاشراف میں مسعودی کے مطابق۔ یہ ہدایت دی کہ مدینہ پہونچنے کے بعد اگر کوئی شخص شہر میں داخل ہونے سے روکے یا جنگ کرنے کا ارادہ کرے تو تلوار.... تلوار۔ اور خبردار نہ کسی آدمی کو زندہ چھوڑنا اور نہ سامان کو۔ زخمی کو ختم کر دینا۔ بھاگنے والوں کا پیچھا کرنا اور تین دن تک لوٹ مار جاری رکھنا۔ البتہ اگر مزاحمت نہ کریں تو مکہ جا کر ابن زبیر سے جنگ کرنا۔

مروج الذہب کے الفاظ میں۔ یزید نے اس مسلم بن عقبہ کو سردار لشکر قرار دیا۔ جس نے مدینہ کو گندہ کے لفظ سے یاد کیا تھا جب کہ رسول اکرمؐ نے اسے طیبہ کہا تھا۔ یہی بات دینوری نے بھی نقل کی ہے۔

خلیفۃ المسلمین کا نغمہ

یزید کے سامنے لشکر حاضر کیا گیا تو اس نے کہا کہ جب رات کے وقت وادی القریٰ میں لشکر جمع ہو جائے تو ابو بکر (ابن زبیر) کو اطلاع بھیجدینا کہ بیس ہزار بوڑھے اور جوان آگئے ہیں۔ اب آ کر دیکھ کہ یہ نشہ میں بیہوش ہیں یا ایسے بیدار ہیں کہ نیند اڑی ہوئی ہے۔

ان اشعار میں اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ ابن زبیر، یزید کو شرابی اور نشہ میں دھت کہا کرتا تھا اور اس کی کنیت ابو بکر اور ابو خبیب تھی۔

مسعودی کا بیان ہے کہ یزید نے ابن زبیر کے نام خط لکھا:

"میں نے تمھارے خلاف اپنے لشکر بُلا لئے ہیں اب تم اپنے آسمانی خدا کو پکارو۔ دیکھنا کہ تمھیں اس لشکر سے کیسے نجات ملتی ہے۔ غنیمت ہے کہ لشکر آنے سے پہلے کوئی راستہ نکال لو۔"

(التنبیہ والاشراف ص۲۶۳، مروج الذہب ۳/ ۶۸-۶۹،
الاخبار الطوال ص۲۶۵)

طبری وغیرہ میں ابن اثیر کے الفاظ کے مطابق یہ روایت بھی ہے کہ جب عبدالملک بن مروان نے سنا کہ یزید نے مدینہ کی طرف لشکر روانہ کر دیا ہے تو اس نے کہا کہ کاش یہ آسمان زمین پر گر پڑتا۔ لیکن اس کے بعد خود اس منزل پر آگیا کہ حجاج کو سردار لشکر بنا کر بھیجدیا اور اس نے مکہ کا محاصرہ کر کے خانۂ کعبہ پر پتھر برسائے اور ابن زبیر کو حرم خدا میں قتل کر دیا۔

لشکر خلافت کی بسوئے حرمین روانگی

جب مسلم بن عقبہ لشکر لے کر آیا اور مدینہ والوں کو اطلاع ملی تو انھوں نے مروان کے گھر میں بنی امیہ کا محاصرہ سخت کر دیا اور کہا کہ ہم تم کو ہرگز نہ چھوڑیں گے جب تک تمھاری گردن نہ کاٹ دیں یا تم عہد کرو کہ ہمارے بارے میں کسی ہلاکت کا ساتھ نہ دو گے اور ہمارے کسی راز کو فاش نہ کرو گے اور دشمن کی مدد نہ کرو گے۔

ایسی حالت میں ہم تمہیں موقع دے سکتے ہیں کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ ان لوگوں نے عہد کر لیا اور مدینہ سے سازوسامان لے کر نکل گئے۔ راستہ میں مسلم بن عقبہ سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے عمرو بن عثمان بن عفان کو طلب کر کے حالات دریافت کئے۔

اس نے کہا کہ میں نہیں بتا سکتا ہوں کہ ہم لوگوں سے سخت عہد لے لیا گیا ہے کہ نہ راز فاش کریں گے اور نہ دشمن کی امداد کریں گے۔

اس نے جھڑک دیا اور کہا کہ تو عثمان کا فرزند نہ ہوتا تو اب تک تیری گردن اُڑا دیتا۔

اس نے جا کر اپنے اصحاب کو قصہ سنایا تو مروان بن الحکم نے اپنے بیٹے عبدالملک سے کہا کہ مجھ سے پہلے تو پہونچ جا۔ شائد اس کے بعد میری ضرورت نہ پڑے۔ عبدالملک حاضر ہوا تو مسلم نے پوچھا کہ بتاؤ تم کیا کہتے ہو۔

اس نے کہا میری رائے یہ ہے کہ آپ روانہ ہو جائیں اور مقام ذی نخلہ پر پہونچ کر پڑاؤ ڈال دیں تاکہ لوگ آرام کریں اور کھجور وغیرہ کھالیں۔ اس کے بعد جب صبح ہو تو پھر چل پڑیں اور مدینہ کو داہنے بائیں ہاتھ پر قرار دے کر چکر کاٹ کر حرّہ کی طرف سے قوم کا سامنا کریں تاکہ جب آفتاب طلوع ہو تو آپ کے ساتھیوں کی پُشت پر ہو۔ اور دشمن کے سامنے ہو اور وہ گرمی اور شعاعوں سے پریشان ہو جائے اور آپ کی تلواروں اور نیزوں کی چمک سے چکا چوند ہو جائے۔ اس کے بعد نام خدا لے کر جنگ شروع کر دیں۔

مسلم نے کہا کہ خدا تیرے باپ کا بھلا کرے کیا بیٹا پیدا کیا ہے ؟

اس کے بعد مروان حاضر ہوا مسلم نے استقبال کیا تو مروان نے پوچھا کیا عبدالملک نہیں آیا ہے ؟۔ مسلم نے کہا آیا ہے اور کیا خوب آیا ہے۔ میں نے اب تک قریش میں ایسا کوئی ہوشیار آدمی نہیں دیکھا ہے۔

مروان نے کہا جب آپ اس سے مل لئے تو گویا مجھ سے ملاقات ہو گئی۔

اس کے بعد مسلم ہر قدم پر عبدالملک کے ہدایات کے مطابق روانہ ہو گیا اور مدینہ پہونچکر تین دن کی مہلت دے دی۔ تین دن کے بعد کہا اہل مدینہ اب کیا کرنا ہے ؟ صلح و سلامتی یا جنگ ؟ ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں جنگ کرنا ہے۔!

اس نے کہا ابھی موقع غنیمت ہے۔ ایسا نہ کرو اور یزید کی اطاعت میں داخل ہو جاؤ تاکہ ہم اپنا نشانہ اس ملحد کو قرار دیں جس نے چاروں طرف سے فساق و فجار کو جمع کر لیا ہے۔ یعنی ابن زبیر۔

ان لوگوں نے کہا کہ دشمنانِ خدا۔ اگر تم اُدھر جانا چاہتے ہو تو ہم ہرگز نہ چھوڑیں گے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ تم خانۂ کعبہ کی بے حرمتی کا ارادہ کرو، اہلِ حرم کو خوفزدہ کرو، مکہ کی حرمت کو برباد کرو اور ہم تمھیں آزاد چھوڑ دیں۔ (طبری ۷/۶-۷، ابن اثیر ۴/۴۵-۴۶)

مسعودی اور دینوری کا بیان ہے کہ اہلِ مدینہ نے اس خندق کو دوبارہ کھود لیا جسے حضور اکرمؐ نے جنگ احزاب کے موقع پر کھودا تھا اور چاروں طرف دیوار کھڑی کر دی جس کے بارے میں ان کے شاعر نے یزید کو مخاطب بنا کر کہا تھا:

"خندق میں وہ سامان عزت و کرامت ہے جس کے ذریعہ سب کے نشے اڑ جائیں گے
اے یزید نہ تو ہم میں سے ہے اور نہ تیرا ماموں کہ تو نمازوں کا برباد کرنے والا ہے۔
اگر تو نے ہمیں قتل کر دیا تو پھر عیسائی ہو جا اور شراب پی کر نماز جمعہ کو ترک کر دے۔"

(التنبیہ والاشراف ص۲۶۴، الاخبار الطوال ص۲۶۵)

ذہبی کا بیان ہے کہ ان دنوں ابن حنظلہ راتوں کو مسجد میں قیام کیا کرتے تھے اور صرف آب جو سے افطار کر کے روزے رکھا کرتے تھے اور بہت کم سر اٹھاتے تھے۔ جب لشکر کے آنے کی اطلاع ملی تو قوم سے خطاب کیا اور انھیں جنگ پر آمادہ کیا اور کہا کہ پروردگار ہمیں تیرے اوپر بھروسہ ہے۔

صبح کو لشکر مدینہ میں داخل ہو گیا اور طرفین سے شدید مقابلہ ہوا لیکن ابن حنظلہ کی قوم نے پیچھے سے مدینہ کی طرف سے تکبیر کی آواز سُنی اور معلوم ہوا کہ بنو حارثہ نے حرّہ کی طرف سے حملہ کر دیا ہے۔ یہ دیکھ کر ساری قوم فرار کر گئی اور عبداللہ بن حنظلہ نے اپنی اولاد پر نظر ڈالی اور اپنے بڑے بیٹے کو مقابلہ پر بھیجا جو تھوڑی دیر جنگ کر کے قتل ہو گیا تو پھر دوسری اولاد کو روانہ کیا یہاں تک کہ سب کام آ گئے اور ابن حنظلہ صرف چند اصحاب کے درمیان رہ گئے۔

انھوں نے اپنے غلام سے کہا کہ تم پُشت کی طرف سے حفاظت کرو تاکہ میں نماز ظہر پڑھ لوں۔ اس نے حفاظت کی۔ جب نماز تمام ہو گئی تو غلام نے کہا کہ اب تو کوئی نہیں رہ گیا ہے، ہم کس کے بھروسہ قیام کریں گے، صرف پانچ افراد پرچم کے گرد رہ گئے ہیں۔؟

ابن حنظلہ نے کہا۔ خدا تیرا بُرا کرے، ہم موت کے ارادہ سے نکلے ہیں۔ یہ اہلِ مدینہ بھاگتے ہوئے شتر مُرغ ہیں اور اہلِ شام انھیں قتل کر رہے ہیں۔ افسوس! مگر سارے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تو ابن حنظلہ نے زرہ اُتار کر پھینک دی اور مقابلہ شروع کیا یہانتک کہ قتل کر دئے گئے اور مروان نے سرہانے کھڑے ہو کر کہا کہ میری یہ انگلی ہمیشہ سیدھی رہی ہے۔ (تاریخ الاسلام ذہبی ۲/ ۳۵۶-۳۵۷)

لشکر خلافت اور حرم رسولؐ کی بے حرمتی

طبری وغیرہ کا بیان ہے کہ مسلم نے تین دن کے لئے سارے مدینہ کو مباح کر دیا جس میں قتل و خون اور لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ (طبری ۷/ ۱۱، ابن اثیر ۳/ ۴۷، ابن کثیر ۸/ ۲۲۰)

یعقوبی کے الفاظ ہیں: "مردوں کی اکثریت کو تہ تیغ کر دیا گیا اور عورتوں کو یوں مباح کر دیا گیا کہ کنواری لڑکیوں کے یہاں اولاد پیدا ہوئی اور نہ معلوم ہو سکا کہ کس مرد سے ہوئی ہے۔" (تاریخ یعقوبی ۲/ ۲۵۱)

ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ روز حرّہ سات سو حاملان قرآن کو قتل کیا گیا ہے جنمیں تین اصحاب رسولؐ بھی تھے اور دیگر افراد کو اس کثرت سے مارا گیا کہ قریب تھا کوئی ایک بھی باقی نہ رہ جائے۔ (تاریخ ابن کثیر ۶/ ۲۳۴)

ابن کثیر ہی کے الفاظ یہ بھی ہیں کہ لوگ عورتوں پر ٹوٹ پڑے یہانتک کہ بقولے ایک ہزار عورتیں بغیر شوہر کے حاملہ ہو گئیں۔

ہشام بن حسان کی روایت ہے کہ واقعہ حرہ کے بعد مدینہ کی ایک ہزار عورتوں کے یہاں بغیر شوہر کے بچے پیدا ہوئے ہیں۔

اور زہری کا بیان ہے کہ مقتولین میں سات سو نمایاں انصار و مہاجرین تھے اور

جن کی شخصیت کا اندازہ نہیں ہو سکا ہے وہ دس ہزار تھے۔ (تاریخ ابن کثیر ۸/۲۲)

تاریخ سیوطی کا فقرہ ہے کہ واقعہ حرہ میں صحابہ اور غیر صحابہ کی ایک بڑی جماعت ماری گئی ہے اور مدینہ لوٹا گیا ہے اور ایک ہزار کنواری لڑکیوں کی بکارت زائل کی گئی ہے۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی ص۲۰۹، تاریخ الخمیس ۲/۳۰۲)

دینوری اور ذہبی کا بیان" بالفاظ دینوری" یہ ہے کہ ابو ہارون عبدی ناقل ہے کہ میں نے ابو سعید خدری کو دیکھا کہ ان کی ڈاڑھی سفید ہے اور داہنے بائیں سے نُچی ہوئی ہے تو میں نے پوچھا کہ ابو سعید! یہ آپ کی داڑھی کیسی ہے تو فرمایا کہ یہ روز حرّہ اہل شام کے ستم کی نشانی ہے۔ جب ظالم میرے گھر میں داخل ہوئے اور سارا سامان لوٹ لیا یہاں تک کہ پانی پینے کا کاسہ بھی نہ چھوڑا تو سب کے جانے کے بعد دوبارہ دس افراد آئے جبکہ میں نماز پڑھ رہا تھا اور انھیں گھر میں کوئی چیز نہ ملی تو سب نے مل کر حالتِ نماز میں مجھ پر حملہ کر دیا اور مجھے زمین پر پٹک دیا۔ اب ہر شخص میری داڑھی نوچ رہا تھا اور اس کا انجام یہ ہوا ہے جو تم دیکھ رہے ہو اور جو بچ گئی ہے یہ خاک میں دب گئی تھی اور وہاں تک ظالموں کا ہاتھ نہیں پہونچا تھا اور میں اسے ایسا ہی رکھوں گا تاکہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پیش کر سکوں۔ (الاخبار الطوال ص۲۶۹، تاریخ الاسلام ذہبی ۲/۳۵۷)

اس طرح مدینۃ الرسولؐ کی سہ روزہ داستان غم اتمام کو پہونچی۔

اہل مدینہ سے بیعت غلامی

طبری وغیرہ کا بیان ہے کہ مسلم نے اہلِ مدینہ سے کہا کہ یزید کی بیعت غلامی کریں اور سارے اختیارات اس کے حوالہ کر دیں کہ وہ جان، مال، عیال سب میں جس طرح چاہے تصرّف کر سکتا ہے۔ (طبری ۷/۱۲)

مسعودی کا بیان ہے کہ باقیماندہ افراد نے اسی شان سے بیعت کی کہ وہ یزید کے غلام خالص رہیں گے۔ صرف علی بن عبداللہ بن عباس نے بیعت نہیں کی کہ لشکر میں ان کے ننھیال والوں نے بچا لیا اور حضرت علیؑ بن الحسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب نے بیعت

نہیں کی کہ انھوں نے مدینہ والوں کی بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کے علاوہ جس نے بھی انکار کیا اسے تلوار کی دھار سے گذار دیا گیا۔ (التنبیہ والاشراف ص ۲۶۳، مروج الذہب ۳/ ۷۱)

طبقات ابن سعد کے الفاظ ہیں کہ مسلم بن عقبہ سب کو تہ تیغ کر کے منزل عقیق تک پہونچا تو اس نے علیؑ بن الحسینؑ کے بارے میں سوال کیا کہ کیا وہ موجود ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ہیں! اس نے کہا پھر نظر کیوں نہیں آرہے ہیں؟ لوگوں نے طلب کیا تو آپ محمد بن الحنفیہ کے دو فرزندوں کے ساتھ تشریف لے گئے اور اس نے دیکھ کر خوش آمدید کہا اور اپنے تخت پر جگہ دی۔ (طبقات ابن سعد ۵/ ۲۱۵)

تاریخ طبری میں یہ فقرہ پایا جاتا ہے کہ اس نے علیؑ بن الحسینؑ کو اہلاً و مرحبا کہہ کر تخت پر بٹھایا اور کہا کہ "امیرالمومنین" نے آپ کے بارے میں نیک برتاؤ کی نصیحت کی ہے لیکن ان خبیثوں نے مجھے غافل بنا دیا تھا۔ اس کے بعد دریافت کیا کہ شائد آپ کے گھر والے بھی پریشان اور ہراسان ہیں؟

آپ نے فرمایا کہ بیشک! تو اس نے اپنے گھوڑے پر زین کسوا کر حضرت کو ان کے گھر واپس کر دیا۔ (تاریخ طبری ۷/ ۱۱-۱۲، ۲/ ۲۱ ہم طبع یورپ، فتوح ابن اعثم ۵/ ۳۰۰)

دینوری کے الفاظ یہ ہیں کہ چوتھے دن مسلم بن عقبہ نے دربار سجایا اور سب کو بیعت کے لئے طلب کیا۔ سب سے پہلے یزید بن عبداللہ بن ربیعہ بن الاسود جن کی جدہ حضرت ام سلمہ تھیں۔ انھیں حاضر کیا گیا۔ مسلم نے بیعت کا تقاضا کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر بیعت کر سکتا ہوں۔

اس نے کہا کہ "امیرالمومنین" کی غلامی کی بیعت کرو کہ جان، مال، اولاد کا اختیار یزید کو رہے گا۔ انھوں نے کہا یہ ناممکن ہے۔ اس نے حکم دے دیا اور ظالموں نے گردن اڑا دی۔

(طبری ۷/ ۱۱-۱۲، ۲/ ۱۸ ہم - ۲۰ ہم طبع یورپ)

طبری کا بیان ہے کہ مسلم بن عقبہ نے مقام قبا میں لوگوں کو بیعت کے لئے طلب کیا اور قریش کے دو افراد یزید بن عبداللہ بن زمعہ اور محمد بن ابی الجہم کے بارے میں امان طلب کی گئی تو انھیں ایک دن بعد حاضر کیا گیا اور ان سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا۔ ان لوگوں

نے کہا کہ ہم کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر بیعت کر سکتے ہیں۔ اس نے کہا ہرگز نہیں۔ اسطرح معاف نہیں کیا جائے گا اور یہ کہہ کر دونوں کی گردن اُڑا دی۔

مروان نے اس عمل پر اعتراض کیا کہ سبحان اللہ قریش کے دو افراد ایمان کی بات کر رہے تھے اور تو نے ان کی گردن مار دی؟ اس نے مروان کی کمر میں چھڑی مارتے ہوئے کہا کہ تم بھی ان کی جیسی بات کروگے تو تمھارا ابھی یہی انجام ہوگا۔

اس کے بعد یزید بن وہب بن زمعہ کو لایا گیا اور اس سے بھی مطالبۂ بیعت کیا گیا۔ اس نے کہا کہ میں سنت عمرؓ پر بیعت کر سکتا ہوں۔ حکم ہوا کہ اسے بھی قتل کر دو۔ اس نے گھبرا کر کہا کہ میں بیعت کے لئے تیار ہوں۔ آواز آئی کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔

مروان نے اپنی قرابتداری کی بنیاد پر سفارش کی تو حکم ہوا کہ اس کی گردن بھی توڑ دی جائے اور پھر اعلان عام ہو گیا کہ صرف یزید کی غلامی پر بیعت ہو سکتی ہے اور کچھ نہیں۔ ورنہ سب کا انجام قتل ہے۔ (الاخبار الطوال ص۲۶۵)

خلیفہ کے پاس سروں کی روانگی

ابن عبد ربہ کا بیان ہے کہ مسلم بن عقبہ نے تمام اہل مدینہ کے سر یزید کے پاس بھجوا دئے۔ اس کے سامنے سر رکھے گئے تو اس نے ابن الزبعریٰ کے روز اُحد کے اشعار کو گنگنانا شروع کر دیا "کاش ہمارے بزرگ آج خزرج کا حال دیکھ لیتے تو انھیں واقعاً خوشی ہوتی اور کہتے یزید تیرے ہاتھ شل نہ ہوں"!

اصحاب رسولؐ میں سے ایک شخص بول پڑا کہ امیرالمومنین! آپ مرتد ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں استغفار کئے لیتا ہوں۔

صحابی نے کہا کہ میں تیری سرزمین کو رہنے کے قابل نہیں سمجھتا ہوں اور یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ (العقد الفرید ۴/۳۹۰)

ابن کثیر کی روایت میں پہلے شعر کے بعد دو شعر اور ہیں اور اس کے بعد یہ فقرہ ہے کہ اس میں ایک شعر رافضیوں نے بڑھا دیا کہ "یہ سارا اسلام بنی ہاشم کا کھیل تماشہ ہے

ورنہ نہ کوئی خبر آئی ہے اور نہ وحی"۔

ورنہ اگر یہ شعر۔ یزید نے کہا ہے تو اس پر اللہ اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے اور اگر نہیں کہا ہے تو اضافہ کرنے والوں پر تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔ (ابن کثیر ۸/۲۲۴، الاخبار الطوال ص ۲۶۷)

مولف: ابن کثیر کو غلط فہمی یہ ہوئی ہے کہ یزید کا یہ شعر اس موقع کا ہے اور اسی لئے اس نے رافضیوں کے اضافہ کا الزام لگایا ہے کہ اس موقع پر اسے نقل نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ شعبی کی روایت کی بنا پر۔ یزید نے اس شعر کا اضافہ اس وقت کیا ہے جب سرِ امام حسینؑ پیش کیا گیا تھا اور کھلی ہوئی بات ہے کہ شعبی نہ رافضی تھے اور نہ شیعہ۔ ان کا شمار مدرسۂ خلافت کے متعصب افراد میں ہوتا ہے اور مجھے تو حیرت ہے کہ ابن کثیر نے لعنت ملامت کیوں شروع کر دی جبکہ بہترین راستہ کھلا ہوا تھا کہ یہ یزید کا اجتہاد تھا اور اس نے بربنائے اجتہاد اس کا اضافہ کیا تھا۔ جو حربہ ہر موقع پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

راہِ اطاعتِ خلیفہ میں

لشکرِ خلافت کی روانگی مکہ

طبری وغیرہ کا بیان ہے کہ مسلم نے اہل مدینہ سے جنگ اور مدینہ کی غارت گری سے فرصت پانے کے بعد لشکر سمیت مکہ کا رُخ کیا۔ لیکن مقام مشلل پر پہونچنے کے بعد مرض الموت میں مبتلا ہو گیا اور حصین بن نمیر سکونی کو طلب کر کے کہا اے ابن بردعۃ الحمار! اگر مسئلہ میرے اختیار میں ہوتا تو کسی قیمت پر تجھے اپنا جانشین نہ بناتا لیکن کیا کروں امیر المومنین کا حکم ہے اور اسے میں ٹال نہیں سکتا ہوں۔ لہٰذا یہ وصیت محفوظ کر لے کہ تمام اخبار پر نگاہ رکھنا اور قریش کی کوئی بات نہ سننا اور اہل شام کو دشمن کے مقابلہ سے واپس نہ کرنا اور ابن زبیر فاسق کو صرف تین دن کی مہلت دینا اور اس کے بعد حملہ کر دینا۔

یہ کہہ کر مناجات شروع کر دی "خدایا! میں نے کلمہ توحید و رسالت کے بعد اس سے زیادہ محبوب اور آخرت میں کارآمد کوئی عمل انجام نہیں دیا ہے"۔ (طبری ۷/۱۴، ابن اثیر ۳/۴۹، ابن کثیر ۸/۲۲۵) یہ واقعہ آخر محرم ۶۴ھ ہے۔

ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں کہ "میں نے کوئی عمل قتال اہل مدینہ سے زیادہ محبوب اور آخرت میں نفع بخش انجام نہیں دیا ہے۔ اب اس کے بعد بھی اگر جہنم میں چلا جاؤں تو یقیناً بدبخت ہوں گا"۔ یہ کہہ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ (تاریخ ابن کثیر ۸/۲۲۵)

یعقوبی کے الفاظ میں دعا یہ تھی "خدایا! اگر اپنے خلیفہ یزید بن معاویہ کی اطاعت اور اہل حرّہ کے قتل کے بعد بھی تو مجھ پر عذاب کرے گا تو یہ میری بدبختی ہو گی"۔

(تاریخ یعقوبی ۲/۲۵۱)

فتوح ابن اعثم کا بیان ہے کہ مسلم بن عقبہ نے حصین بن نمیر کو وصیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اہل مکہ اور عبداللہ بن زبیر کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرنا جیسا میں نے اہلِ مدینہ کے ساتھ کیا ہے اور پھر مناجات کی۔ خدایا تجھے معلوم ہے کہ میں نے کبھی خلیفہ کی نافرمانی نہیں کی ہے۔ خدایا مجھے اپنے کسی عمل سے آخرت کی امید نہیں ہے علاوہ اس عمل کے جو میں نے اہل مدینہ کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اسکے بعد نزع کے جھٹکے لگے اور ختم ہو گیا۔

لوگوں نے غسل وکفن دے کر اسی مقام پر دفن کر دیا اور حصین بن نمیر سکونی کی بیعت کر کے اس کی سرکردگی میں مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اطراف والوں نے جب دیکھا کہ لشکر چلا گیا ہے تو قبر کھول کر لاش کو نکال کر سولی پر لٹکا دیا۔ ادھر لشکر والوں کو خبر ملی تو پھر واپس آئے اور متعدد افراد کو قتل کر دیا اور باقی لوگ فرار کر گئے۔ اسکے بعد لاش کو دوبارہ دفن کر کے ایک پہرہ دار بٹھا دیا اور روانہ ہو گئے۔

(فتوح ابن اعثم ۵/ ۳۰۱)

لشکرِ خلافت اور احراقِ کعبہ

مسعودی کا بیان ہے کہ حصین لشکر کو لے کر مکہ پہونچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ ابن زبیر خانۂ کعبہ میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ حصین نے اہلِ شام کے ساتھ مل کر خانۂ کعبہ کے گرد منجنیق نصب کر دئے اور چاروں طرف آگ، تیل اور آتش گیر مادہ پھینکنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں کعبہ کی عمارت گر گئی اور اطراف کے مکانات جل گئے۔

جس کے بعد ایک بجلی گری اور گیارہ افراد ہلاک ہو گئے اور یہ واقعہ ۳ ربیع الاول ہفتہ کے دن کا ہے یعنی وفات یزید سے گیارہ روز قبل۔

اس کے بعد اہل مکہ اور ابن زبیر کی مصیبت مزید شدید ہو گئی اور چاروں طرف سے پتھر اور آگ اور تلوار کی برسات شروع ہو گئی۔ یہانتک کہ شاعر کو کہنا پڑا کہ:

"ابن نمیر کی حکومت بدترین حکومت تھی جس نے مقامِ ابراہیمؑ اور مصلّیٰ کو بھی جلا کر رکھ دیا۔"

یعقوبی کے الفاظ میں۔ ابن نمیر نے اسقدر آگ برسائی کہ خانۂ کعبہ کی عمارت جل گئی۔ عبید اللہ بن عمیر لیثی نے ابن زبیر کے ساتھ معاملہ کر کے پشت کعبہ سے، لوگوں سے پکار کر کہا، شام والو! یہ حرم خدا جاہلیت میں بھی ہماری پناہ گاہ تھا جہاں پرندہ اور شکاری جانور تک پناہ لیا کرتے تھے۔ للہ خدا سے ڈرو۔

جس کے جواب میں شامیوں نے پکار کر کہا۔ اطاعت، اطاعت، فوراً، فوراً، شام سے پہلے صبح۔ اور حملے جاری رہے یہانتک کہ کعبہ کی عمارت جل گئی تو اصحاب ابن زبیر نے کہا کہ اسے بجھا دیا جائے تو ابن زبیر نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اس طرح مسلمانوں کی غیرت کو بیدار کیا جائے گا۔ لیکن نتیجہ میں بعض اہل شام نے اپنے عمل کی اس طرح توجیہ کی کہ اطاعتِ خلیفہ اور حرمتِ کعبہ میں ٹکراؤ ہو گیا تھا اور اطاعت، حرمت پر غالب آگئی۔

(تاریخ یعقوبی ۲/۲۵۱-۲۵۲)

طبری وغیرہ کا بیان ہے کہ یہ سلسلہ تمام محرم اور صفر تک جاری رہا یہانتک کہ جب ربیع الاول کے بھی تین دن گذر گئے تو ہفتہ کے دن ۶۲ھ میں خانۂ کعبہ کو منجنیق کے ذریعہ پتھر اور آگ کا نشانہ بنا دیا گیا اور مسجد کے جلا دینے پر رجز خوانی کی گئی اور کہا گیا دیکھو ام فروہ (منجنیق) نے کس طرح صفا و مروہ کے درمیان کارنامہ انجام دیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ محاصرہ ربیع الثانی کے آغاز تک جاری رہا یہانتک کہ جب ۱۴ ربیع الاول کو یزید کے مرجانے کی اطلاع پہونچی تو سلسلہ تمام ہوا۔

تاریخ طبری وغیرہ میں ہے کہ ابھی حصین بن نمیر ابن زبیر سے مصروف جنگ تھا کہ یزید کے مرنے کی خبر آگئی اور ابن زبیر نے پکار کر کہا۔ ظالمو! تمھارا سرکش حاکم ہلاک ہو چکا ہے لہٰذا اگر چاہو تو میری بیعت میں داخل ہو سکتے ہو اور اگر نہیں تو بہتر ہے کہ شام واپس چلے جاؤ۔ لیکن لوگوں نے جنگ جاری رکھی جس پر ابن زبیر نے حصین بن نمیر سے کہا کہ ذرا قریب آ۔ میں تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ قریب آیا اور بات شروع کی تھی کہ اچانک کسی کے گھوڑے نے لید کر دی اور حرم کے کبوتر اسے کھانے کے لئے آگئے۔ ابن نمیر نے اپنے گھوڑے کو روک لیا کہ کہیں حرم کا کبوتر کچل نہ جائے۔

ابن زبیر نے پوچھا کہ یہ کیا ؟ کہا کہ ڈرتا ہوں کہیں میرا گھوڑا حرم کے کبوتر کو پامال نہ کردے۔ ابن زبیر نے کہا کہ افسوس حرم کے کبوتر کا اتنا خیال ہے اور مسلمانوں کا یوں قتل عام ہو رہا ہے۔

اس نے کہا ٹھیک ہے۔ میں جنگ نہیں کروں گا۔ لیکن اتنی مہلت دے دو کہ میں طواف کعبہ کر کے واپس چلا جاؤں۔ ابن زبیر نے مہلت دے دی اور ابن نمیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ادھر لوگوں کے بیان کے مطابق اہل مدینہ اور اہلِ حجاز اہل شام کے خلاف بغاوت کی بنیاد پر اس قدر ذلیل ہو گئے تھے کہ جب کوئی شامی گذرتا تھا تو مدینہ والا اسکے گھوڑے کی لگام پکڑ کر چلتا تھا اور مسلسل خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ اس لئے کہ بنی امیہ نے حکم دے دیا تھا کہ خبردار۔ ہم سے الگ نہ ہونا جب تک ہمیں شام نہ پہونچا دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور لشکرِ خلافت بخیریت شام واپس پہونچ گیا۔ (طبری ۷/۱۶-۱۷۔ احوادث ۶۵ھ)

حجاج کا حملہ خانہ کعبہ پر

ابن اثیر وغیرہ کا بیان ہے کہ عبدالملک بن مروان نے دوبارہ حجاج کو ابن زبیر سے جنگ کرنے کے لئے مکہ بھیجا۔ وہ طائف میں ٹھہرا اور پھر وہاں سے ذی قعدہ ۷۲ھ میں مدینہ میں ایک شخص کو بھیج کر ابن زبیر کے عامل کو نکال باہر کیا اور اس کی جگہ ثعلبہ نامی ایک شامی کو مقرر کر دیا۔ جو بھیجہ نکال کر منبر رسولؐ پر بیٹھ کر کھاتا تھا تاکہ اہل مدینہ کو جوش دلائے۔ (تاریخ ابن اثیر ۳/۱۳۵)

دینوری کا بیان ہے کہ حجاج نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ حج کا زمانہ آگیا ہے حج کی تیاری کرو۔ اور پھر مکہ میں داخل ہو کر کوہ ابو قبیس پر منجنیق نصب کر دی جس کے بارے میں اقیشر اسدی نے اس طرح چند اشعار میں طنز کیا اور حجاج نے اسے گرفتار کرانا چاہا لیکن وہ فرار کر گیا۔

اس کے بعد حجاج نے ابن زبیر کا گھراؤ کر لیا لیکن اس نے مسجد الحرام میں پناہ

لے لی تو حجاج نے ابن خزیمہ الخثعمی کو منجنیق کا کام سپرد کر دیا اور اس نے اہلِ مسجد پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ (الاخبار الطوال صـ ۲۱۴)

مسعودی کہتا ہے کہ حجاج نے عبد الملک کو ابن زبیر کے محاصرہ اور کوہ ابو قبیس پر قبضہ کی اطلاع دی تو اس نے خط دیکھتے ہی تکبیر کی آواز بلند کی اور سارے گھر نے آواز لگانا شروع کر دی یہانتک کہ یہ شور جامع دمشق تک پہونچ گیا اور بازاروں میں بھی تکبیر کے نعرے لگنے لگے۔ یہانتک کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ آخر قصہ کیا ہے؟

معلوم ہوا کہ حجاج نے مکہ میں ابن زبیر کا محاصرہ کر لیا ہے اور ابو قبیس پر قبضہ پا لیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم اتنے سے راضی نہیں ہیں جب تک ابن زبیر کو زنجیروں میں جکڑ کر حاضر نہ کیا جائے اور اسے بازاروں میں ہمارے درمیان سے نہ گذارا جائے کہ اس "ترابی" ملعون نے امیر سے بغاوت کی ہے۔

واضح رہے کہ ابو تراب امیر المومنین حضرت علیؑ کی کنیت تھی جو رسول اکرمؐ نے عنایت فرمائی تھی اور بنی امیہ اسی کے ذریعہ امیر المومنینؑ کا مذاق اڑاتے تھے اور آپ کے شیعوں کو "ترابی" کے لقب سے یاد کرتے تھے اور یہ ایک طرح کا طنز تھا جس سے ابن زبیر کو بھی محروم نہ رکھا گیا۔

ابن اثیر کے الفاظ یہ ہیں کہ حجاج ذی قعدہ میں وارد مکہ ہوا اور حج کا احرام باندھ کر بیرِ میمونہ پر وارد ہوا اور لوگوں کے ساتھ مناسک حج میں شامل رہا لیکن نہ کعبہ کا طواف کیا اور نہ صفا و مروہ کی سعی کی کہ ابن زبیر نے اس پر پابندی عائد کر دی تھی۔

ادھر ابن زبیر اور اس کے ساتھیوں نے بھی نہ عرفات میں وقوف کیا ــــ اور نہ رمی جمرات میں حصہ لیا لہٰذا وہ بھی حج سے محروم رہے۔

ــ حجاج نے ابن زبیر کا محاصرہ کر کے ابو قبیس پر منجنیق نصب کر دی اور کعبہ پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ یزید بن معاویہ کے زمانہ میں عبد الملک نے اسی بات پر اعتراض کیا تھا لیکن اپنے دور میں اسی بات کا حکم دے دیا جس پر لوگوں نے اسے بیدین تک قرار دے دیا۔

(ابن اثیر ۴/۱۳۶)

ذہبی کا بیان ہے کہ حجاج مسلسل منجنیق سے پتھراؤ اور ہر سمت سے جنگ کرتا رہا، یہانتک کہ لوگوں کی ناکہ بندی کردی اور سب بھوک میں آبِ زمزم پر گذارا کرنے لگے، منجنیق کے پتھر مسلسل کعبہ میں گر رہے تھے۔ (تاریخ الاسلام ذہبی ۳/۱۱۴)

ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں۔ "حجاج کے ساتھ پانچ منجنیق تھیں اور اس نے ہر طرف سے بوچھار شروع کر رکھی تھی"۔ (اس کے بعد باقی بیان ذہبی جیسا ہے) [ابن کثیر ۸/۳۲۹]

کعبہ میں آگ اور بجلی کا نزول

تاریخ الخمیس میں سند کے ساتھ نقل کیا گیا ہے کہ حجاج نے کعبہ پر پتھر اور آگ اسقدر برسائی کہ کعبہ کے پردے تک جل گئے۔ جس کے بعد جدّہ کی طرف سے ایک ابر اٹھا جس میں گرج بھی تھی اور چمک بھی۔ اور اس نے کعبہ کے اوپر آکر آگ کو بجھا دیا اور اسقدر پانی برسایا کہ پرنالہ سے بہنے لگا۔ اس کے بعد وہ ابر کوہ ابو قبیس کی طرف گیا اور پانی کے بجائے بجلی گرادی جس سے منجنیق جل کر خاک ہو گئی اور چار تیر انداز بھی جل گئے۔ جس کے بعد حجاج نے پکار کر کہا کہ خبردار! تم لوگ خوفزدہ نہ ہو۔ یہ سرزمین ہی بجلیوں کی ہے اور اس کے نتیجہ میں پروردگار نے دوسری بجلی نازل کردی اور منجنیق کے ساتھ چالیس آدمی جل کر راکھ ہو گئے۔ (طبری ۷/۲۰۲ حوادث ۷۳ھ)

ذہبی کا بیان ہے کہ حجاج مسلسل اہل شام کو ورغلا رہا تھا کہ دیکھو اطاعت خلیفہ کے بارے میں اللہ کو یاد رکھنا۔ (تاریخ الاسلام ۳/۱۱۴)

طبری وغیرہ نے یوسف بن ماہک کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ابھی منجنیق کے ذریعہ پتھراؤ ہو ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ آسمان پر گرج اور چمک شروع ہو گئی اور حجاج اور اس کے ساتھیوں تک اس کی آواز پہونچنے لگی جس پر اہل شام نے ڈر کر ہاتھ روک لیا تو حجاج نے دامن سمیٹ کر کمر میں کس لیا اور خود بھی منجنیق پر پتھر رکھ کر پھینکنے لگا۔

صبح کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ بجلیوں کا ایک سلسلہ ہے اور بارہ افراد مر چکے ہیں جس پر اہل شام کے حوصلے پست ہو گئے۔ لیکن حجاج نے پکار کر کہا اہلِ شام! اس منظر

سے پریشان نہ ہو۔ میں اسی علاقہ کا رہنے والا ہوں اور ایسی بجلیاں اکثر چمکتی اور گرتی رہتی ہیں۔ فتح سامنے آچکی ہے۔ اب قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور یہ بجلیاں تو لشکر مخالف پر بھی گر سکتی ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ دوسرے دن لشکر ابن زبیر کے کچھ افراد ہلاک ہو گئے، اور حجاج کو کہنے کا موقع مل گیا کہ یہ دیکھو ان کا بھی یہی انجام ہوا ہے اور تمہارا شرف یہ ہے کہ تم خلیفہ کی اطاعت کر لیے ہو اور یہ لوگ اطاعت کے خلاف ہیں۔ (طبری طبع یورپ ۲/۸۴۴-۸۴۵، ابن کثیر ۸/۳۲۹، الاخبار الطوال ص۳۱۴)

تاریخ ابن کثیر میں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ لوگ منجنیق سے پتھراؤ کے وقت رجز خوانی بھی کر رہے تھے جس کے بعد منجنیق پر ایک بجلی گری اور اسے خاکستر کر دیا۔ اہل شام نے یہ دیکھ کر پتھراؤ اور محاصرہ روک دیا تو حجاج نے کہا۔ تمہارا بُرا ہو، کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ دور قدیم میں آگ کا نازل ہونا قربانی کے قبول ہونے کی علامت تھا گویا پروردگار نے تمہارا جہاد قبول کر لیا ہے اور آگ نازل ہو گئی ہے۔ (تاریخ الخمیس ۲/۳۰۵)

فتوح ابن اعثم میں ہے کہ حجاج نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ چاروں طرف سے مکہ کو گھیر لیں چنانچہ ابن زبیر کا محاصرہ شدید ہو گیا اور حجاج کے سپاہیوں نے منجنیقوں سے پتھراؤ شروع کر دیا اور خانہ کعبہ کو اپنا نشانہ قرار دیا۔ مسجد الحرام میں پتھر برسات کے قطرات کی طرح گر رہے تھے اور پتھراؤ کرنے والے ذرا بھی رُک جاتے تھے تو حجاج انھیں گالیاں دیتا تھا اور قتل کی دھمکی دیتا تھا جس کے بارے میں اشعار بھی نظم کیے گئے ہیں۔ (الفتوح ۶/۲۷۵-۲۷۶)

خانہ کعبہ کے جلنے پر حجاج کا ترانہ

الفتوح کے مطابق حجاج اور اس کے ساتھی مسلسل خانۂ خدا پر پتھراؤ کرتے رہے یہاں تک کہ زمزم کے طرف والی دیوار بالکل گر گئی اور باقی اطراف بھی بوسیدہ ہو گئے۔

اس کے بعد حجاج نے حکم دیا کہ تیل کے کوزہ اور آگ رکھ کر پھینکی جائے جس کے نتیجہ میں تمام پردے راکھ ہو گئے اور حجاج کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا بلکہ فخریہ اشعار بھی پڑھتا رہا۔

(فتوح ابن اعثم ۶/۲۷۵-۲۷۶)

طبری وغیرہ کا بیان ہے کہ حجاج اور ابن زبیر کے درمیان یہ معرکہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ابن زبیر کے ساتھی سب چھوڑ کر الگ ہو گئے اور تمام اہل مکہ حجاج سے پناہ مانگنے لگے اور ابن زبیر کے ساتھی بُری طرح پسپا ہو گئے۔ حد یہ ہے کہ دس ہزار پناہ مانگنے والوں میں ابن زبیر کے دونوں بیٹے حمزہ اور خبیب بھی شامل تھے جو اپنے لئے امان طلب کر رہے تھے۔

ابن زبیر کا آخری انجام

شدید ترین جنگ کے بعد ابن زبیر کا قتل واقع ہوا اور حجاج نے اس کا سر، عبداللہ بن صفوان اور عمارہ بن عمرو بن حزم کے سر کے ساتھ مدینہ روانہ کر دیا اور وہاں وہ سر نصب کر دیا گیا اور پھر عبدالملک بن مروان کے پاس لے جایا گیا۔ (طبری ۸/۲۰۲-۲۰۵)

تاریخ ابن کثیر میں ہے کہ ایک مرد ازدی کے ساتھ سارے سر روانہ کر دئے اور انھیں حکم دیا کہ جب مدینہ سے گذر ہو تو پہلے ان سروں کو وہاں نصب کرنا۔ اس کے بعد شام لے جانا۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور عبدالملک نے انھیں پانچ سو دینار انعام دیا اور پھر حجاج کو حکم دیا کہ ابن زبیر کے جسم کو منکسہ کے مقام پر لٹکا دیا جائے اور ایسا ہی ہوا اور پھر اسے اُتار کر دفن کر دیا گیا۔ (تاریخ ابن کثیر ۸/۲۳۲، فتوح ابن اعثم ۶/۲۷۹)

ذہبی کا بیان ہے کہ جب عبدالملک بن مروان کی حکومت مستحکم ہو گئی تو اس نے حرمین کا حاکم حجاج کو بنا دیا اور اس نے کعبہ میں ابن زبیر کی تعمیر کو توڑ ڈالا اور اسے منجنیق کا نشانہ بنا دیا جس سے حجر اسود بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ (تاریخ الاسلام ذہبی ۳/۱۱۵)

حجاج اور اصحاب رسولؐ کی گردنوں پر مہر

طبری وغیرہ کا بیان ہے کہ حجاج صفر میں مدینہ کی طرف گیا اور تین ماہ قیام کر کے اپنا رعب جماتا رہا۔ بنی سلمہ کے قبیلہ میں ایک مسجد بھی بنوائی جو اسی کے نام سے موسوم ہے اور اصحاب رسولؐ کو اسقدر ذلیل کیا کہ ان کی گردنوں پر مہر لگا دی۔ جابر بن

عبداللہ کی مہر اُن کے ہاتھ پر لگی اور انس کی مہران کی گردن پر تاکہ اسے نشان ذلت قرار دیا جاسکے۔

اس کے بعد سہل بن سعد کو طلب کیا اور پوچھا کہ تم نے امیرالمومنین عثمان کی مدد کیوں نہیں کی، انھوں نے کہا کہ میں نے مدد کی ہے! کہا تم جھوٹے ہو اور اس کے بعد حکم دے دیا کہ گردن پر سیسہ کی مہر لگادی جائے۔ (طبری ۷/۲۰۶ حوادث ۲۳ھ)

خاتمہ انقلاب حرمین

اس طرح حرمین کا انقلاب تو ختم ہو گیا لیکن دوسرے مقامات پر شعلے بھڑکنے لگے اور ۶۵ھ میں کوفہ میں توابین کی جماعت کھڑی ہو گئی جس کا نعرہ تھا "یالثارات الحسینؑ" ان لوگوں نے لشکر خلافت سے عین الوردہ میں مقابلہ کیا اور بالآخر شہید ہو گئے۔

اس کے بعد ۶۶ھ میں مختار نے کوفہ میں قیام کیا اور قاتلانِ حسینؑ کو ان کے کیفر کردار تک پہونچانے کا کام شروع کیا۔

اس کے بعد علویین کے انقلابات شروع ہوئے جن میں سرفہرست حضرت زید اور ان کے فرزند یحییٰ کا قیام ہے اور اس کے بعد رضائے آل محمدؐ کے نام پر عباسیوں کا قیام ہے جس کا مقصد بنی امیہ کی عمارتِ سلطنت کو منہدم کر کے بنی عباس کا اقتدار قائم کرنا تھا اور اسے آل محمدؐ کی حمایت کا نام دینا تھا چنانچہ ابوسلمہ خلال نے اپنا لقب وزیر آل محمدؐ قرار دیا تھا اور ابوسلمہ کو امیر آل محمدؐ کے لقب سے نوازا گیا تھا۔

(تاریخ یعقوبی ۲/۳۴۵، ۳۵۲-۳۵۳، ابن اثیر ۵/۱۴۴، ۱۴۸ احوادث ۱۳۰ھ مروج الذہب ۳/۲۸۶)

انقلابی جماعتیں اور ائمہ اہلبیتؑ

یہ تمام انقلابات شہادت امام حسینؑ کے زیر اثر وجود میں آئے تھے۔ لہٰذا ائمہ اہلبیتؑ نے اس آواز کو غنیمت شمار کرتے ہوئے اپنے جد بزرگوار رسول اکرمؐ

کی شریعت کی تجدید کا کام شروع کر دیا اور اس کے مٹے ہوئے آثار کو زندہ کرنے لگے۔ احکام اسلام کی نشر و اشاعت میں ان کا مدرسہ میدان عمل میں آگیا اور ایک واقعۂ کربلا سے دونوں کام ہو گئے۔ اموی خلافت کا خاتمہ بھی ہو گیا اور سنت پیغمبر اسلام اور احیار احکام الٰہیہ کا عمل بھی انجام پا گیا۔!

فصل پنجم

واقعۂ کربلا کے بعد ائمہ اہلبیتؑ کے ہاتھوں

اسلام حقیقی کا سماجی رواج

مذکورہ بالا تمام حوادث و مصائب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض باضمیر افراد کا ضمیر گہری نیند سے جاگ اٹھا اور انھیں خلافتی حالات سے فطری طور پر نفرت ہو گئی اور اس کے زیر اثر اسلامی حلقوں کے ان افراد میں محبت اہلبیتؑ کا جذبہ پھیل گیا جو حکومت کی روٹیوں پر نہیں پل رہے تھے۔

بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتی لڑائی کے زیر اثر باشعور افراد کو مزید موقع ملا کہ وہ امام باقرؑ اور امام صادقؑ کے گرد جمع ہو جائیں اور ان دونوں حضرات کو بھی موقع ملا کہ وہ رسول اکرمؐ کے واقعی احکام کو سماج میں رواج دیں اور خلفاء کے تحریفی احکام کی کمزوریوں کا اظہار کریں۔ قرآن مجید کے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کا ازالہ کریں اور کبھی کتاب جامعہ کے حوالہ سے، کبھی رسول اکرمؐ کے نام سے اور کبھی بغیر کسی حوالہ کے واقعی احکام الٰہیہ کی ترویج کریں۔

اس سلسلہ میں امام صادقؑ کو دیگر تمام ائمہ کرام سے زیادہ موقع ملا اور کبھی کبھی آپ کے پاس کئی ہزار طالبان علم و راویانِ احادیث جمع ہو گئے کہ بعض اصحاب حدیث نے ان کے ناموں کی تعداد چار ہزار تک پہونچادی ہے۔ (ارشاد مفیدؒ متوفی ۴۱۳ھ صفحہ ۲۵۴، اعلام الوریٰ طبرسیؒ چھٹی صدی صفحہ ۲۷۶)

حافظ ابن عقدہ احمد بن محمد بن سعید الہمدانی کوفی جو زیدی جارودی مذہب کے ماننے والے تھے اور انھوں نے ۳۳۲ھ میں وفات پائی ہے۔ ان کی تالیفات میں امام جعفر صادقؑ سے روایت کرنے والے افراد کے "اسمار الرجال" ہیں جن کی تعداد چار ہزار بتائی گئی ہے اور ہر شخص کی حدیث بھی نقل کی گئی ہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ کے زمانہ میں اصحاب، اہلبیتؑ اور شیعوں کی ایک جماعت تھی جو امامؑ کی خدمت میں آبنوس کی تختیاں لے کر آتے تھے اور جیسے ہی امام نے کوئی لفظ ارشاد فرمایا یا کسی حادثہ میں کوئی فتویٰ دیا، فوراً محفوظ کر لیا کرتے تھے اور اسی طرح دیگر ائمہ کے اصحاب بھی کرتے رہے۔ یہانتک کہ یہ کتابیں بھی ہزاروں تک پہونچ گئیں اور نجاشی اور شیخ طوسیؒ نے ان کی بھی ایک فہرست تیار کر دی اور اپنی اپنی مخصوص سند کے ساتھ ان کتابوں کو ان کے مولفین کے نام سے روایت کرنے لگے۔

ائمہ معصومینؑ کے زمانہ میں یہ اصلیں تیار ہو گئی تھیں۔ اور اصل علم حدیث کے اعتبار سے اس کتاب کا نام تھا جس میں مولف ان تمام احادیث کو جمع کر لیتا تھا جنھیں خود امام علیہ السلام سے سنتا تھا یا کسی سننے والے سے نقل کرتا تھا اور اس کا مدرک کوئی دوسری کتاب یا تالیف نہیں تھا۔

ان اصحاب اصول کا طریقہ یہ تھا کہ روایت سننے کے بعد فوراً محفوظ کر لیتے تھے کہ کہیں پوری روایت یا اس کا کوئی حصہ امتداد زمانہ سے بھول نہ جائیں۔

قدیم علمار نے امیر المومنینؑ کے عہد سے امام عسکریؑ کے دور تک ان اصول کی تعداد چار سو بتائی ہے اور ان کا بیشتر حصہ اصحاب امام صادقؑ کا تالیف کردہ ہے چاہے ان میں صرف امام صادقؑ کی حدیثیں ہوں یا امام باقرؑ اور امام کاظمؑ کی حدیثیں بھی شامل ہوں۔

ان تمام احادیث کی جامع کتاب جو سب سے پہلے عالم وجود میں ثقۃ الاسلام ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی (متوفی ۳۲۹ھ) کے ہاتھوں آئی ہے وہ کتاب "کافی" ہے جس میں مولف موصوف نے تمام چھوٹے چھوٹے اصول و کتب کی احادیث کو جمع کر دیا ہے اور اس راہ

میں بیس سال صحرا نوردی کی ہے۔

اسی کافی اور دیگر اصول وتالیفات کا دوسرا مجموعہ شیخ صدوق ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن بابویہ (متوفی ۳۸۱ھ) نے فقہ سے متعلق روایات کو یکجا کر کے تیار کیا ہے اور اس کا نام "من لا یحضرہ الفقیہ" رکھا ہے جو فقہ اہلبیتؑ کا پہلا حدیثی مجموعہ ہے اور پھر اسی انداز پر شیخ ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسیؒ نے کتاب تہذیب الاحکام تیار کی ہے۔ جس میں شیخ مفیدؒ کی کتاب "المقنعہ" کی شرح کی ہے اور پھر کتاب "استبصار" تیار کی ہے جس میں روایات کے اختلاف کو حل کیا ہے اور ان سب کا نام کتب اربعہ ہو گیا ہے جو مدرسۂ اہلبیتؑ میں روز تالیف سے آج تک تعلیمات کا محور و مرکز بنی ہوئی ہیں اور ان کی حیثیت مدرسۂ خلافت کی صحاح ستّہ سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مدرسۂ امامت قرآن مجید کے علاوہ کسی کتاب کے مکمّل طور پر صحیح ہونے کی ضمانت نہیں لیتا ہے۔

عصر کلینیؒ وغیرہ میں انداز تدریس

جناب کلینیؒ اور ان کے قبل وبعد کے زمانہ کے تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تدریس کا انداز یہ تھا کہ استاد پوری اصل یا کتاب کو شاگردوں کے سامنے خود پڑھ کر سناتا تھا یا کوئی ایک شاگرد پڑھتا تھا اور باقی سنتے تھے کہ استاد نے کسی مقام پر کوئی تبصرہ تو نہیں کیا ہے۔ اور اس کے بعد استاذ ان شاگردوں کو اجازہ دیتا تھا کہ اس کے حوالہ سے اس کتاب کو نقل کر سکتے ہیں جس کو اجازۂ روایت کہا جاتا تھا اور اس کے ذریعہ شاگرد کا سلسلہ صاحب کتاب سے مل جاتا تھا اور یہی شاگرد آئندہ نسل کے لئے شیخ الحدیث بن جاتا تھا اور اگلی نسل کو انھیں دونوں طریقوں سے اجازہ دیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ شیخ طوسیؒ کا زمانہ آگیا اور انھوں نے ۴۴۸ھ میں نجف اشرف منتقل ہو کر وہاں ایک حوزۂ علمیہ کی بنیاد رکھ دی۔

تاسیس حوزۂ نجف کے بعد

شیخ طوسیؒ نے ۴۴۸ھ میں حوزۂ نجف اشرف کی بنیاد رکھی اور تمام زندگی ۴۶۰ھ

تک اس کی نگرانی اور رہنمائی کرتے رہے۔ اس حوزہ میں یہی کتب اربعہ درسیات کا محور و مرکز تھیں اور انھیں اسی انداز سے پڑھایا جاتا تھا کہ پڑھنے والے کا سلسلہ صاحب کتاب سے متصل ہو جائے۔

حوزۂ نجف کے انداز پر ہی دوسرے چھوٹے چھوٹے مختلف حوزات علمیہ چل رہے تھے اور اس طرح یہ کتابیں مرکزی حیثیت کی مالک بنی رہیں اور ان کا انداز بالکل الفیہ ابن مالک جیسا رہا کہ اسے روز اول سے آجتک طلاب اپنے اساتذہ سے پڑھ رہے ہیں یا جس طرح طب اور فلسفہ میں ابن سینا کی کتابوں کا حال ہے کہ روز اول سے آجتک ان کی تعلیم دی جا رہی ہے یا بعض دیگر کتب کی حیثیت ہے کہ انھیں نسلوں میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ کتب احادیث کی اہمیت دیگر کتب سے زیادہ رہی ہے اور انھیں سماعت، قرائت یا اجازہ کے ذریعہ ہر نسل میں آگے بڑھایا گیا ہے جیسا کہ ان بعض اجازات سے اندازہ ہوتا ہے جنھیں علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار کی ستائیسویں جلد میں جمع کیا ہے اور میرے جد بزرگوار شیخ المحدثین مرزا محمد شریف العسکری نے مزید پانچ جلدوں میں بطور مستدرک جمع کیا ہے۔

ان اجازات کی (جن میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ کتب احادیث کی قرائت کا سلسلہ دَور مولف سے مل جاتا ہے) بہترین مثالوں میں شیخ فخر الدین محمد (متوفی ۷۷۱ھ) ابن العلامہ الحلی الحسن بن یوسف بن علی بن مطہر کا اجازہ ہے جو انھوں نے شیخ محسن بن مظاہر کو عنایت فرمایا ہے اور اس میں تصریح کی ہے کہ میں نے ان کو اجازت دی ہے کہ یہ میری طرف سے شیخ اعظم، امام اقدم، مقرر قواعد شریعت، شیخ الشیعہ، عماد الدین ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی کے مولفات کی روایت کریں۔ جن میں سے کتاب تہذیب الاحکام کو میں نے اپنے والد بزرگوار سے بطور درس پڑھا ہے اور اس کی قرائت جرجان میں ۷۱۲ھ میں تمام ہوئی ہے۔ اور میرے والد نے اپنے والد ابو المظفر یوسف بن علی بن المطہر سے پڑھا ہے اور ان سے اجازۂ روایت لیا ہے اور حضرت یوسف موصوف نے اسے

شیخ معمر بن ہبۃ اللہ بن نافع الوراق سے پڑھ کر اجازہ حاصل کیا ہے اور معمر مذکور نے فقیہ ابو جعفر محمد بن شہر آشوب سے پڑھ کر اجازہ لیا ہے اور ابن شہر آشوب نے خود اس کے مصنف ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسیؒ سے پڑھا ہے۔

اس کے بعد دوبارہ میرے جد نے اس کتاب تہذیب کو شیخ یحییٰ بن محمد بن یحییٰ بن الفرج السوراوی سے پڑھ کر اجازہ لیا ہے اور انھوں نے فقیہ الحسین بن ہبۃ اللہ سے پڑھ کر اجازہ لیا تھا۔ اور انھوں نے شیخ مفید ابو عبد اللہ محمد بن الحسن الطوسیؒ سے پڑھ کر اجازہ لیا تھا اور انھوں نے اپنے والد سے اجازہ لیا تھا اور میرے پاس اس کتاب کی ایک جلد موجود ہے جسے شیخ مفیدؒ نے اپنے والد سے پڑھا ہے اور وہ ان کے والد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور میں نے بھی اس کتاب کو اپنے والد سے پڑھا ہے اور باقی جلدوں کو دوسرے نسخوں سے پڑھا ہے۔

اس کے علاوہ کتاب النہایۃ والجمل کو میں نے اپنے والد سے پڑھا ہے اور انھوں نے دوسرے طریق سے اپنے والد سے روایت کرنے کی اجازت دی ہے۔

(بحار ۱۰۷/ ۲۲۳)

اجازہ کی یہ قسم جو علامہ حلیؒ کے فرزند نے شیخ محسن بن مظاہر کو عنایت فرمائی ہے اس میں اجازہ دینے والے نے جس کا دور آٹھویں صدی ہجری کا نصف دوم ہے اِس انداز سے بیان کیا ہے کہ میں نے شیخ طوسیؒ کی تہذیب اپنے والد محترم سے درس، درس کر کے پڑھی ہے اور انھوں نے اپنے شیخ سے پڑھی ہے اور ان کے شیخ نے اپنے شیخ سے پڑھی ہے۔ یہانتک کہ یہ سلسلہ اس شیخ الحدیث تک پہونچ گیا ہے جس نے خود مولف کتاب شیخ طوسیؒ سے پڑھی ہے۔

اور اس کے بعد یہ بھی تصریح کی ہے کہ میں نے کتاب تہذیب کا جو حصّہ اپنے والد سے پڑھا ہے وہ خود شیخ طوسیؒ کے قلم سے تھا جن کا انتقال پانچویں صدی کے نصف اول میں ہوا ہے (اور اس طرح آٹھویں صدی کے نصف دوم کو پانچویں صدی کے نصف اول سے متصل کر دیا ہے۔۔ جوادی)

اس کے بعد کتاب النہایۃ کے اجازہ میں تحریر کیا ہے کہ میں نے اسے اپنے والد علامہ حلیؒ سے درس، درس کر کے پڑھا ہے اور پھر شیخ محسن کو ایک دوسرے طریق سے روایت کرنے کی بھی اجازت دی ہے جس کا سلسلہ دوسرے افراد کے ذریعہ مولف کتاب تک پہونچ جاتا ہے۔

اجازہ کا یہ انداز جس میں ایک رسالہ کی شکل میں شیخ اپنے شاگرد کو کسی ایک کتاب یا متعدد کتب کے روایت کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس میں کبھی تمام شیوخ کا ذکر ہوتا ہے اور کبھی ان کا ذکر نہیں بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد جہاں شیوخ کا ذکر ہوتا ہے ۔ وہاں بھی بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ سند قرائت کو تسلسل کے ساتھ ذکر مولف تک پہونچا دیا جائے جیسا کہ فخر الدین کے اجازہ میں دیکھا گیا ہے ۔ ورنہ عام طور سے اس انداز سے ذکر ہوتا ہے کہ "میں نے اس کی روایت فلاں سے عن فلاں کی ہے ۔ یا "حدثنی فلاں عن فلاں" یا "اخبرنی فلاں عن فلاں" ۔ تاکہ سند مختصر ہو جائے۔

سلسلۂ اجازات میں یہی طریقہ کار عام طور سے رائج رہا ہے جس کی مثال علامہ حلیؒ حسن بن یوسف (متوفی ۷۲۶ھ) میں پائی جاتی ہے جو انھوں نے سید مہنا بن سنان المدنی (متوفی ۷۵۴ھ) کو دیا ہے کہ اس میں اس انداز سے تحریر فرمایا ہے کہ اصحاب سالفین کی کتابوں سے جو میں نے روایت کی ہے اپنے ان اسناد کے ذریعہ جو ان حضرات تک مسلسل ہیں اور آخر میں بیان کیا ہے کہ میں نے شیخ طوسیؒ کی کتابوں کی روایت کی اجازت بھی انھیں طریقوں سے دی ہے جو مجھ سے میرے والد کے ذریعہ شیخ تک پہونچتے ہیں۔

اور یہاں علامہ حلیؒ نے اپنے فرزند فخر الدین کی طرح پورے سلسلہ کا ذکر نہیں کیا ہے کہ میں نے اپنے والد شیخ یوسف سے پڑھا ہے ۔ اور انھوں نے فلاں سے پڑھا ہے اور یہ سلسلہ شیخ طوسیؒ تک پہونچ گیا ہے۔

بلکہ کتاب کافی کی روایت میں قدرے تفصیل سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں مذکورہ روایات میں نے اپنے والد شیخ ابوالقاسم جعفر بن سعید اور جمال الدین

احمدؒ بن طاؤس وغیرہ سے ان کے اسناد کیساتھ شیخ مفیدؒ محمد بن محمد ابن النعمان سے اور انھوں نے ابوالقاسم جعفر بن محمد بن قولویہ سے ۔ اور انھوں نے محمد بن یعقوب کلینیؒ سے روایت کی ہے اور انھوں نے ان افراد سے روایت کی ہے جن کا سلسلہ ائمہ معصومینؑ تک پہونچ جاتا ہے ۔

اور آخر میں یہ عبارت بھی ہے کہ اس اجازہ کو حسن بن یوسف بن المطہر الحلیؒ نے ذی الحجہ ۷۱۹ھ میں حلہ میں تحریر کیا ہے ۔

ــ اس اجازہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ نے لفظ " رویت عن.... " کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان نے اپنے شیخ سے سُنا ہے اور شیخ نے شیخ سے سُنا ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ صاحبِ کتاب تک پہونچ گیا ہے اور "عن۔ عن" کا سلسلہ رُک گیا ہے ۔

ــ اس کی ایک مثال علامہ مجلسیؒ کے اجازہ میں پائی جاتی ہے جو انھوں نے اردبیلی کو عنایت فرمایا ہے اور اس طرح لکھا ہے ۔" امابعد ! میرے سامنے حاجی محمد اردبیلی نے پڑھا ہے اور مجھ سے سُنا ہے ۔ بہت سے دینی علوم کو اور خاص طریقہ سے کتب احادیث کو جنھیں ائمہ معصومینؑ سے نقل کیا گیا ہے اور پھر مجھ سے اجازہ روایت طلب کیا تو میں نے پروردگار سے طلب خیر کرتے ہوئے انھیں اجازت دے دی کہ میری طرف سے روایت کر سکتے ہیں کہ مجھے بھی اپنے اساتذہ اور مشائخ سے حق روایت و اجازت حاصل ہے کہ مجھ سے ایک جماعت نے بیان کیا ہے جن کے سامنے میں نے پڑھا ہے یا سُنا ہے اور ان میں میرے والد علام اور ان کے استاد مولانا حسن علی شوستری بھی شامل ہیں اور ان حضرات کو حق روایت و اجازت شیخ الاسلام بہاء الملۃ محمد العاملیؒ سے ان کے والد کے حوالہ سے ملا ہے " اور اس طرح علامہ مجلسیؒ نے اس اجازہ کی سند کو شیخ محمد فخر الدین ۔ اور ان کے ذریعہ ان کے والد علامہ حلیؒ سے ملا دیا ہے اور پھر اسے شیخ مفیدؒ اور کلینیؒ و صدوقؒ تک پہونچا دیا ہے ۔

ــ اس کے بعد ایک اور سند کا ذکر کیا ہے جہاں یہ بیان کیا ہے کہ مجھ سے مذکورہ

افراد نے بیان کیا ہے اور انھیں فلاں افراد سے حق روایت حاصل تھا اور یہ سلسلہ شہید محمد بن مکی (۷۸۶ھ) سے مل جاتا ہے اور آخر میں اس طرح تمام کیا ہے کہ اس اجازہ کو اپنے ہاتھ سے محمد باقر بن محمد تقی نے ۱۰۹۶ھ میں تحریر کیا ہے۔

(جامع الرواۃ ۲/ ۵۴۹-۵۵۲)

اس طرح کے بہت سے اجازے بحار الانوار کی کتاب الاجازات میں پائے جاتے ہیں جہاں اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ ان کتابوں کو شیوخ کے سامنے پڑھا گیا ہے اور انھوں نے روایت کا اجازہ دیا ہے۔ جیسے کہ الشیخ حسن علی بن مولا عبد اللہ نے محمد تقی مجلسیؒ کو ۱۰۳۴ھ میں اجازہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے تہذیب الاحکام کا بیشتر حصہ میرے سامنے پڑھا اور سنا ہے اور من لا یحضرہ الفقیہ کا بھی زیادہ حصہ پڑھا ہے اور کافی کی بھی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ (بحار ۱۱۰/ ۳۸-۴۲)

اور پھر ملا محمد تقی مجلسیؒ کے اجازہ میں یہ عبارت ہے جو انھوں نے مرزا ابراہیم کو دیا ہے کہ "مجھے قرائت اور سماعت و اجازت کی بنیاد پر بہار الملۃ محمد العاملیؒ نے شیخ عبد العالی کے حوالہ سے اجازہ دیا ہے"۔ (بحار ۱۱۰/ ۶۷-۷۳)

اور یہی انداز محمد بن الحسن الحر العاملیؒ (متوفی ۱۱۰۴ھ) کے اجازہ میں پایا جاتا ہے جو انھوں نے شیخ محمد فاضل المشہدی کو اس انداز سے دیا ہے کہ انھوں نے بقدر ممکن میرے سامنے پڑھا ہے جس میں کتاب من لا یحضرہ الفقیہ" اول سے آخر تک ہے اور کتاب الاستبصار بھی مکمل ہے اور کتاب اصول کافی بھی مکمل ہے اور کتاب التہذیب کا بیشتر حصہ ہے اور ان کا پڑھنا بھی بحث، تنقیح اور تدقیق کے ساتھ تھا۔ انھوں نے خوب پڑھا، بہترین پڑھا، استفادہ کیا بلکہ اس سے زیادہ افادہ کیا کہ ان میں کوشش، اجتہاد اور فہم روایت کی قابلیت و استعداد پائی جاتی تھی اور وہ صرف نقل حدیث کے نہیں بلکہ نقد حدیث اور درایت کے بھی اہل تھے۔ اور پھر بھی انھوں نے مجھ سے اجازہ طلب کیا تو میں نے فقط اس طلب کو قبول کر لیا۔ (بحار ۱۱۰/ ۱۰۷-۱۰۹)

— یہ اجازہ کی ایک قسم تھی جسے شیخ الحدیث مستقل رسالہ کی شکل میں تحریر کیا کرتا

تھا۔ اور ایک دوسری قسم تھی جسے کتاب ہی پر لکھ دیا جاتا تھا جیسے کہ علامہ مجلسیؒ کے وہ پانچ اجازے ہیں جو انھوں نے اپنے شاگرد محمد شفیع تویسرکانی کو عنایت فرمائے ہیں اور ہم نے کتب اصول کافی کے اواخر میں ان کا مشاہدہ کیا ہے جس کی تصویر بھی اس کتاب کے آخر میں شامل کر دی ہے۔

۔ ان اجازوں میں پہلا اجازہ کتاب العقل والتوحید کے آخر میں نقل کیا گیا ہے جو کافی طبع تہران کے ۱/۱۶۷ پر ہے جس کی عبارت یہ ہے کہ یہاں تک مولا فاضل .... محمد شفیع التویسرکانی ... نے سماعت، تصحیح، تدقیق اور ضبط کے ساتھ مختلف مجالس میں پڑھا ہے جس کی آخری مجلس ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۰۸۲ھ میں تھی اور پھر میں نے انھیں اپنی طرف سے تمام روایات نقل کرنے کی اجازت دے دی کہ یہی اجازت مجھے میرے شیوخ اور اسلاف سے حاصل ہے اور اس کی متعدد سندیں ہیں جو ان حضرات تک پہونچ جاتی ہیں اور اسے اپنے خاطی ہاتھوں سے احقر محمد باقر بن محمد تقیؒ نے حمد وصلوات کیساتھ تحریر کیا ہے۔

۔ دوسرا اجازہ کافی کے جزء دوم کے آخر میں مذکور ہے جو مطبوعہ تہران کے ۱/۳۶۷ کے مقابل ہے اور اس کی تاریخ پہلے اجازہ کے چھ ماہ بعد کی ہے کہ اس میں لکھا گیا ہے کہ اسے موصوف نے مختلف مجالس میں تمام کیا ہے جس کی آخری مجلس ذی القعدہ ۱۰۸۲ھ میں تھی اور اسے سُن کر میں نے انھیں اجازت دے دی ہے۔

۔ تیسرا اجازہ کتاب الحجہ کے آخر میں ہے جو مطبوعہ تہران نے ۱/۵۴۸ کے مقابل ہے اور اس کا زمانہ دوسرے اجازہ کے پانچ ماہ بعد کا ہے جس کی عبارت یہ ہے کہ آخری مجلس اواخر ماہ ربیع الثانی ۱۰۸۴ھ میں تھی اور پھر میں نے انھیں روایت کی اجازت بھی دے دی۔

۔ چوتھا اجازہ آخر کتاب الایمان میں ہے جو مطبوعہ تہران کے ۲/۴۶۴ کے مقابل ہے اور یہ تیسرے اجازہ کے دو سال دس ماہ بعد دیا گیا ہے جس کی عبارت یہ ہے کہ اس کی قرائت بھی مختلف مجالس میں تمام ہوئی ہے جس کی آخری مجلس محرم ۱۰۸۷ھ میں تھی۔

۔ پانچواں اجازہ کتاب العشرہ کے آخر میں مطبوعہ تہران کے ۲/۶۷۴ کے مقابل

میں ہے جو چوتھے اجازہ کے تین ماہ تین دن کے بعد لکھا گیا ہے اور اس میں تصریح ہے کہ آخری مجلس ۳ جمادی الاولیٰ ۱۰۸۷ھ میں تمام ہوئی ہے اور میں نے انھیں اجازۂ روایت دے دیا ہے۔

گذشتہ اجازات کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اجازات کی مختلف صورتیں تھیں۔

بعض اجازات میں یہ صراحت تھی کہ ایک شیخ نے دوسرے شیخ کے سامنے پڑھا ہے اور اس طرح سلسلۂ قرائت صاحب کتاب تک پہونچ گیا ہے۔

بعض اجازات میں اس امر کی تصریح نہیں ہے بلکہ اس کے بدلے علم الحدیث کی اصطلاحوں سے کام لیا گیا ہے۔

بعض اجازات میں زمان و مکان قرائت کا بھی ذکر ہے اور یہ بھی تصریح ہے کہ ساری کتاب کو قرائت یا سماعت کے عنوان سے ختم کیا گیا ہے۔

یہ سلسلۂ اجازات کافی، فقیہ اور تہذیب کے مولفین کے دور سے شروع ہوا اور مجلسیؒ کے دور تک جاری رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتب اربعہ کا سلسلہ روزِ تالیف سے دورِ حاضر تک مسلسل رہا ہے اور کسی مرحلہ پر یہ سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے اور آج تک فقہائے مدرسۂ اہلبیتؑ انھیں سلسلوں کے ذریعہ اور انھیں کتابوں سے استنباط مسائل کر رہے ہیں کہ جب بھی کوئی فقیہ کسی مسئلہ میں فتویٰ صادر کرنا چاہتا ہے تو اسی کافی، تہذیب، استبصار، فقیہ اور وسائل کو مدرک قرار دیتا ہے اور انھیں کتابوں کی احادیث سے استنباط کرتا ہے جن کتابوں کا دارومدار ان اصول اور کتابوں پر ہے جنھیں اصحاب ائمہ نے مرتب کیا تھا اور بعد میں ان مفصل کتابوں میں جمع کر دی گئی ہیں۔

گویا کہ مجتہدین مسائل کو کتب احادیث سے اخذ کرتے ہیں اور کتب احادیث نے ان احادیث کو اصول و مولفات سے لیا ہے اور اصحاب اصول نے ان احادیث کو ائمہ اہلبیتؑ سے لیا ہے اور ائمہ اہلبیتؑ نے اسے کتاب الجامعہ سے لیا ہے جسے رسول اکرمؐ نے املا کرایا تھا اور حضرت علیؑ نے اپنے قلم سے تحریر کیا تھا۔

ائمہ اہلبیتؑ نے ہر دور میں رائے اور قیاس سے برائت اور بیزاری کا اعلان کیا ہے اور اپنے احکام میں کسی وقت بھی اسے مدرک نہیں بنایا ہے بلکہ ارشاداتِ پیغمبرِ اسلامؐ کو مدرک بنایا ہے جسے کتاب حضرت علیؑ سے اخذ کیا ہے۔

اس کے برخلاف مدرسۂ خلافت نے ہر دور میں اجتہاد بالرائے اور قیاس پر اعتماد کیا ہے اور خلفاء اسلام نے صاف اور صریح نصوص کے مقابلہ میں بھی اپنی رائے کو مقدم رکھا ہے اور اسی پر اعتماد کیا ہے۔

ذیل میں فقہ اہلبیتؑ کی صحیح صورت حال کی وضاحت کی جا رہی ہے تاکہ اس کی اصالت و واقعیت کا باقاعدہ اندازہ کیا جا سکے۔

مدرسۂ اہلبیتؑ

املاء رسول اکرمؐ

|

کتاب جامعہ حضرت علی علیہ السلام

|

روایات ائمہ اثنا عشرؑ

|

اصول و تالیفات مختصرہ

|

کافی

|

فقیہ، تہذیب، استبصار

|

رسائل فقہاء مدرسۂ اہلبیتؑ
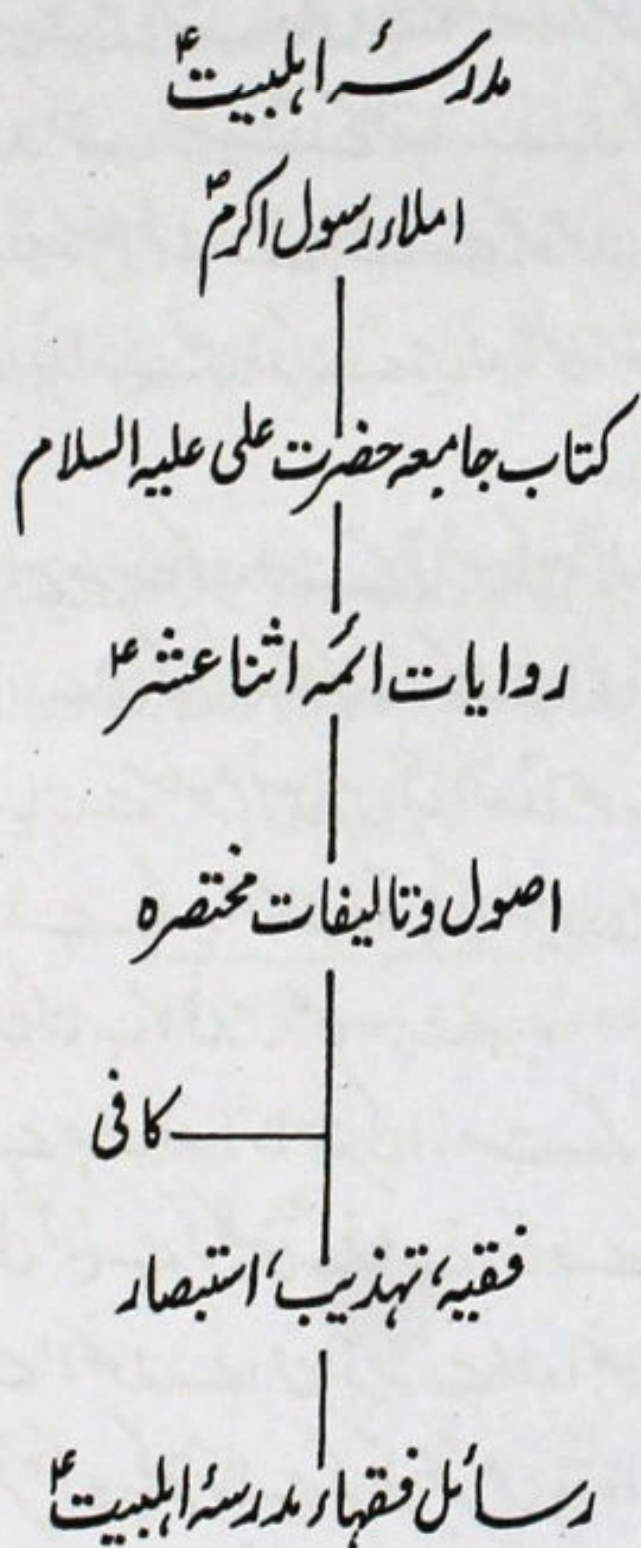
کتب احادیث کی حیثیت

مدرسۂ اہلبیتؑ میں

کتب حدیث کی غلطیاں

اگرچہ مدرسۂ اہلبیتؑ میں کتب احادیث کا سلسلہ رسول اکرمؐ تک پہونچ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود مکتب اہلبیتؑ کے فقہاء نے اپنی کسی کتاب کو صحیح کا نام نہیں دیا ہے جب کہ مدرسۂ خلافت نے بہت سے مجموعوں کو صحیح کا نام دیدیا ہے اور اس طرح عقلوں کے دروازے بھی بند کر دئے ہیں اور علمی بحثوں کے دروازوں پر بھی پہرے بٹھادئے ہیں۔

مدرسۂ اہلبیتؑ میں ہر حدیث کو درایت کے قوانین کی منزلوں سے گذرنا پڑے گا اور انھیں کی بنیاد پر ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک راویانِ احادیث خطا و نسیان سے معصوم نہیں ہیں لہٰذا قصداً جھوٹ نہ بولنے کے باوجود غلطی کا امکان بہرحال پایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ امکان وقوع کی منزلوں میں بھی موجود ہے اور حدیث کی قدیم ترین اور مشہور ترین کتاب کافی میں بھی حدیث نمبر ۷، ۹، ۱۴، ۱۷، ۱۸ کتاب الحجہ میں فاش غلطی پائی جاتی ہے جہاں ائمہ اثنا عشرؑ کی امامت کے بارے میں حدیث ۷ اور ۱۴ اس طرح نقل کی گئی ہے کہ کلینیؒ نے اپنے اسناد سے ابن سماعہ سے، انھوں نے علی بن الحسین بن رباط سے، انھوں نے ابن اذینہ سے اور انھوں نے زرارہ سے یہ روایت کی ہے کہ میں نے امام باقرؑ کو یہ کہتے سنا ہے کہ آل محمدؐ میں بارہ امام سب کے سب محدَّث ہیں اور اولاد رسولؐ میں ہیں اور اولاد علیؑ میں ہیں کہ رسول اللہؐ اور علیؑ دونوں ہی والد ہیں۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ ائمہ کی تعداد تیرہ[۱۳] ہے۔ اس لئے کہ علیؑ بارہ[۱۲] کے والد ہو گئے تو ائمہ کو تیرہ ماننا پڑے گا جو سراسر غلط ہے۔ اگرچہ علامہ مجلسیؒ نے مرآۃ العقول ۶/۲۲۳ میں یہ تاویل کی ہے کہ کلّھم سے مراد اکثریت ہے۔ لیکن روایت بہرحال غلط ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی روایت کو جب شیخ مفیدؒ نے ارشاد میں اور طبرسی نے اعلام الوریٰ میں نقل کیا ہے تو اس کے الفاظ یہ ہیں" اثنا عشر ائمہ آل محمدؐ میں سب کے سب محدث ہیں۔ یہ سب علیؑ بن ابی طالب اور ان کی گیارہ اولاد ہیں جن کے لئے رسول اللہ اور علیؑ والد کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

اس کے علاوہ جب صدوقؒ نے اسی روایت کو کلینیؒ کے حوالہ سے عیون اخبار الرضا اور خصال میں نقل کیا ہے تو اس کے الفاظ یوں تحریر کئے۔" آل محمدؐ کے بارہ امام سب کے سب محدث ہیں۔ رسول اکرمؐ کے بعد اور علیؑ بن ابی طالب کا شمار انھیں بارہ میں ہوتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں غلطی کا سلسلہ شیخ مفیدؒ کے بعد شروع ہوا ہے اور نقل کرنے والوں نے الفاظ بدل دئے ہیں ورنہ شیخ مفیدؒ کے دور تک حدیث صحیح شکل میں نقل ہو رہی تھی۔

میں نے اس مقام پر شیخ طبرسیؒ کے دور کا حوالہ نہیں دیا ہے اس لئے کہ وہ عام طور سے ساری روایتیں شیخ مفیدؒ کی ارشاد سے نقل کرتے ہیں اور ان کا الگ کوئی مدرک نہیں ہے۔

ائمہ اہلبیتؑ

اور

معرفتِ حدیث کے قواعد و قوانین

حدیثوں میں غلطی کا ایک اندازیہ بھی ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا اور ایک رازیہ بھی ہے کہ رسول اکرمؐ اور ائمہ اہلبیتؑ کے نام سے بیشمار حدیثیں وضع بھی کی گئی ہیں اور اس کے نتیجہ میں صحیح و غلط اور حق و باطل سب مخلوط ہو کر رہ گیا ہے۔

ائمہ معصومینؑ نے اس مسئلہ کو دو طرح سے حل کیا ہے:

۱۔ راویان حدیث میں جو افراد جھوٹے اور جعلساز ہیں، ان کی تشہیر کر دی جائے اور ان سے برائت کرتے ہوئے ان پر لعنت کی جائے تاکہ لوگ ان کا اعتبار نہ کریں جیسا کہ ابوالخطاب محمد بن ابی زینب الکوفی (مجمع الرجال ۶/۱۱۷۔۱۲۱) بنان بن بیان (مجمع الرجال ۶/۱۱۷) کے بارے میں وارد ہوا ہے۔

۲۔ ایسے قوانین وضع کر دئے جائیں جن پر ہر حدیث کو پرکھ لیا جائے اور صحیح و غلط کا اندازہ کر لیا جائے۔ جیسے کہ:

(ا)۔ امام صادقؑ نے اپنے جد رسول اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے منیٰ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ایہا الناس! میری طرف سے جو بھی روایت تم تک پہونچے۔ اگر کتابِ خدا کے مطابق ہے تو میں نے کہی ہے ورنہ نہیں کہی ہے۔ (وسائل الشیعہ ۱۸/۷۹ حدیث نمبر ۱۵ باب نمبر ۹ از ابواب صفات القاضی)

ب۔ حضرت علیؑ نے مالک اشترؒ کے عہد نامہ میں تحریر فرمایا تھا کہ "جس چیز میں

بھی اختلاف ہو، اُسے خدا و رسولؐ کی طرف پلٹا دو۔" اور یاد رکھو کہ خدا کی طرف پلٹانے والا وہ ہے جو کتاب کے محکمات کو اخذ کرے۔ اور رسولؐ کی طرف پلٹانے والا وہ ہے جو آپ کی اس سنت کو اخذ کرے جو جامع ہو اور تفرقہ کا ذریعہ نہ ہو۔ (نہج البلاغہ، وسائل ۱۸/۸۶ حدیث نمبر ۳۸) واضح رہے کہ تفرقہ کا ذریعہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر امت کا اجماع اور اتفاق ہو۔

ج۔ امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے کہ جب تمھارے پاس ہماری طرف سے کوئی حدیث آئے اور اس کے بارے میں کتاب خدا میں ایک یا دو شاہد موجود ہوں تو اسے لے لینا ورنہ توقف کرنا اور ہماری طرف واپس کر دینا تاکہ ہم اس کی وضاحت کر سکیں۔ (کافی ۲/۲۲۲، وسائل الشیعہ ۱۸/۸۰ حدیث نمبر ۱۸)

د۔ امام صادقؑ کی طرف سے حسب ذیل ارشادات نقل کئے گئے ہیں:

۱۔ اگر تمھارے پاس دو مختلف حدیثیں وارد ہوں تو دونوں کو کتابِ خدا سے ملاؤ اور جو اس کے موافق ہو اسے لے لو اور دوسری کو رد کر دو۔ (وسائل الشیعہ ۱۸/۸۰ حدیث نمبر ۱۸)

۲۔ ہر شے کو کتاب خدا کی طرف پلٹانا چاہئے اور اگر اس کے موافق نہ ہو تو خرافات اور مہمل ہے۔ (وسائل الشیعہ ۱۸/۷۹ حدیث نمبر ۱۴)

۳۔ تم بہترین فقیہ ہو، اگر ہمارے کلام کے معانی سمجھ لو اس لئے کہ ایک ایک کلمہ میں کئی کئی رُخ پائے جاتے ہیں۔ (معانی الاخبار ص۱ حدیث نمبر ۱، وسائل ۱۸/۸۴)

اس طرح کی متعدد احادیث ائمہ اہلبیتؑ سے نقل کی گئی ہیں۔ بلکہ بعض احادیث میں تو یہ بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اسے اخذ کرنا جو مدرسۂ خلفاء کے خلاف ہو اور اسکی توجیہ امام صادقؑ سے اس طرح نقل کی گئی ہے:

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ ہم نے عامہ کے خلاف والی روایت کو قبول کرنے کا حکم کیوں دیا ہے؟

حضور نہیں معلوم ہے۔!"

بات یہ ہے کہ حضرت علیؑ جو بات بھی فرماتے تھے امت اس کے خلاف باتیں گڑھ لیتی تھی تاکہ ان کی بات کو رد کر دیا جائے۔ یہ لوگ قصداً امیرالمومنینؑ سے مسئلہ دریافت کرتے تھے تاکہ آپ کے جواب کے خلاف روایت تیار کرا کے امت کو شبہ میں ڈال دیں۔

(علل الشرائع ۲/۲۱۸ حدیث نمبر ۱، وسائل الشیعہ ۱۸/۸۳-۸۴)

اور اگر کوئی شخص معاویہ کی سیرت کا مطالعہ کرے تو اسے اس موضوع پر بیشمار دلائل مل سکتے ہیں کہ کس طرح روایت سازی کو رواج دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مدرسۂ خلافت نے ہمیشہ اپنی رائے سے فتویٰ دیا ہے اور اکثر اوقات صریحی نصوص کے خلاف بھی فتویٰ دیا ہے لہٰذا نصوص کے معلوم کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ فتویٰ کو دیکھ لیا جائے اور اندازہ کر لیا جائے کہ اس موضوع میں اصل حدیث کیا رہی ہوگی۔ اگرچہ اس بات کا سمجھنا اور باور کرنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مشکل اور بھی ہے کہ بسا اوقات مکتب خلافت کے افراد ائمہ اہلبیتؑ سے مجمع عام میں مسائل دریافت کیا کرتے تھے تاکہ ان کے جواب کو اپنے مظالم کے لئے بہترین جواز بنا لیا جائے اور ائمہ طاہرینؑ کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ قانون تقیہ پر عمل کرتے ہوئے عامہ کے مسلک کے مطابق فتویٰ دیں اور اپنی اور اپنے چاہنے والوں کی زندگی کا تحفظ کریں اور یہی وجہ ہے کہ جب حالات سازگار ہو جاتے تھے تو فوراً اس حقیقت کی وضاحت کرتے تھے کہ فلاں فتویٰ تقیہ کا نتیجہ ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو سمجھ لو کہ اس میں تقیہ نہیں ہے۔ (وسائل الشیعہ ۱۸/۸۸)

ایک مقام پر فرمایا کہ "اگر ہماری طرف سے دو مختلف حدیثیں وارد ہوں تو دونوں کو کتاب خدا پر پیش کرو جو کتاب خدا کے مطابق ہو اسے لے لو اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دو اور اگر کتاب خدا میں ویسا کوئی موضوع نہیں ہے تو عامہ کے روایات سے ملا کر دیکھو اور جو ان کے موافق ہو اسے رد کر دو اور جو ان کے روایات کے خلاف اسے اخذ کر لو۔ (وسائل الشیعہ ۱۸/۸۴ حدیث نمبر ۲۹)

اس طرح ائمہ اہلبیتؑ نے قواعد کی بھی وضاحت کی ہے اور ان کا فلسفہ بھی بیان فرمایا ہے اور اس کے علاوہ معرفت حدیث کے کچھ اور وسائل بھی ہیں جن کی طرف امام رضاؑ نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے۔

جب آپ سے دریافت کیا گیا اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگ رسول اکرمؐ کی دو مختلف حدیثوں کے بارے میں جھگڑا کر رہے تھے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ نے حرام کو حرام کر دیا ہے، حلال کو حلال کر دیا ہے اور واجب کو واجب کر دیا ہے لہٰذا اگر کسی روایت میں حلال کو حرام۔ حرام کو حلال یا واجب کو غیر واجب بنایا جائے اور اس کے ناسخ ہونے پر کوئی دلیل نہ ہو تو ہرگز اسے قبول نہ کرنا کہ رسول اکرمؐ نہ حلال کو حرام کرنے آئے تھے اور نہ حرام کو حلال اور نہ واجب کو غیر واجب۔ وہ وحی الٰہی کا اتباع کرنے والے۔ اور پیغام الٰہی کے پیغامبر تھے اور بس!

راوی نے کہا کہ کبھی کبھی آپ کی طرف سے رسول اکرمؐ کے حوالہ سے روایت آتی ہے اور اس کا کوئی ذکر کتاب خدا میں نہیں ہوتا ہے اور پھر دوسری روایت اس کے خلاف آجاتی ہے تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے۔

فرمایا کہ رسول اکرمؐ نے بھی جس چیز کو حرام قرار دیا ہے وہ حرام خدا ہی ہے اور جس چیز کو واجب بنا دیا ہے وہ فرض الٰہی ہی ہے لہٰذا اگر اس کے خلاف کوئی روایت آئے تو اسے اختیار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہم اہلبیتؑ ہرگز رسول اکرمؐ کے خلاف نہیں بولتے ہیں۔ ہم نہ ان کے واجب کو جائز بناتے ہیں اور نہ جائز کو واجب مگر یہ کہ کوئی ضرورت ہو۔ البتہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال بنانا یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ ہم رسول اکرمؐ کے تابع اور آپ کے لئے ویسے ہی سراپا تسلیم ہیں جس طرح آپ احکام خدا کے لئے تھے۔ پروردگار نے صاف فرما دیا ہے کہ "جو رسول دیدے اسے لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے رُک جاؤ"۔

البتہ اگر کسی چیز کو خدا نے حرام نہیں کیا ہے یا واجب نہیں بنایا ہے بلکہ مکروہ اور مستحب قرار دیا ہے یا رسول اکرمؐ نے مکروہ اور مستحب فرمایا ہے تو اس میں اجازت سے فائدہ

اٹھایا جاسکتا ہے اور اس طرح کی روایت ہماری طرف سے نقل کی جائے تو دونوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے کہ ایک کا مطلب کراہت ہے اور دوسری کا اجازت۔ ایک کا مقصد استحباب ہے اور دوسری کا ترک کرنے کی رخصت اور آدمی دونوں کو تسلیم کرسکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اگر بر بنائے عناد و دشمنیِ رسولؐ ترک کیا ہے تو سمجھو کہ یہ انسان مشرک ہے۔

اب اگر دو روایتیں وارد ہوں تو دونوں کو کتابِ خدا پر پیش کر کے دیکھو۔ اگر وہ حلال یا حرام کتاب خدا میں موجود ہے تو اس پر عمل کرو۔ اور اگر کتاب خدا میں نہیں ہے تو سنت رسولؐ پر پیش کرو۔ اگر رسول اکرمؐ نے حرام یا واجب فرمادیا ہے تو اس پر عمل کرنا ہوگا اور ہمارے نام کی روایت بیکار ہے لیکن اگر مکروہ یا مستحب فرمایا ہے تو دونوں میں کسی کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن جذبہ حکم خدا کی تعمیل اور ارشادِ رسولؐ کے سامنے تسلیم ہی کا ہونا چاہیئے۔

البتہ اگر سنت رسولؐ میں بھی اس موضوع کا ذکر نہ ہو تو اسے ہماری طرف پلٹا دو کہ ہم اسے بہتر جانتے ہیں۔ اور خود اپنی رائے استعمال نہ کرو۔ تمہارا فرض ہے کہ توقف کر کے تحقیق کرو اور اس وقت تک تلاش کرتے رہو جب تک ہمارا کوئی بیان اور ہماری کوئی وضاحت نہ آجائے۔ (عیون الاخبار طبع قم ۲/۲۰ حدیث ۴۵، وسائل الشیعہ ۱۸/۸۱-۸۶ حدیث ۲۱)

کتب احادیث کے بارے میں

دونوں مکاتب کا تقابلی مطالعہ

مصادر شریعت کی بحث کے خاتمہ سے پہلے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ واضح شکل میں دونوں مکاتب فکر کے موقف کی وضاحت کر دی جائے اور یہ بیان کر دیا جائے کہ دونوں مکاتب میں کتب حدیث کی واقعی حیثیت کیا ہے۔

ا۔ مدرسۂ خلافت

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ خلفاء اسلام نے ابتدا میں نشر احادیث پیغمبرؐ پر شدید پابندی عائد کر رکھی تھی اور اس کا سلسلہ عمر بن عبد العزیز کے دور تک جاری رہا۔ جب اس نے اس پابندی کو ختم کر کے تدوین احادیث کا سلسلہ شروع کرایا اور محدثین میں تدوین کی دوڑ شروع ہو گئی اور مختلف کتب احادیث منظر عام پر آ گئیں جن میں سے چھ کو صحاح کا درجہ حاصل ہو گیا۔

۱۔ صحیح بخاری۔ تالیف محمد بن اسماعیل (متوفی ۲۵۶ھ)
۲۔ صحیح مسلم۔ تالیف مسلم بن حجاج نیشاپوری (متوفی ۲۶۱ھ)
۳۔ سنن ابن ماجہ۔ تالیف محمد بن یزید القزوینی (متوفی ۲۷۳ھ)
۴۔ سنن ابی داؤد۔ تالیف سلیمان بن اشعث سجستانی (متوفی ۲۷۵ھ)
۵۔ سنن ترمذی۔ تالیف محمد بن عیسیٰ ترمذی (متوفی ۲۷۹ھ)
۶۔ سنن نسائی۔ تالیف احمد بن شعیب نسائی (متوفی ۳۰۳ھ)

بعض حضرات نے سنن نسائی کے بدلے یہ مقام سنن دارمی کو دیا ہے جس کے مولف عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی (متوفی ۲۵۵ھ) ہیں۔

اس صحیح سازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمار مکتب خلافت کے یہاں علمی بحث کے دروازے بند ہو گئے، اور انھوں نے انھیں چھ افراد اور خاص طریقہ سے بخاری اور مسلم کی تقلید شروع کر دی اور انھیں کے صحیح کو صحیح کہنا شروع کر دیا۔ جو حال اجتہاد کے بارے میں ہوا کہ اسے بھی چار افراد میں منحصر کر کے فکر و نظر کے دروازے بند کر دیے گئے اور سب انھیں چار کے مقلد ہو گئے، جن کے "اسمار گرامی" یہ ہیں:

۱۔ ابو حنیفہ عتیک بن زوطی المعروف بہ نعمان بن ثابت (متوفی ۱۵۰ھ) واضح رہے کہ خطیب بغدادی نے موصوف کا یہی نام نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ زوطی بنی تیم اللہ کا غلام تھا۔

۲۔ مالک بن انس (متوفی ۱۷۹ھ)

۳۔ محمد بن ادریس شافعی (متوفی ۲۰۴ھ)

۴۔ احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ)

اس کے بعد حنبلیوں کی ایک شاخ سلفیہ پیدا ہوئی جس نے ابن تیمیہ احمد بن عبدالحلیم (متوفی ۷۲۶ھ) کا اتباع شروع کر دیا اور انھیں میں سے ایک شاخ وہابیوں کی پیدا ہو گئی جنھوں نے محمد بن عبدالوہاب (متوفی ۱۲۰۶ھ) کو اپنا امام مذہب تسلیم کر لیا۔

ب۔ مدرسۂ اہلبیتؑ میں کتب حدیث کی حیثیت

مدرسۂ اہلبیتؑ میں سب سے پہلی کتاب امام علیؑ نے ترتیب دی ہے جسے رسول اکرمؐ نے املار کرایا تھا اور حضرت علیؑ نے ستر گز لمبی کھال پر تحریر فرمایا تھا اور اس کا نام جامعہ رکھا گیا تھا جس میں قیامت تک پیش آنے والے تمام احکام اسلام موجود تھے۔

ائمہ اہلبیتؑ کو یہ کتاب وراثت میں ملی اور انھوں نے اسی کتاب سے احادیث بیان کیں جنھیں ان کے اصحاب نے اصول اور تالیفات کی شکل میں تحریر کیا اس کے بعد شیخ کلینیؒ نے ان تمام اصول اور رسائل کو ایک مقام پر جمع کر دیا۔ (شیخ کلینیؒ کا انتقال

۳۲۹ھ میں ہوا ہے)

اس کے بعد شیخ صدوقؒ (متوفی ۳۸۱ھ) نے ایک مفصل مجموعہ "مدینۃ العلم" کے نام سے جمع کیا جو اس وقت ناپید ہو گیا جب دشمنانِ اہلبیتؑ نے مدرسۂ اہلبیتؑ کے کتبخانوں میں آگ لگادی اور انھیں دربدر کر دیا۔

اس سلسلہ کی آخری کتاب علامہ مجلسیؒ (متوفی ۱۱۱۰ھ) کی کتاب بحار الانوار تھی۔ اور ان کے شاگرد علامہ بحرینی کی عوالم تھی۔ لیکن علمار مدرسۂ اہلبیتؑ نے ان تمام احادیث میں فقہی احادیث کو زیادہ اہمیت دی اور اس کے مجموعہ الگ تیار کئے۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کتاب شیخ صدوقؒ کی "من لایحضرہ الفقیہ" تھی۔ جس کے بعد شیخ طوسیؒ (متوفی ۴۶۰ھ) نے استبصار اور تہذیب مرتب کی اور اس طرح کافی، تہذیب، استبصار اور من لایحضرہ الفقیہ چاروں کتابوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کر لی۔ حالانکہ ان کے بعد ترتیب پانے والی بعض کتابیں ان سب سے بہتر تھیں جیسے محدث حر عالمی (متوفی ۱۱۰۴ھ) کی "وسائل الشیعہ" اور آیۃ اللہ السید حسین بن علی البروجردی (متوفی ۱۳۸۰ھ) کی "جامع احادیث الشیعہ"۔ جو اس فن کی سب سے زیادہ متقن کتاب ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اقدمیت واولیت کا شرف دوسرے حضرات کو حاصل ہے۔

علماء اہلبیتؑ سلف صالح کے مقلد نہیں ہیں

مدرسۂ اہلبیتؑ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس نے کتاب خدا کے علاوہ کسی بھی کتاب کو ہر اعتبار سے صحیح کا درجہ نہیں دیا ہے اور نہ سلف صالحین کی فقہی رائے اور تصحیح حدیث کو سند قرار دیا ہے جب کہ مدرسۂ خلافت نے چار افراد پر دروازۂ اجتہاد بند کر دیا ہے اور ان کی تقلید ہی کو کمال علم کا نام دے دیا ہے اور اسی طرح چھ کتابوں کو صحیح قرار دے کر روایات کے بارے میں بحث و تمحیص کا ہر دروازہ بند کر دیا ہے۔

اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ علامہ حلی حسن بن یوسف (متوفی ۷۲۶ھ) نے احادیث کے ایک حصہ کو دس جلدوں میں مرتب کر کے "الدر والمرجان فی الاحادیث الصحاح والحسان" کا نام دیا۔ اور اس کے بعد ان میں سے بھی اپنے اجتہاد کے مطابق صحیح احادیث کو جمع کر کے "النہج الوضاح فی الاحادیث الصحاح" نام کی کتاب تیار کی۔

اس کے بعد الشیخ حسن بن شہید الثانی (متوفی ۱۰۱۱ھ) نے علامہ حلیؒ کا اتباع کرتے ہوئے "منتقی الجمان فی الاحادیث الصحاح والحسان" تیار کی لیکن کوئی ایک کتاب بھی حوزات علمیہ میں نہ چل سکی اور نہ علماء اعلام نے اسے کوئی حیثیت دی بلکہ اسے مولف کا ذاتی اجتہاد اور ان کی ذاتی تحقیق قرار دے دیا جب کہ انھیں حضرات کی دیگر کتابوں نے بے پناہ اہمیت حاصل کی اور شیخ حسن بن زین الدینؒ کی معالم الاصول آج تک درسیات میں شامل ہے اور اسے علم اصول کی پہلی کتاب کے طور پر پڑھایا جا رہا ہے اور انھیں صاحب معالم کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے اور ان کی کتاب "صحاح و حسان" کا دور دور پتہ نہیں ہے بلکہ شاید بہت سے ایسے علماء بھی ہوں گے جنھوں نے اس کتاب کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ اسے مدرک اور ماخذ بنانے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔!

کتب اربعہ کی احادیث کی حیثیت

مدرسۂ اہلبیتؑ نے کبھی بھی کتب اربعہ کافی، فقیہ، تہذیب اور استبصار کی جملہ حدیثوں کو اس طرح صحیح نہیں قرار دیا ہے جس طرح مدرسۂ خلافت نے چھ کتابوں کو اور بالخصوص بخاری اور مسلم کی جملہ روایات کو صحیح کا درجہ دے دیا ہے۔ حد یہ ہے کہ حدیث کی قدیم ترین اور عظیم الشان کتاب کافی میں بھی ۱۶۱۹۹ میں سے تقریباً ۹۴۸۵ احادیث کو ضعیف کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے جیسا کہ محدث کبیر علامہ مجلسیؒ کی مرآۃ العقول کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی شرح کافی میں ہر حدیث کی حیثیت کا بھی تعین کر دیا ہے اور ضعیف، صحیح، موثق یا قوی وغیرہ کی وضاحت کر دی ہے اور دور حاضر کے ایک محقق محمد باقر بہبودی نے ایک کتاب صحیح کافی کے نام سے تالیف کر دی ہے جو ۱۴۰۱ھ میں بیروت سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں ۱۶۱۲۱ احادیث میں سے صرف ۴۴۲۸ کو صحیح قرار دیا ہے اور باقی سب کو غیر صحیح بنا دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ موصوف نے صحت کا فیصلہ اس کتاب رجال کی بنیاد پر کیا ہے جو ابن الغضائری ابوالحسین احمد بن الحسین کی طرف منسوب ہے جو نجاشی اور شیخ طوسیؒ کے ہمعصر تھے اور علماء محققین کا کہنا ہے کہ ان کی کسی کتاب کا وجود نہیں ہے اور موجودہ کتاب ان کی نہیں ہے جیسا کہ معجم رجال الحدیث کے چھٹے مقدمہ میں ۱/۱۰۲ پر درج کیا گیا ہے۔

لیکن یہ بہرحال طے شدہ ہے کہ کسی عالم نے جملہ احادیث کو صحیح نہیں قرار دیا ہے اور سب کا ایک مشترک ایمان ہے کہ اول سے آخر تک صحیح صرف قرآن مجید ہے اور اس کے علاوہ کوئی کتاب اس کی شریک صحت نہیں ہے۔

ایک بے بنیاد شہرت

بعض حلقوں میں یہ شہرت پائی جاتی ہے کہ کتاب کافی کو دیکھ کر امام مہدیؑ نے فرمادیا تھا کہ یہ ہمارے شیعوں کے لئے کافی ہے اور اس طرح اسے صحیح کا درجہ حاصل ہے۔ حالانکہ آجتک اس قول کا قائل اور اس روایت کا راوی بھی نہیں معلوم ہو سکا ہے اور اس کے غلط ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسے کسی دور میں کافی نہیں سمجھا گیا ہے اور اس کے بعد فقیہ، تہذیب، استبصار۔ مدینۃ العلم، بحار، وسائل الشیعہ، جامع احادیث الشیعہ جیسی کتابیں تالیف کی گئی ہیں۔

فقہاء اہلبیتؑ کے نزدیک صحیح احادیث

مدرسۂ اہلبیتؑ کے ماننے والوں نے کسی دور میں بھی کتاب و سنت سے استنباط کا دروازہ بند نہیں کیا ہے جس طرح مدرسۂ خلافت نے اسے بند کر دیا ہے اس لئے انھیں ہر دَور میں قرآن مجید کی آیات احکام اور احادیث رسولؐ و ائمہؑ میں سے احادیث احکام کی شدید ضرورت رہی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف کتابیں بھی تالیف کی گئی ہیں۔ علامہ سیوری (متوفی ۸۲۶ھ) نے "کنز العرفان فی فقہ القرآن" لکھی ہے اور علامہ جواد کاظمیؒ نے "مسالک الافہام الیٰ آیات الاحکام" تالیف کی ہے اور اس میں آیات کے منطوق، مفہوم، خاص، عام، محکم، متشابہ سے مفصّل بحث کی ہے کہ سارے احکام شرعیہ کا دار و مدار انھیں آیات احکام پر ہے۔

اس کے بعد احادیث کے بھی مجموعے تیار کئے گئے جن میں احادیث احکام کو جمع کیا گیا ہے جیسے فقیہ، استبصار۔ تہذیب، وسائل، جامع احادیث الشیعہ وغیرہ اور پھر ایک ایک حدیث کی سند سے بحث کی گئی ہے تاکہ صحیح اور غیر صحیح کو الگ کیا جاسکے اور اس کے عام و خاص اور مجمل و مبین کی تحقیق کی جا سکے اور ان تمام تحقیقات کے نتیجہ کو کتب فقہ میں درج کیا جا سکے جن کا بہترین نمونہ شیخ طوسیؒ کی نہایہ۔ محقق حلیؒ

(متوفی ۶۷۶ھ) کی مختصر نافع اور شرائع الاسلام ۔ شہید اول (متوفی ۷۸۶ھ) کی لمعہ ۔ شہید ثانی (متوفی ۹۶۵ھ) کی شرح لمعہ اور شیخ محمد حسن (متوفی ۱۲۶۶ھ) کی جواہر الکلام ہے ۔

مذکورہ بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مدرسۂ اہلبیتؑ کے علمار نے قانونی طور پر صحیح و غلط کی تحقیق صرف ان روایات کے بارے میں کی ہے جن سے احکام شریعت کا استنباط کرنا تھا اور جن پر انسان کے عمل کا دار و مدار تھا اور وسائل الشیعہ یا جامع احادیث الشیعہ میں ان روایات کو اسی لئے درج کیا گیا ہے تاکہ ان پر بحث کی جا سکے اور ان کے صحیح وضعیف کا فیصلہ کیا جا سکے ۔ باقی وہ روایات جن کا تعلق سیرت انبیار، سیرت خاتم الانبیار، سیرت ائمہ و اصحاب، تاریخ اسلام، تفسیر قرآن، ادعیہ، اخلاق، مستحبات وغیرہ سے ہے ان کو قابل تحقیق نہیں سمجھا ہے اور ان راویوں سے بھی نقل کر دیا ہے جن کی کوئی حیثیت فقہی میدان میں نہیں تھی کہ اگر کسی مولف سے دریافت کیا جائے کہ آپ نے غیر فقہی میدان میں جتنی روایات نقل کی ہیں کیا یہ سب آپ کی نظر میں صحیح ہیں تو فوراً کہہ دے گا کہ یہ احادیث احکام نہیں ہیں کہ ان پر ریسرچ کی جائے ۔ یہ تو معلوماتی روایات ہیں لہٰذا ان پر محنت کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔

اور یہی وجہ ہے کہ تفسیر، سیرت، ادعیہ، اخلاق، اعمال مستحبہ کے ذیل میں ان راویوں کے روایات کو بھی درج کر دیا ہے جن کی فقہ میں کوئی جگہ نہیں تھی بلکہ مدرسۂ خلفار کے ان روایات کو بھی درج کر دیا ہے جو بالکل بے بنیاد تھیں اور ان پر تبصرہ اور اعتراض بھی کیا ہے ۔

مدرسۂ اہلبیتؑ میں مدرسۂ خلافت کے روایات کی شہرت

ہم نے اپنی کتاب "نقش ائمہ در احیاء دین" کی ساتویں جلد میں ان احادیث کی نشاندہی کر دی ہے کہ جنھیں شیخ مفیدؒ (متوفی ۴۱۳ھ) نے سیف بن عمر زندیق کے حوالہ سے نقل کیا ہے جو مدرسۂ خلافت کے عظیم راویانِ سیرت و تاریخ میں شمار ہوتا ہے۔

اور اسی طرح شیخ طوسیؒ نے اپنے رجال میں قعقاع کے حالات میں بعض روایات اہلسنت کو درج کر دیا ہے اور وہ انھیں کے حوالہ سے رجال اردبیلی (متوفی ۱۱۰۱ھ) رجال قہبائی اور رجال مامقانی تک سرایت کر گئی ہیں۔

اور شیخ موصوف کی تفسیر تبیان میں نقل کی ہوئی بعض روایات تفسیر ابو الفتوح رازی (متوفی ۵۵۴ھ) تفسیر گازر (متوفی ۷۲۲ھ) تفسیر کاشانی (متوفی ۹۸۸ھ) تک سرایت کر گئی ہیں۔

سیرت رسول اکرمؐ کے بارے میں احیاء علوم الدین غزالی (متوفی ۵۰۵ھ) کی بعض روایات جامع السعادات مہدی نراقی (متوفی ۱۲۰۹ھ) تک اور ان سے ان کے فرزند احمد نراقی (متوفی ۱۲۴۵ھ) کی معراج السعادۃ تک پہونچ گئی ہیں۔

ابن طاؤس (متوفی ۶۶۴ھ) نے اپنی دعاؤں کی کتاب "المجتنیٰ" میں تاریخ ابن اثیر (متوفی ۶۳۰ھ) کی اس روایت کو نقل کر دیا ہے جو سیف زندیق کی ہے اور اسے ابن اثیر نے طبری سے اخذ کیا ہے۔

مجلسی کبیرؒ (متوفی ۱۱۱۱ھ) نے سیرت رسولؐ، مقتل امام علیؑ، وفات جناب فاطمہؑ کے ابواب میں کتاب بحار میں ۴۶ صفحات میں ابو الحسن البکری (متوفی نصف قرن سیوم) کا حوالہ دیا ہے اور شیخ حر عاملیؒ نے بھی اس کتاب بکری کو نقل کر کے شیخ حسین بن عبد الوہاب کی کتاب عیون المعجزات

کے آخر میں ملحق کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ آدمی قصہ گڑھنے والا تھا جیسا کہ ذہبی نے اس کے حالات میں لکھا ہے اور یہ اولاد ابو بکر میں تھا۔ یہ وہ ابوالحسن البکری نہیں ہے جس کا نام محمد بن محمد بن عبدالرحمٰن تھا اور جس کا انتقال ۹۵۲ھ میں ہوا ہے جیسا کہ زرکلی نے اعلام ۷/۲۸۵ میں نقل کیا ہے۔

مذکورہ بکری کا نام احمد بن عبداللہ بن محمد تھا اور اس کے حالات میزان الاعتدال میں ۱۱۲،

لسان المیزان میں ۲۳۹، اعلام زرکلی میں ۱۴۸/۱ میں نقل کئے گئے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ روایات مدرسۂ خلافت کی تھیں اور ان کی تحقیق بھی نہیں کی گئی تھی تو انھیں نقل کرنے کی ضرورت کیا تھی کہ ان کی وجہ سے کتاب کا اعتبار مجروح ہو جائے اور مدرسۂ خلافت والے یہ دیکھے بغیر کہ یہ انھیں کا مال ہے۔ مفت میں مدرسۂ اہلبیتؑ پر حملہ شروع کر دیں اور اسے بدنام کرنے لگیں۔

اس سوال کا بنیادی جواب یہ ہے کہ یہ علمی دیانتداری کا ایک تقاضا تھا کہ جو حدیث بھی ان کے سامنے آئے اسے بعینہٖ نقل کر دیں تاکہ ان کی صحت و عدم صحت کے بارے میں آنیوالی نسلیں خود فیصلہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ مولف اپنی فکر کی بنا پر روایت کو نظرانداز کر دے اور آئندہ نسل اس روایت سے محروم ہو جائے جب کہ یہ امکان تھا کہ آئندہ نسل کے نزدیک شائد وہ روایت صحیح ثابت ہو جائے یا مولف کے تصوّر کے خلاف اس کے کوئی صحیح معنی نکل آئیں۔ اور پھر روایت کا تعلق واجبات و محرمات سے بھی نہیں تھا کہ اس سے دین کے بدل جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔

یہ علماء اعلام صرف فقہی کتابوں کی تدوین و ترتیب میں اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے کہ کسی غیر صحیح حدیث کو مدرک نہ بنایا جائے کہ دین الٰہی کی شکل مسخ ہو جائے اور سارے احکام الٰہیہ تبدیل ہو جائیں۔

یہی حال "منتقی الجمان" ــ "الدرّ والمرجان" ــ "النہج الوضاح" جیسی کتابوں کا ہے کہ جن کے صحیح یا حسن ہونے کا ادعا کیا گیا ہے تو ان میں پوری احتیاط برتی گئی ہے کہ کوئی غیر صحیح یا غیر حسن حدیث شامل نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ دیگر کتابوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور ان میں دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ جو روایت جس کتاب میں مل جائے اسے کتاب اور راوی کے حوالہ سے نقل کر دیا جائے تاکہ احادیث میں کاٹ چھانٹ کا الزام نہ آنے پائے اور آئندہ نسل قدیم ذخیرہ سے محروم نہ ہونے پائے۔

یہانتک لکھنے کے بعد میں نے استاذ الفقہار آیۃ اللہ الخوئی طاب ثراہ کی کتاب معجم رجال الحدیث کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ انھوں نے جلد اول ص ۲۲-۳۶ اور ص ۸۵ سے ص ۹۷ تک اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ شیخ صدوق رح اور شیخ طوسی رح کافی کی تمام حدیثوں کو صحیح نہیں سمجھتے تھے اور اسی طرح شیخ طوسی رح ۔ شیخ صدوق رح کی "من لایحضرہ الفقیہ" کی تمام احادیث کو صحیح نہیں تصور کرتے تھے بلکہ خود شیخ کلینی رح بھی اپنی کافی کی تمام احادیث کو صحیح نہیں قرار دیتے تھے اور شیخ صدوق رح بھی فقیہ کی تمام حدیثوں کو صحیح نہیں تصور کرتے تھے اور شیخ طوسی رح بھی تہذیب و استبصار کو مکمل طور پر صحیح نہیں تسلیم کرتے تھے ۔ اور یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ شیخ کلینی رح اپنی کتاب کی تمام احادیث کو رسول اکرم ص سے قطعی طور پر صادر تسلیم کرتے تھے یا ائمہ معصومین ع کی طرف قطعی طور پر منسوب کرتے تھے جب کہ اس میں ایسے افراد کے اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں جو نہ پیغمبر تھے اور نہ امام ۔

مثال کے طور پر حسب ذیل اسمارِ شخصیات نقل کیے جا رہے ہیں :

۱۔ ہشام بن الحکم
۲۔ ابو ایوب النحوی
۳۔ النظر بن سوید
۴۔ اسید بن صفوان
۵۔ ادریس بن عبداللہ الاودی
۶۔ الفضیل
۷۔ ابو حمزہ
۸۔ الیمان بن عبداللہ
۹۔ اسحاق بن عمار
۱۰۔ یونس
۱۱۔ ابراہیم بن ابی البلاد
۱۲۔ ابو نعیم الطحان
۱۳۔ اسماعیل بن جعفر

(معجم رجال الحدیث ۱/۸۹-۹۱)

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

TANZEEMUL MAKATIB
GOLAGANJ, LUCKNOW, 226018 U.P., INDIA
Ph. 0522 6565982, 6565985
Email: makatib.makatib@gmail.com, makatib@makatib.net
Website: www.makatib.net